مجموعہ تقاریر

الحاج سید العلماء سرکار علامہ سید علی نقی النقوی لکھنوی مدظلہ العالی



مجموعہ تقاریر

الحاج سید العلماء سرکار علامہ سید علی نقی النقوی لکھنوی مدظلہ العالی

حصہ دوم

مرتبہ

مولانا سید افسر عباس زیدی

ناشران

امامیہ کتب خانہ مغل حویلی اندرون موچی دروازہ حلقہ ۴۲ لاہور

قرطاس و قلم

مصنفہ :۔ مولانا سید افسر عباس زیدی۔

ایک ہزار رباعیوں اور قطعات کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسے خوبصورت اور برجستہ قطعات اور اتنی عمدہ رباعیات پورے امامیہ ادب میں دستیاب نہیں ہونگی جس محفل میں بھی یہ قطعات اور رباعیاں سلیقے سے پڑھی گئی ہیں اس محفل کی رونق دوبالا ہوگئی ہے مصنف کی نہایت مشہور رباعیاں اور قطعات درج ذیل ہیں۔ جو شامل کتاب ہیں۔

رک گیا رہوار وصاف جلی کہتے ہوئے
کیوں جھجکتا ہے ولی کو تو ولی کہتے ہوئے
جب اسے مولائے کل تسلیم کرتا ہے تو پھر
موت کیوں آتی ہے تجھ کو یا علیؑ کہتے ہوئے

منفرد صاحبِ توقیر کسے کہتے ہیں
عاملِ قدرتِ تحریر کسے کہتے ہیں
لکھ کے محشر میں جو پروانۂ جنت دیدے
اور پھر کاتبِ تقدیر کسے کہتے ہیں

زباں پہ حسنِ حقیقت کا اعتراف نہیں
حجاب دیدہ و دل کا غبار صاف نہیں؛
بدن پہ جامۂ احرام دل میں بغضِ علیؑ
ترے نصیب کا چکر ہے یہ طواف نہیں

نگاہ جس کی وسیع و بلند ہوتی ہے۔
بس اس سے اسکی طلب بہرہ مند ہوتی ہے
دلِ بخیل میں سمائی کبھی نہ حُبِّ علیؑ
کہ یہ بہت ہی نفاست پسند ہوتی ہے

کاغذ عمدہ۔ کتابت خوبصورت۔ چھپائی آفسٹ بطرز رنگین۔ ہدیہ ۔/۲۰ روپے

ملنے کا پتہ :۔ امامیہ کتب خانہ مغل حویلی۔ اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

فہرست مضامین مجموعہ تقاریر حصہ سوم

دیباچہ

گزشتہ سال راقم الحروف نے سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی مدظلہ العالی کی بارہ تقاریر کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جسے امامیہ کتب خانہ کے مالک جناب راحت علی صاحب نے خاص آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا۔ علامہ موصوف نے سنہ ۸۰ء میں لاہور کی مختلف مجالس میں جو تقاریر فرمائی تھیں اور ان میں سے جو دستیاب ہو سکی تھیں یہ مجموعہ ان پر مشتمل تھا۔ مجھے اس مرتبہ بھی راحت علی صاحب ہی کی تحریک پر یہ سعادت حاصل ہوئی کہ میں نے سید العلماء مدظلہ العالی کی تقریروں کا ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں جو تقریریں ہیں وہ وہ ہیں جو موصوف نے لاہور میں سنہ ۸۱ء میں مختلف مقامات پر مجلسوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمائیں۔ اسے ایک حسنِ اتفاق سمجھ لیجئے کہ جو تقریریں پچھلی مرتبہ دستیاب ہوئی تھیں ان کی تعداد بھی بارہ تھی۔ اور جو اس مرتبہ حاصل ہو سکیں ان کی تعداد بھی بارہ ہی ہے۔ اس ہندسہ سے ہمارا جو روحانی اور ایمانی تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ دونوں مرتبہ ذہن و دل کو ایک خاص قسم کی تشفی ہی محسوس ہوئی۔ موجودہ مجموعہ تقاریر میں پانچ تقریریں تو شعائر اللہ کے موضوع پر ہیں اور مسلسل ہیں۔ دو خلافتِ الٰہیہ کے عنوان پر ہیں وہ بھی مسلسل ہیں باقی پانچ تقریریں۔ امامت صادقین اولو الامر وغیرہ کے موضوعات پر مشتمل ہیں اور ایک ایک موضوع پر صرف ایک ہی تقریر ہے۔ ٹیپ سے ایک ایک لفظ کو سنکر لکھنا خاصا دشوار مرحلہ ہے۔ بعض اوقات غلط ریکارڈنگ کی وجہ سے الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آتے اور پھر اپنی طرف سے الفاظ شامل کرنے کی جسارت بھی نہیں کی جا سکتی تو سلسلہ کلام کو مربوط رکھنے کے لئے بڑی ذہنی اذیت ہوتی ہے۔ بہر کیف جہاں تک

ممکن ہو سکا نہایت احتیاط کے ساتھ ان تقریروں کو تحریر کی صورت میں منتقل کیا ہے
اُمید ہے کہ قارئین کرام گزشتہ مجموعہ کی طرح اس مجموعہ کو بھی بنظر استحسان دیکھیں گے۔ سید العلما
جناب علامہ علی نقی النقوی کی تقریروں کا حسب استطاعت فہم جو تجزیہ میں نے کیا ہے
وہ یہ ہے کہ یہ تقریریں میر تقی میر کی غزلوں کی طرح بظاہر بڑی آسان معلوم ہوتی ہیں۔
مگر حقیقتاً بڑی مشکل ہیں۔ میر کے اشعار کی یہی خوبی ہے کہ بظاہر بالکل سادہ ہیں مگر حقیقتاً
بڑی پُرکار ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت موصوف کی تقریروں کی ہے۔ علمی سطح اتنی بلند کہ جسکو
سمجھنے کے لئے اچھی خاصی دماغی صلاحیت کی ضرورت لیکن اندازِ بیان اتنا سلیس کہ
جس سے زیادہ سلیس ممکن نہیں۔ یہ صورت حال صلاحیت علمی اور فن خطابت کے امتزاج
کا وہ حسین شاہکار ہے کہ جو کبھی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ایک اور بات جو شدت سے محسوس ہوئی وہ یہ کہ علامہ
موصوف کا جو لب ولہجہ ہے اس کو نظر انداز کر کے ہم ان کی تقریروں کا کما حقہ لطف
نہیں اُٹھا سکتے جس فرد کے پاس علامہ موصوف کے بیانات صرف تحریر کی صورت میں پہنچے
ہیں وہ ان کے اندازِ خطابت کی حقیقی دل آویزی اور حسن گفتار کی بے مثل اثر آفرینی کے تجربے سے
نہیں گزر سکا۔ اس لذت سے وہی آشنا ہیں جنہوں نے انکے لب گفتار کی جنبش سے محشر فردوس تحسین
برپا ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ لاہور میں جن مقامات پر علامہ صاحب کی تقاریر ہوئی ہیں ان میں گلستان
زہرا ایبٹ روڈ، زینبیہ لٹن روڈ اور ماڈل ٹاؤن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ٹیپ پر درج
نہیں تھا کہ کونسی تقریر کہاں ہوئی اس لئے میں یہ طے شدہ صورت میں عرض کرنے سے قاصر
ہوں۔ کتاب کو اغلاط سے مبرا رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے لیکن چونکہ انسان خطا کا پتلا
ہے لہٰذا پھر بھی اس بات کا امکان ہے کہ کچھ مقامات محل نظر ہوں۔ پھر اس میں میری علمی بے بضاعتی
کا بھی دخل ہے۔ بہرحال مومنین کرام سے ملتجی ہوں کہ وہ دعا فرمائیں تاکہ میں تیسرے اور چوتھے
مجموعہ تقاریر کو بھی مرتب کر سکوں جن کے ٹیپ میری فرصت اور توجہ کے منتظر ہیں۔

(مولوی) سید افسر عباس زیدی۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ
مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ
الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ
اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ
الصَّادِقِیْنَ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۔

مجلس اوّل

شعائر اللہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِؕ
وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ۔

ارشاد حضرت احدیت ہے۔ سورہ حج میں ارشاد ہوا کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ عمل دلوں کی پرہیز گاری کا اک جز ہے۔ ابھی فرض کیجئے کہ اللہ کے شعائر کے معنی معلوم نہ ہوں کیونکہ شعائر کی لفظ ان عربی الفاظ میں سے نہیں ہے جو اردو کا جز بن گئے ہیں۔ بہت سی عربی کی لفظیں اردو میں اس طرح استعمال ہوتی ہیں جیسے اصلاً اردو ہوں مگر شعائر کی لفظ ایسی ہے جو بس مجالس وغیرہ میں اور اہل علم سے سنی ہوگی۔ عام طور سے اردو میں استعمال نہیں ہوتی۔ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اس ترجمہ سے شعائر کے معنی نہ سمجھے۔ میں ابھی اسے شاید آج بیان نہیں کروں گا کل اس کی نوبت آئے گی کہ میں شعائر کے مفہوم کی تشریح کروں مگر جب یہ الفاظ سُنے کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ عمل تقویٰ و پرہیز گاری کا جز ہے تو اسی سے ہر صاحب فہم مسلمان کو یہ نتیجہ تو نکال لینا چاہیئے کہ تعظیم میں عبادت نہیں ہے اس لئے کہ عبادت کے لئے کہا گیا ہے کہ لا تعبدوا اِلّا ایاہ۔ سوا اللہ کے کسی اور کی عبادت کبھی نہ کرنا۔ اور تعظیم کے لئے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم تقویٰ کا جز ہے۔ اور یہ ہر زبان کے لحاظ سے صاف ظاہر ہے کہ اضافت

جس سے اُردو میں کلمے اور کی پیدا ہوتے ہیں یا اضافت کی وجہ سے ہوتے ہیں
تو وہ اضافت خود پتہ دیتی ہے کہ مضاف اور ہے اور مضاف الیہ اور ہے
میں کہوں میرا لباس تو میں اور ہوں لباس اور ہے میرا مکان تو میں اور ہوں مکان
اور ہے میرا عزیز میں اور ہوں عزیز اور ہے اور یہاں میرے بھی نہیں۔ میرے
یعنی اللہ کے شعائر تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے شعائر اس کے ایک سے
زیادہ ہیں۔ بہرحال وہ چاہے دو چار ہوں چاہے دس بیس ہوں چاہے سو پچاس
ہوں لیکن ایک سے بہرحال زیادہ ہیں جبھی تو جمع ہیں۔ تو جب یہ کیا گیا کہ جو اللہ کے
شعائر کی تعظیم کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم اللہ سے مخصوص نہیں ہے۔ عبادت
اللہ سے مخصوص ہے۔ تو جو مخصوص ہو اللہ سے وہ اور چیز ہے۔ جو عام چیز ہے اللہ
کے سوا بھی ہو سکتی ہے وہ اس سے الگ چیز ہے تو عبادت کے لئے قرآن میں
نہیں آسکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرو، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے
اور شرک کے لئے کہا گیا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ تو اللہ شرک کا نہ حکم
دے گا نہ شرک کی اجازت دے گا۔ اللہ اپنے بندوں کے کفر سے راضی نہیں ہے
تو شرک سے کہاں راضی ہوگا یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی دعوت تو دی ہی
نہیں جا سکتی۔ مگر اللہ کے سوا اور کچھ ہے۔ میں نے کہا ابھی شعائر کے معنی نہیں معلوم
تو اللہ کے سوا کچھ چیزیں ہیں کہ جن کی تعظیم کو اس نے جزو تقویٰ کہا ہے تو اس سے
صاف ظاہر ہے کہ ہر قسم کی تعظیم کو شرک سمجھنا غلط ہے ادھر کسی چیز کی تعظیم ہوئی
اور کہا کہ یہ شرک ہے۔ اسے میں فطرت کے تقاضے پر بھی جانچنا چاہتا ہوں
فطرت کسی مذہب کی بھی ملک نہیں ہے۔ پھر قرآن کے معیار پر جانچنا چاہتا
ہوں جو تمام مسلمانوں کا مشترک ہے۔ ایک مرکز ہے۔ پھر حدیث کے معیار
پر جانچنا چاہتا ہوں۔ حدیث میں کچھ متفق علیہ ہیں کچھ مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔

مگر قرآن کا تو کوئی جز ایسا نہیں جس میں اختلاف ہو۔ مفہوم میں اختلاف ہو وہ اور بات ہے۔ اصل قرآن کی آیت میں کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ وہ اُسے معاذ اللہ غیر معتبر کہے تو اب پہلے فطرت کے تقاضے پر غور کیجیے کہ کیا تعظیم شرک ہے تعظیم کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیئے لیکن کسی ایک کے ساتھ ایسا برتاؤ کہ جو اس کے امتیاز کا بلندی کا بزرگی کا پتہ دے تو وہ تعظیم ہے۔ اب کوئی ادنیٰ درجہ کی تعظیم ہوگی کوئی اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہوگی۔ ادنیٰ درجہ کی تعظیم ہے تو چھوٹا شرک ہوگا۔ اونچے درجہ کی تعظیم ہے تو بڑا شرک ہوگا۔ لیکن شرک تو پھر ہر ایک ہوگا۔ تو اب یہ اصول کہ اِدھر اپنے عمل سے کسی کے ساتھ امتیاز نمایاں کیا اور بس شرک ہوگیا۔ تو اب جناب جو صاحب جس نقطۂ نظر کے حامی جس مکتب خیال کے آدمی یہ کہتے ہوں کہ تعظیم مطلق تعظیم شرک۔ میں کہتا ہوں خود ان کے گھر پر جاکر پہلے ان سے تعلقات قائم کیجیے۔ بلا وجہ کے مہمان ہو جیئے گا۔ ان سے پہلے کچھ دوستانہ بڑھایئے پھر جاکر ان کے ہاں مہمان ہوئیے۔ کسی بات کے غلط ہونے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ جو اس کا علمبردار ہے وہ خود اس پر عمل نہ کرسکے۔ اور جو خلاف فطرت بات ہوگی اس پر کوئی عمل نہیں کرسکے گا۔ تو کسی بھی شرک شرک کی آواز بلند کرنے والے کے ہاں جاکر مہمان ہوئیے دو چار دن۔ اور یہ اندازہ لگایئے کہ جس انداز سے وہ اپنے نوکر سے بات کرتا ہے اسی انداز سے اپنے والد ماجد سے بھی بات کرتا ہے اگر ذرا سا بھی اس نے فرق کیا تو وہیں سے پھر شرک شروع ہوا۔ کیونکہ وہ فرق ظاہر ہے اظہار بزرگی کے لئے ہی ہوگا تو فرق احساس عظمت کے ہی لحاظ سے ہوگا لہٰذا وہ تعظیم ہوگا اور جب تعظیم ہوگا تو شرک ہو جائے گا۔ اب یہ چیزیں رواج کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔ میں یو پی کا ہوں وہ بھی لکھنؤ کا رہنے والا۔ یہاں مجمع میں بہر حال۔ وہ ہجرت

کی ہوا جو چلی تھی اس کے لحاظ سے بہت سے یو پی کے بھی حضرات ہوں گے اور ممکن ہے لکھنؤ کے بھی ہوں۔ ممکن ہے کچھ باتیں وہاں رائج ہوں۔ پنجاب میں ان پر عمل نہ ہوتا ہو مگر کچھ نہ کچھ باتیں تو ضرور مشترک ہوں گی دونوں جگہ۔ تو حضور میں اپنے ہاں کے جو محاورات ہیں ان کے لحاظ سے پہلے کھول۔ جس پر بہت سے یہاں کے بھی حضرات عامل ہو گئے ہوں گے کہ جناب کوئی چھوٹا بچہ آیا اس سے تو کم کر بات کی۔ اب اپنے برابر کے ساتھ کے رفیق آئے۔ سکول کے کالج کے۔ ان سے تم کہہ کر بات کی۔ بس ادھر تُو سے تم کی تبدیلی ہوئی اور شرک شروع ہوا اور جب تم سے آپ ہوا تو شرک میں اضافہ ہوا اور جب جناب و قبلہ و حضرت و سرکار ہو گیا تو لیجئے شرک عظیم ہو گیا۔ بچہ اپنا آیا پیر پھیلائے ہوئے لیٹے تھے لیٹے رہے۔ اب آ گئے اپنے بزرگوار کوئی اُستاد۔ ارے اُستاد نہ سہی حاکم ضلع آ گیا۔ کمشنر صاحب آ گئے۔ تو اب اسی طرح لیٹے رہیں گے؟ اب اگر ان کو آتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھی اپنی جگہ سے جنبش کی تو شرک ہو گیا۔ یہ اٹھ کے بیٹھ گئے یا کھڑے ہو گئے تو بہت بڑا شرک ہو گیا۔ تو اب دیکھنا ہے کسی بھی نقطۂ نظر کا آدمی۔ کسی بھی متمدن ماحول میں۔ کسی بھی مہذب فضا میں اس اصول کا پابند ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ ذرا بھی امتیاز کسی کے ساتھ۔ اپنے قول و عمل میں۔ انداز گفتگو میں طریق معاشرت میں ظاہر نہ ہونے دے تو یہ ایسی چیز ہو گی جس پر اس مہذب دنیا کا کوئی فرد عامل نہیں ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں۔ ہم ان میں رہتے ہیں نہیں ہوں اس لئے نہیں بتا سکتے کہ شاید جنگلوں میں۔ پہاڑوں کے رہنے والوں میں بھی اپنے انداز معاشرت کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہو چھوٹے اور بڑے کا۔ کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہو ایسے کا جس کی نظروں میں عزت زیادہ ہو۔ اب کیونکہ ہم اس معاشرت سے واقف نہیں ہیں ہم نہیں بتا

سکتے۔ ورنہ جہاں سے شعور کی ابتدا ہوئی وہیں سے یہ فرقِ مراتب لازمی طور پر پیدا ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ مطلق تعظیم شرک ہو کر جو دورِ وحشت کے ساتھ شاید سازگار ہو لیکن دورِ تہذیب و تمدن کے ساتھ یہ سازگار نہیں۔ فطرتِ بشری اور شعورِ انسانی کے تقاضوں کے خلاف ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ اب آیئے قرآنِ مجید میں دیکھیں قرآنِ مجید کیا کہہ رہا ہے۔ ماں باپ کے لئے دیکھئے۔ آغاز وہی ہے جو خود اس اصول کو تقویت پہنچاتا ہے۔ وَقَضٰی رَبُّكَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ کہ تمہارے اللہ کا یہی فیصلہ ہے کہ عبادت تو سوا اس کے کسی اور کی نہ کرو تو اب جو جو کہا گیا ہے وہ عبادت تو ہے نہیں اب اسے سمیٹ کر سلوں کہا کہ تمہارے رب کا فیصلہ ہے کہ عبادت سوا اس کے کسی کی نہ کرو مگر ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ احسان کے معنی وہ نہیں ہیں کہ کسی کو اپنا ممنونِ کرم بنا کر اس کی گردن کو جھکائیں۔ احسان کے معنی ہیں اچھا سلوک، حسنِ عمل۔ تو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے کام لو۔ اب یہ ان کے حسنِ سلوک کی اہمیت ہے کہ عبادتِ الٰہی کے بعد بلا فاصلہ اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ یعنی اب حقیقی کے بعد ذہن کو مجازی کی طرف موڑا جاتا ہے۔ دیکھو عبادت تو بس اس کی ہے جو حقیقی ہے مگر یہ ماں باپ۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک۔ مگر حسنِ سلوک کو مبہم نہیں چھوڑا جاتا۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَـقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔

دیکھو ان میں سے دونوں یا ایک کبرسنی کی منزل تک پہنچ جائیں تو ان سے اف بھی نہ کرو اب ماشاء اللہ صاحبانِ عمل ہیں اور اہلِ فہم ہیں۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی کبرسنی کی منزل تک پہنچ جائے یہ درحقیقت قیدِ حکم نہیں ہے یعنی کوئی صاحب ہوں کہ ان کے والد صاحب ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہوں گے

بعض سمجھتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں صاحبزادے متولد ہوتے تھے۔ اب بعد میں اتنا فرق نمایاں نہیں ہوتا دیکھنے والے کو کہ وہ رشتہ بھی محسوس کرے کہ وہ باپ ہیں یہ بیٹے ہیں۔ بعض جگہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بڑے بھائی ہیں اسی طرح یہ خواتین میں زیادہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں فرق اتنا کم محسوس ہوتا ہے کہ ماں بیٹی معلوم نہیں ہوتیں۔ ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ وہ بڑی بہن ہیں یہ چھوٹی بہن ہیں۔ تو اب اگر ایسے صاحبان ہیں جن کے ماں باپ میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا ہے تو وہ کہیں کہ جناب قرآن مجید میں جو کلیہ ہے وہ تو انہیں یاد تھا کہ جو ماں باپ سن رسیدہ ہو جائیں۔ ہمارے ماں باپ یا مادرِ محترم تو ابھی کبر سنی کی منزل تک نہیں پہنچے ہیں تو اس لئے ہم جو چاہیں کریں۔ تو حقیقت میں یہ قید شرط نہیں ہے۔ نفسیاتی طور پر غور کیجئے کیونکہ کبر سنی میں یہ زیادہ ہوا کرتا ہے کہ ان کی باتیں تکلیف دہ ہو جائیں۔ ضعیف العمری کی وجہ سے بے جا خفا بھی ہونے لگتے ہیں۔ کبر سنی کی وجہ سے بے بات کے غصہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ چونکہ انسان میں کبر سنی کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس لئے کہا گیا کہ اگر کبر سنی کی وجہ سے بعض ایسی باتیں ہونے لگی ہیں کہ تمہیں ناگوار گزرتی ہیں تو دیکھو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تمہیں اذیت ہوتی ہے مگر چونکہ ماں کے ہاتھ سے ہے باپ کے ہاتھ سے ہے لہٰذا خبردار اُف بھی نہ کرو اور اب اہلِ فہم غور کریں کہ اُف کہنا کوئی اذیت پہنچانا نہیں ہے اپنی اذیت کا اظہار ہے مگر چونکہ ماں باپ کے ہاتھ سے وہ سلوک ہو رہا ہے تو اپنی اذیت کا اظہار بھی نہ کرو۔ اب اس دَور کے تعلیم یافتہ اور ترقی پسند جوانانِ روزگار غور کریں کہ وہ ماں باپ سے کس کس طرح بات کرتے ہیں۔ ایک ادنیٰ انداز تو یہ ہے۔ مشاہدات میں ہر ایک کے۔ ایک ادنیٰ انداز

تو یہ ہے کہ آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ہمارے معاملات میں آپ دخل نہ دیا کیجئے۔ یہ والدماجد سے بہت ہلکی بات ہے جو کہہ دی جائے۔ اور اس سے آگے آپ جس زمانے کے آدمی ہیں۔ آپ کیا جانیں ہمارے معاملات کو لہٰذا آپ جو ہر چیز میں دخل دیا کرتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور دَور تو وہ آگیا ہے کہ صاحبزادیوں کو۔ اگر فرض کیجئے کسی کے آنے جانے کو وہ روکیں تو وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہمارے نجی معاملات میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ تو یہ دنیا کا تقاضا جو ہے مجھے اس سے بحث نہیں مگر قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ ماں باپ سے اذیت بھی پہنچ رہی ہے کبرسنی کی وجہ سے تو خبردار اُف نہ کرو۔ اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرو۔ اب یہ جھڑکنا کیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ لفظیں سخت نہیں ہیں بس کہنے کا انداز سخت ہے۔ کاغذ پر وہ لفظیں آئیں تو ان میں کوئی بُرائی نہیں ہے مگر انداز گفتگو میں درشتگی ہے اور سختی ہے اسے منع کیا جا رہا ہے لا تنھرھما انہیں جھڑکو نہیں۔ وقل لھما یہ تو منفی احکام تھے اور اب اس کے مقابل میں قل لھما قولاً کریما ان سے بات کرو اس طرح جس سے ان کی بزرگی نمایاں ہوتی ہو اور دیکھو ان کے ساتھ عاجزی کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکائے رکھو یعنی بیٹھو تو اس انداز سے کہ تمہارے بیٹھنے سے ظاہر ہو کہ چھوٹا بڑے کے سامنے بیٹھا ہے۔ ان کے ساتھ کھڑے ہو تو اس طریقہ سے کہ تمہارے کھڑے ہونے کے انداز سے پتہ چلے کہ تم اپنے کو چھوٹا سمجھتے ہو ان کے ساتھ راستہ چلو تو اس طرح کہ معلوم ہو کہ چھوٹا بڑے کے ساتھ راستہ چل رہا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی نہ سمجھو کہ حق ادا ہوا تو اب ہم سے کہو۔ وقل اور یہ کہو کہ

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔

اور اب یہ قرآن مجید کے الفاظ کے وہ پہلو ہیں جن پر بغیر تدبر کے انسان

کی توجیہ نہیں ہو سکتی آغاز ہوا ہے آیت کا قضیٰ ربک۔ قضی اللہ نہیں کہا گیا ہے قضیٰ ربک۔ رب کے معنی ہیں تربیت کرنے والا۔ قضیٰ ربک۔ تمہارے پروردگار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عبادت بس اسی کی کرو مگر ماں باپ کے ساتھ یہ سلوک کرو اور جب مناجات بتائی تو کہا اب ہم سے کہو کہ رب اسم ہمارے حقیقی رب بھی یہ رب یہاں کیوں آیا وارحمھما ان پر اپنی رحمت شامل حال فرما۔ کما ربیانی صغیرا۔ جیسا کہ انہوں نے بچپن میں ہماری تربیت کی اسکا مطلب یہ ہے مناجات کا کہ پروردگارا یہ تربیت کرنا اصل میں تیرا کام تھا جو ان کے ہاتھوں انجام کو پہنچا لہٰذا ہم انہیں کہاں صلہ دے سکتے ہیں تو تو ہی ہے جو انہیں صلہ عطا فرمائے گا صلوٰۃ۔ تو خیر بھر کو نہیں اُف نہ کہو اور قول میں بھی ان کی بزرگی مد نظر رکھو عملاً بھی ان کے سامنے جھکے رہو۔ یہ تعظیم کی دعوت نہیں ہے تو اور کیا ہے اور شروع میں کہہ دیا کہ عبادت سوا اس کے کسی اور کی نہ کرو تو اسی سے صاف ظاہر ہے کہ عبادت اور ہے اور تعظیم اور ہے عبادت اس سے مخصوص ہے اور تعظیم ہر ایک کی ہے جس کو وہ کہے۔ اس کی طرف سے جسے تمہاری بزرگی کا مرکز بنایا گیا ہو اس کی تعظیم ہے۔ اس کے بعد یہ عجیب بات ہے کہ کوئی کسی گورنر کی تعظیم کو کھڑا ہو جائے تو کوئی شرک کی آواز بلند نہیں کرے گا اور دوسرے جو حکام ہوں کوئی ان کے لئے کھڑا ہو تو کوئی شرک کی آواز بلند نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بات زیادہ تر رسول اور آلِ رسول ہی کے بارے میں صرف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو زیادہ رواج نہیں ہے۔ مگر ہمارے مسلمانوں کی اکثریت میں میلاد شریف اور سیرت کے جلسوں میں ایک بڑا مسئلہ قیام کا ہو گیا ہے۔ یہ ایک رواج بن گیا ہے۔ کہ ایک خاص محل پر جب حضرت کا نام آتا ہے سلام کے موقع پر تو تہذیب قرار دی گئی ہے کہ مجمع کھڑا ہو جائے اب وہ ہیئت بڑا مسئلہ بن گیا ہے کہ

ایک پورا گروہ اسے بہت بڑی اور عظیم معصیت قرار دیتا ہے اور معصیت نہیں بلکہ وہی شرک۔ وہاں کوئی معصیت شرک سے ادھر اُدھر تو رہتی ہی نہیں۔ تو جناب یہ شرک پیغمبر خدا کا نام سُن کر کھڑا ہونا۔ یہ تعظیم ہے۔ اور اگر تعظیم جائز نہیں یہ شرک ہے تو حضور تعظیم کا ہر درجہ واجب تو نہیں ہوا کرتا اس لئے ہم اس پر عامل نہیں ہیں مگر میں یہاں وکالت کرتا ہوں اس جماعت کی جو اس پر عامل ہے کہ وہ جو یہ کر رہے ہیں۔ وہ عبادت ہے یا تعظیم ہے۔ عبادت ہے تو شرک ہے لیکن اگر تعظیم ہے تو شرک نہیں ہے۔ تو آپ یہ رسول ہی کے بارے میں سب سے زیادہ جو شرک کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو سب کے ساتھ ہوتا ہے یعنی حضور کی بزرگی کے اظہار کے لئے جو طریقہ اختیار کر لیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول کے ساتھ وہی برتاؤ ہو جو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ توحید آپ نے کس سے سیکھی ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب سے۔ توحید کا ذکر آپ نے قرآن و حدیث ہی سے سُنا۔ انہی کے خلاف انہیں صرف کر رہے ہیں۔ تو جناب یہ کھڑا ہونا توحید کے خلاف ہے شرک ہے۔ یعنی رسول کے ساتھ کوئی برتاؤ ایسا نہیں کرنا چاہیئے جو دوسروں کے علاوہ ہو۔ جو سب کے ساتھ برتاؤ ہو وہی رسول کے ساتھ۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بات مانیں یا قرآن کی۔ آپ کہتے ہیں وہی برتاؤ کرو جیسا سب کے ساتھ اور قرآن کہہ رہا ہے دیکھو ہمارے پیغمبر کو اس طرح نہ پکارا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ وہ کہتا ہے جیسا دوسروں کے ساتھ سلوک کرتے ہو ویسا پیغمبر کے ساتھ سلوک نہ کرو۔ آپ کہتے ہیں جو سب کے ساتھ سلوک کرو وہی رسول کے

ساتھ سلوک کرو۔ تو اب قرآن کی بات مانیں یا آپ کی بات مانیں۔ صاف کہہ رہا ہے قرآن۔ نہ قرار دو ہمارے رسول کے پکارنے کا طریقہ وہ جو آپس میں ایک دوسرے کا طریقہ قرار دو۔ اور جناب ہم سے یہ کہا کہ اس طرح نہ پکارو جیسے سب کو پکارتے ہو تو خود بھی اس طرح کبھی نہیں پکارا جس طرح اور دل کو پکارتا ہے۔ ارے وہ ہر کس و ناکس کو پکارنے ہی کیوں لگا۔ وہ انبیاء کو پکارتا ہے مرسلین کو پکارتا ہے۔ ماشاء اللہ مجمع میں ممکن ہے حافظ قرآن بھی ہوں۔ جو حافظِ قرآن ہوں وہ حافظ کی مدد سے دیکھ لیں، جو ناظرہ خواں ہوں وہ ورق گردانی کر کے تلاش کر لیں جو عرض کر رہا ہوں اس کی تصدیق جتنی تلاش کریں گے مکمل ہی ہوگی۔ اس کے خلاف ثابت نہیں ہوگا کہ وہ بس انبیاءؑ کو پکارتا ہے مگر جس نبی کو پکارا بلا استثنا نام لے کر پکارا اور جب بلا استثنا میں نے کہہ دیا تو مجھے آیتیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں مگر جتنی روا روی میں یاد ہیں اتنی پڑھ بھی دوں گا۔

یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ۔ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو نام لے کر پکارا۔ یا یا نوح اھبط بسلام منا و برکٰت علیک اے نوح چلو سلامتی کے ساتھ۔ نام لے کر پکارا۔

یا ابراھیم قد صدقت رویاک۔ اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھایا۔ نام لے کر پکارا۔

یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض۔ اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں حاکم بنایا۔ نام لے کر پکارا۔ جس نبی کو پکارا نام لے کر پکارا اور ہمارے رسول کو بلا استثنا۔ کبھی نام لے کر نہیں پکارا۔ جتنی طاقت سے وہاں بلا استثنا کہہ سکتا تھا اتنی ہی طاقت سے یہاں بلا استثنا کہہ سکتا ہوں کہ ان کو بلا استثنا کبھی نام

لے کر نہیں پکارا۔ بلکہ کبھی تو صفات کو مرکز خطاب قرار دیا ہے۔ اے طیب طاہر لیسین اے سید و سردار۔ کبھی جو عہدہ تھا اسی کو مرکز خطاب بنالیا۔ یاایہا النبی، یا ایہا الرسول۔ نبی اور رسول ان کا عہدہ ہے۔ اسی عہدے کو عنوان خطاب بنا کر جب ایک تبلیغ خاص کا حکم آیا تو پھر وہاں نہ طٰہٰ کہا گیا نہ لیسین کہا گیا وہاں کہا گیا یاایہا الرسول بلغ اے رسول بلغ ما انزل الیک من ربک۔ جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر دیجئے۔ یہاں یاایہا الرسول ہے اور اس خطاب ہی سے نمایاں ہے کہ سرکاری فرمان ہے لہٰذا ضابطہ کا انداز خطاب۔ جو عہدہ ہے ان کا اسی عہدے کو سرنامہ کلام قرار دیا۔ اور کبھی بتقاضائے محبوبی جو لباس پہنے ہوئے ہیں اسی انداز کو عنوان خطاب بنالیا۔ یاایہا المزمل یا ایہا المدثر اے چادر میں لپٹے ہوئے اے عبا اوڑھے ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذات اتنی محبوب ہے کہ اس کے لباس پر بھی نظر محب پڑ رہی ہے۔ صلوٰۃ۔

صاحبان فہم محسوس کریں گے کہ لباس کا تعلق جسم کے ساتھ عارضی ہوتا ہے۔ خصوصاً اوپر کا لباس جیسے عبا۔ جیسے چادر۔ یہ تعلق تو بالکل وقتی ہوتا ہے۔ لباس تو ہو سکتا ہے کہ چند دن جسم پر رہے۔ یا ہر روز بدلتا ہو آدمی۔ تو ایک دن تو رہے گا لیکن۔ یہ اوپر کا لباس جیسے ہماری عبا وغیرہ ہے تو وہ تو بس تھوڑی دیر کے لئے زیب جسم ہے اور اس کے بعد اتار دی۔ تو جسم کے ساتھ عارضی تعلق ہوتا ہے۔ تو جو ذات اتنی محبوب ہو کہ عارضی تعلق اس کے جسم کے ساتھ جو ہو وہ مرکز نظر پروردگار ہو جائے تو قبر مطہر جس سے جسم کا مقام تصور میں دائمی تعلق ہوتا ہے وہ قبر مطہر مرکز نظر پروردگار نہیں ہوگی اور کیا اس کی ذرا سی بھی تعظیم و تکریم شرک ہو جائے گی۔ صلوٰۃ۔

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔ دیکھو رسول کی آواز پر اپنی

آواز بلند نہ کیا کرو۔ یہ تعظیم سکھانا نہیں ہے تو اور کیا ہے ہاں میں نے کہا یہ میں دوسرے حضرات کی وکالت کر رہا ہوں۔ میں تو عادی نہیں ہوں اور ہمارے مجمع میں اکثر وہ طریقہ نہیں ہے۔ یعنی ایک خاص محل پر اسم شریف سُنکر کھڑا ہونا ہم اس جذبہ تعظیم کو بآوازِ بلند درود کے وسیلے سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن میں تو اس وقت وکالت کر رہا ہوں اس طبقہ کی جو اس پر عمل کرتا ہے تو جسے وہ بات ناگوار گزرتی ہے وہ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے تو وہاں یہ کہا جاتا ہے۔ یہ کیا کہ ایک خاص محل پر حضرت کا نام آئے تو وہاں کھڑے ہو یعنی ایسا ہی ہے تو پھر جب بھی آپ کا نام آئے تو کھڑے ہو جاؤ۔ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ پرانے زمانہ میں اس کا نمونہ یا مثال دوسرے کے سمجھانے کو ہم بھی پیش کر سکتے تھے مگر جو جدید مشاہدات ہیں اس سے بہت سی چیزوں کا سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے ہاں کا جانتا ہوں وہاں میں نے دیکھا ہے مگر ظاہر ہے جو ایک جگہ ہوتا ہے وہ دوسری جگہ بھی ہوتا ہے۔ ایک دن ہم بینک گئے وہ دن ہمارے علم میں ایسا نہیں تھا کہ بینک بند ہو کام نہ ہو رہا ہو وہاں جاکر دیکھا۔ مثلاً۔ کہ سب اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہیں کوئی کام نہیں ہو رہا ہم نے کہا ارے صاحب کیا آج کوئی چھٹی ہے کہا نہیں چھٹی تو نہیں ہے ہم نے کہا پھر کیا ہے انہوں نے کہا کہ آج علامتی ہڑتال ہے۔ علامتی ہڑتال کیا۔ کہا کہ اصل ہڑتال تو بعد میں ہوگی اگر مطالبات پورے نہ ہوئے۔ یہ آج تھوڑی دیر کے لئے علامتی ہڑتال ہے یعنی اپنی ناراضگی کا ثبوت دینے کے لئے۔ مثلاً۔ دوپہر تک کام نہیں کریں گے۔ یہ ابھی ہڑتال مکمل نہیں ہے۔ یہ علامتی ہڑتال ہے۔ اب میں نے وہاں سے یہ لفظ یاد کر لی۔ ایک دفعہ یہ لفظ سنی تو مجھے اپنے مطلب کی معلوم ہوئی۔ میں نے اُسے یاد کر لیا۔ اب جناب

یہ سوال جو قیام کا ہے۔ قیام بوقت سلام۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہی کیا خصوصیت ہے جس وقت بھی حضرت کا نام آیا کرے تو کھڑے ہوا کرو۔ تو میں کہتا ہوں کہ بے شک اگر ہر وقت کھڑے ہوا کریں تو بہت اچھا مگر یہ اپنے امکان کی کمی ہے کہ ہر دفعہ کھڑے ہوا کریں۔ میں کہتا ہوں یہ تعظیم نہیں ہے علامتِ تعظیم ہے واگر ہر مرتبہ ان کا نام آنے پر کھڑے ہوں، تب بھی حق تعظیم کہاں ادا ہوگا۔

معلوم ہوا پیغمبر خدا کے لئے قرآن دعوت تعظیم دے رہا ہے وہ کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جو ان کی عظمت شان کے لائق ہے۔ ان کو اس طرح پکارا نہ کرو۔ اپنی آواز کو ان کی آواز پر بلند نہ کیا کرو یہ سب تعظیم کی دعوت ہے۔ اب پھر ان کا عمل۔ میں نے عرض کیا تھا کہ فطرت پھر قرآن پھر سنت۔ تو حضور والا حقیق علیہ تاریخ ہے اور تاریخ کے ذیل میں جو ارشادِ رسولؐ آئے وہ حدیث ہے اس لئے جو عرض کرتا ہوں وہ تاریخ بھی ہے حدیث بھی ہے۔ جنگِ خندق کے بعد پیغمبر واپس ہوئے۔ جناب سعد ابن معاذ وہ انصار مدینہ میں سے بڑے سابق الایمان تھے۔ یعنی جبکہ ابھی ہجرت نہیں فرمائی تھی جو لوگ مکہ معظمہ گئے تھے اور حضرت کی خدمت میں شرفیاب ہوئے تھے ان میں سے یہ سعد ابن معاذ تھے۔ اور وہ جو ان کے ہاں دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان میں سے یہ ایک کے سردار تھے۔ وہاں سے دو قبیلے نکالے جا چکے تھے بنی قریظہ وہاں رہ گئے تھے مدینہ میں۔ تو یہودیوں نے بڑے بڑے قلعے اپنے بنا لئے تھے۔ نیت تو انکی اچھی تھی نہیں۔ جنگ کا ارادہ پہلے ہی سے تھا۔ کچھ دن محصور رہے قلعوں میں اور اس کے بعد اب پھر انہوں نے کہا کہ اب ہم قلعہ سے باہر آئیں گے ہمیں اطمینان دلایا جائے کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا تو جناب سعد ابن معاذ کے ان سے زمانہ قبل اسلام سے بڑے اچھے تعلقات تھے بہت

روابط تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تم کسی کو ثالث بنا دو وہ طے کر دے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تو آپ نے سعد ابن معاذ سے فرمایا کہ تم طے کر دو وہ بڑے خوش ہوئے کہ یہ تو ہمارے بڑے پرانے دوست ہیں۔ وہ اپنی حماقت سے یہ نہیں سمجھے کہ ایمان میں پرانی اور نئی دوستی کچھ نہیں ہوتی۔ ایمان کے تقاضے جو ہیں وہ تو پورے ہوں گے اور تھے وہ بڑے جلیل المرتبہ صحابی۔ انہوں نے کہا کہ سعد ابن معاذ جو فیصلہ کر دیں ہمیں وہ منظور ہے۔ آپ نے سعد کے بلوانے کو آدمی بھیج دیا وہ ایک مرکب پر سوار ہو کر آئے۔ پیغمبر کی خدمت میں۔ وہ جو آئے تو یہ ایک جملہ ہے۔ پورا واقعہ تو نہیں عرض کرنا ہے۔ جسے دیکھنا ہے تاریخ اسلام میں دیکھ لے کہ وہ جو آئے تو حضرت نے انصار کے اس قبیلے سے فرمایا کہ دیکھو تمہارا سردار آیا ہے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ دعوتِ تعظیم نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ پیغمبر نے حکم دیا کہ تمہارا سردار آرہا ہے کھڑے ہو جاؤ۔ تو معلوم ہوا کہ رسول کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو۔ بس اب ایک جز عرض کروں گا۔ آج تو اس سلسلہ کی پہلی مجلس ہے۔ پھر انشاء اللہ اور اجزا تفصیل کے ساتھ بیان ہوں گے کہ یہ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم کھڑے ہو جاؤ۔ اور اب ذرا آپ کا عمل۔ حضور معتبر ترین کتابیں صحاح ستہ مانی جاتی ہیں۔ اس صحاح ستہ میں ایک صحیح ترمذی ہے چونکہ صحاح میں ہے اس لئے ترمذی شریف کہلاتی ہے۔ جیسے بخاری شریف۔ مسلم شریف ویسے ترمذی شریف۔ تو وہ بھی ادنیٰ درجہ کی روایت نہیں ہے۔ صحیح ترمذی میں ہے تو صحاح ستہ میں ہے۔ اس میں دیکھئے کہ صحیح ترمذی میں رسول کا عمل کیا ہے۔ اذا دخلت فاطمہ۔ جب بھی فاطمہ زہرا آتی تھیں۔ ایک دفعہ کی بات نہیں ہے کہ راوی نے دیکھا ہو کہ فاطمہ آئیں اور پیغمبر کھڑے ہو گئے۔ ایک دفعہ

کھڑے ہوں تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ خلاف توقع کوئی آجائے تو آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ آئیں اور پیغمبر کھڑے ہو گئے۔ اذا دخلت جب آتی تھیں فاطمہ زہرا تو قام الیھا رسول اللہ۔ حضرت پیغمبر خدا ان کی تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہی جملہ ایسا اُونچا تھا کہ ہماری تحریر و تقریر کی ساری قوتوں کو اس نے جذب کر لیا۔ ہم ہمیشہ اتنا ہی بیان کرتے رہے کہ حضور حضرت فاطمہ زہرا کی تعظیم فرماتے تھے مگر ارشاد رسول اور آگے بڑھتا ہے۔ جو تیسرا جملہ آئے گا وہ اگر پہلے جملے سے بالاتر نہیں ہے تو اس سے کمتر بھی نہیں ہے ارشاد ہو رہا ہے یعنی راوی کہہ رہا ہے قام الیھا رسول اللہ حضرت رسولِ خدا کھڑے ہو جاتے تھے و رحّبھا مرحبا فرماتے تھے یعنی خوش آمدید کہتے تھے واجلسھا فی مکانہ اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ اب

اس عظمت کا میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تجزیہ اگر کریں تو اس جملے کے مفہوم کے سوا اس کے اور کوئی معانی ثابت ہی نہیں ہوں گے کہ جب تک فاطمہ بیٹھی ہیں پیغمبرِ خدا نہیں بیٹھیں گے۔ جب فاطمہ اُٹھ کر جائیں گی تب اپنی جگہ حضرت تشریف فرما ہوں گے۔ تو یہ فاطمہ زہرا کی تعظیم نہیں ہے تو اور کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس عملِ رسول سے ثابت ہے کہ فاطمہ فقط بیٹی نہیں ہیں کچھ اور بھی ہیں۔ فاطمہ علاوہ بیٹی کے کچھ اور بھی ہیں ورنہ بیٹی ہونے کا تو تقاضا ہی نہیں ہے کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو اور ماشاء اللہ صاحبانِ علم ہیں آپ حضرات میں۔ اور ممکن ہے کہ ہر نقطۂ نظر کے کچھ اصحاب ہوں۔ غور فرمائیے کہ اصول یہ ہے کہ جو عملِ رسول ہے وہ جزوِ سنت ہے۔ جو تقریرِ رسول ہے وہ بھی جزوِ سنت۔ تقریر کے معانی عام لوگ نہیں سمجھیں گے یعنی کوئی دوسرا رسول کے سامنے کوئی عمل کرے رسول اس کو منع نہ کریں۔ وہ بھی جزوِ سنت۔ اور یہ

اصول ہے کہ سنت رسول کی پیروی یا واجب ہوگی یا مستحب۔ ہوسکتا ہے کہ واجب ہو اور ہوسکتا ہے کہ مستحب ہو۔ ہم جسے واجب کے مقابلے میں سنت کہتے ہیں وہ واجب نہ ہو سنت ہو یعنی مستحب ہو۔ یہ ایک عمل رسول ہے جو بالاتفاق موجود ہے۔ اور اصول ہے کہ عمل رسول کی پیروی سنت۔ مگر مجھے کسی فقہ میں نظر نہیں آیا کہ باپ کے لئے سنت ہو کہ وہ بیٹی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہوا کرے۔ کسی کتاب میں آپ نے دیکھا۔ کسی عالم سے سنا کہ باپ کے لئے مستحب ہو۔ واجب نہ ہو مستحب ہو کہ اپنی بیٹی کی تعظیم کرے۔ تحفۃ العوام وغیرہ ہی نہیں۔ دنیا کی کسی کتاب فقہ میں۔ مطالعہ کی پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے دنیا کی کسی فقہ کی کتاب میں نہیں دیکھا کہ باپ کے لئے سنت ہو کہ بیٹی کی تعظیم کرے۔ آجکل آسان ہے یہ کہہ دینا۔ کوئی کہے کہ ان سب علما نے غلطی کی۔ ارے صاحب ریسرچ کا تقاضا یہ ہے کہ ایک بات آج سمجھ میں آئی۔ تو چاہے ہم سے کسی نے پہلے نہیں کہا ہو۔ ابھی تک کسی نے نہیں لکھا اب جو ہم کتاب لکھیں گے۔ کیونکہ دلیل ہمارے سامنے موجود ہے۔ صحیح ترمذی کی حدیث شریف ہے۔ اب سے ہم لکھا کریں گے۔ اور خصوصاً ہمارے طبقہ کے لوگ۔ فضیلت کا ایک پہلو بھی ہے تو ہم کہاں بھول سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ واقعی ہم نے اس طرف ابھی تک توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اب سے ضرور ہم اپنی بیٹی کی تعظیم کیا کریں گے۔ تو صاحب اب تک تو یہ علما کا عمل ہے کہ کتابوں میں نہیں لکھا۔ بیچارے علماء غیر معصوم ہیں۔ کہہ دیجئے کہ غلطی کی سب نے۔ لیکن اب اس سے بالاتر ہے مشترک اسلامی نقطہ نظر سے۔ اور خود ہمارے معتقدات کی روشنی میں کسی نے بھی جو سنت رسول کی پیروی کرنے کا دعویدار تھا۔ کبھی اس سنت رسول پر عمل نہیں کیا۔ حضور کے صحابہ کرام میں کیسے کیسے لوگ تھے۔ جو سنت پیغمبر ایک

ایک یاد رکھتے تھے۔ خود حالات صحابہ کی کتابوں میں یہ بھی ہے کہ عبداللہ ابن عمر۔ انہیں کسی نے دیکھا کہ اس درخت کے نیچے جا کر نماز پڑھی۔ اس درخت کے نیچے نماز پڑھ رہے ہیں۔ ادھر اُدھر پھر کر نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ کسی نے کہا آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ کہا جہاں جہاں کبھی رسول کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا وہاں وہاں نماز پڑھ رہا ہوں۔ یہ اتباع سنّت کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ تو اتباع سنّت کا اتنا ذوق و شوق۔ یہ ویسے بڑی اچھی بات ہے۔ ایک ایک ہزار صفحہ کی کتابیں حالات صحابہ میں ہیں لیکن کسی صحابی کے حالات میں نظر نہیں آتا کہ وہ اپنی صاحبزادی کی تعظیم کرتے ہوں اور کھڑے ہو جاتے ہوں۔ ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں۔ ارے ایسی ایسی صاحبزادیاں جو کسی حیثیت سے واجب التعظیم بھی ہو چکی ہیں مگر ان کے پدرانِ نامداران کی تعظیم کے لئے نہیں کھڑے ہوتے۔ تو یہ کیا معاملہ ہے حالانکہ صحاح ستہ۔ صحیح ترمذی میں حدیث موجود اور برابر نقل بھی ہوتی رہی۔ یہ نہیں کہ اسے بھول گئے ہوں۔ اچھا صحابہ تو غیر معصوم تھے۔ کوئی مسلمان نہیں مانتا کہ اصحاب معصوم تھے۔ عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جیسے رسالت ختم ہوگئی عصمت بھی ختم ہوگئی۔ یا یوں کہیئے کہ جتنی حد تک رسول کے لئے عصمت مانی اتنی رسول کے بعد ختم ہوگئی۔ مگر ہمارے ہاں نبوّت ختم ہوگئی رسالت ختم ہوگئی۔ عصمت ختم نہیں ہوئی اب جو خدا کی طرف کا رہنما ہو چاہے بنام امام ہو۔ وہ امامت جو اُصولِ دین میں ہے۔ اس امامت کا حامل جو بھی ہو۔ وہ معصوم ہے۔ عصمت ختم نہیں ہوئی وہ تا قیام قیامت قائم ہے تو صحابہ کے بارے میں تو ہمارے افراد بے جھجک کہہ دیں گے کہ ان کا عمل ہمارے لئے سند نہیں ہے لیکن بحمداللہ آپ اور ہم معصوم مانتے ہیں جنکی سیرت ہمارے نزدیک جزوِ سیرتِ رسول ہے۔ اُن میں سے کوئی اپنی

صاحبزادی کی تعظیم کو کیوں نہیں کھڑا ہوتا۔ حالانکہ کیسی کیسی صاحب صفات صاحبزادیاں
میں کہتا ہوں کہ امیر المومنین حضرت زینب کی تعظیم کیوں نہیں فرماتے۔ کوئی روایت
آپ نے سُنی ہے۔ مجھے معلوم ہے کبھی یہ سُنا ہو گا کہ امام حسین بہن کی تعظیم کو کھڑے
ہوتے تھے۔ اگر ایسا ہے تو ہے اونچی بات یہ بھی۔ مگر وہ بات تو نہ ہوئی بھائی
بہن تو ایک برابر کا رشتہ ہے۔ باپ بیٹی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہو وہ
نظیر نہیں ملتی۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ امیر المومنین تعظیم کے لئے کیوں نہیں کھڑے
ہوتے۔ امام حسین نے جناب سکینہ کے لئے اظہارِ محبت میں جو جملے ارشاد فرمائے
ہیں وہ ہم تک پہنچے ہیں، لیکن یہ بات ہم تک نہیں پہنچی کہ حضرت امام حسین سکینہ
و فاطمہ کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے اور جو بھی بیٹیاں ہوں ان بیٹیوں کی امام حسین
کیوں نہیں تعظیم فرما رہے ہیں۔ اور جناب معصومہ قم۔ باوجودیکہ فہرست معصومین
میں نہیں ہیں لیکن جلالتِ قدر وہ ہے کہ آپ معصومہ کہنے لگے۔ معصومہ قم کا
محاورہ آپ کے درمیان رائج ہے مگر یاد رکھئے کہ معصومہ کہہ دینے سے فہرست
معصومین میں داخلہ نہیں ہو جاتا۔ تو معصومہ قم کہنے لگے وہ بات الگ ہے،
لیکن چودہ معصوم وہ ہیں کہ دلیل عصمت جن پر قائم ہے۔ بہرکیف کچھ ایسا جذبہ
احترام پیشِ نظر ہے کہ امام رضاؑ کی بہن کو معصومہ قم کہا جانے لگا۔ میں کہتا ہوں کہ
امام رضا کی بہن ہیں تو امام موسیٰ کاظم ان کی تعظیم کو کھڑے ہوں۔ جناب حکیمہ خاتون
اتنی محل اعتماد تھیں کہ رازِ منتظر کی امانت دار قرار پائیں مگر امام محمد تقیؑ ان کی
تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے۔ تو اب یہ معمہ ہو گیا نا کہ ایک عمل رسول مسلماً
جو اور چودہ سو برس کا کوئی عالم نہیں لکھ رہا کہ یہ مستحب ہے۔ صحابہ عمل نہیں
رہے۔ جن کے گھر کی بات ہے۔ ان میں سے بھی کوئی عمل نہیں کر رہا۔ تو
وہ اصول ٹوٹ گیا۔ عملِ رسول کی پیروی میں فضیلت نہیں رہی۔ تو بس

جو میں جواب دوں اُسے دنیا قبول کرے ورنہ جو حل اس کے سامنے ہو وہ پیش کر دے۔ میں کہتا ہوں کہ چودہ سو برس کے علما نے یہی سمجھا۔ صحابہ رسول یہی سمجھے۔ جن کے گھر کی بات تھی ان آئمہ معصومین نے یہی جانا کہ فاطمہ کی یہ تعظیم بحیثیت بیٹی کے نہیں ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے ہوتی تو مجھ پر بھی اپنی بیٹی کی تعظیم سنت ہوتی۔ آپ پر بھی ہوتی۔ ہر ایک پر ہوتی، لیکن یہ تعظیم بحیثیت بیٹی کے نہیں ہے۔ یہ شخصیت فاطمہ کے لحاظ سے ہے۔ عظمتِ فاطمہ کے لحاظ سے ہے۔ اب میں کہتا ہوں اصول قائم ہے۔ سنت رسول کی پیروی لازم ہے مگر قیامت تک کے مسلمان کے لئے تعظیم فاطمہ واجب ہے۔ اپنی بیٹی کی تعظیم سے سنت ادا نہیں ہو گی۔ صلوٰۃ اب سیدہ عالم کی اتنی تعظیم کس بنا پر ہے اور کس حیثیت سے ہے وہ بہت تشریح طلب ہے اور آفتاب کی کرنیں مجھ کو پیغام وداع دے رہی ہیں لہٰذا میں آگے نہیں بڑھوں گا۔ سیدہ عالم کی تعظیم پیغمبر خدا فرما رہے ہیں سیدہ عالم کی منزل کیا ہے کہ رسول نے فرمایا کہ فاطمة بضعة مني۔ فاطمہ میرا ایک جز ہے۔ یہ جز جسم کا جز تھوڑی ہے۔ مجھے معلوم ہے بعض ذاکر یہ ترجمہ کر دیتے ہیں۔ لخت دل پارہ جگر۔ اس سے بات محبت پر ڈھل جاتی ہے۔ رسول نے جو فرمایا ہے اس میں نہ دل ہے نہ جگر۔ پیغمبر نے فرمایا میرا ٹکڑا۔ تو میرا ٹکڑا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے فرائض کی تکمیل نہ ہوتی بغیر فاطمہ کے۔ اور پھیلا کے عرض کرنے کا موقع نہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ فرمان رسول جو زبانی ہے۔ وہ تو ہدایت خلق کر سکتے تھے اقوال سے۔ سیرتِ رسول مقام اتباع میں کافی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ رسول مردوں کے لئے نمونہ بن سکتے تھے خواتین کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتے تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ خزانہ رسالت میں اک گوہر بے بہا ایسا ہو جس کا کردار خواتین کے لئے ویسا ہی معصوم نمونہ ہو جیسا رسول

کا کردار مردوں کے لیے معصوم نمونہ ہے اس کے لئے خالق نے فاطمہ زہرا جیسی بیٹی کرامت فرمائی۔ اور میرے نزدیک تو رسول اسی لئے تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ وہ فاطمہ کی تعظیم نہ تھی اس منصب کی تعظیم تھی، جو فاطمہ کے سپرد تھی اور میں نے عرض کیا کہ تفصیل سے عرض کرنے کا موقع نہیں ہے مگر ایک خیال میرے ذہن میں مدتوں رہا ہے میں انکار نہیں کرتا اپنی کوتاہی علم کا اقرار کرتا ہوں کہ حضرت امیرالمومنین کے فضائل بے شمار مگر مجھے کہیں نہیں ملا کہ رسول اللہ حضرت علیؑ کی تعظیم کو کھڑے ہوئے ہوں۔ کسی اور کا کیا ذکر علی کے لئے نہیں ملا کہ رسول تعظیم کو کھڑے ہوتے ہوں مگر فاطمہ کے لئے مل رہا ہے۔ میں نے اس پر غور کیا ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے۔ نہیں۔ فضائل کا زیادہ ہونا اور چیز ہے اوصاف کا بلند تر ہونا اور چیز ہے تو یقیناً امیرالمومنین کی جو منزل ہے وہ ان کے ساتھ مخصوص ہے مگر جو عرض کر رہا ہوں اس پر غور کیجئے خود اپنے معتقدات کی روشنی میں یعنی اوصاف اور چیز کمالات اور چیز مگر علی کا جو منصب ہے وہ بعد رسول ہو گا اور فاطمہ کا جو منصب ہے وہ رسول کی موجودگی میں ہے۔ گذشتہ دور میں ہمیں ایک معصومہ معلوم ہیں حضرت مریم۔ مگر حضرت مریم کی زندگی رہنمائی خلق کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کی شریک نہیں۔ عورتوں کے لئے جو اصل زندگی ہے اس کے لئے مثال نہیں بن سکتیں۔ تو مریم کے بعد فاطمہ کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ طبقے میں بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام۔ تو انہوں نے کہا۔ مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز۔ از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز تو انہوں نے تو عزت کے اعتبار سے کہا میں دوسری حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ بحیثیت نمونہ عمل کے حضرت مریم۔ بیٹی ہونے کا نمونہ بن سکتی ہیں۔ ماں ہونے کا نمونہ بن سکتی ہیں مگر شریک حیات کی حیثیت سے جو فرائض ہیں اس کا نمونہ نہیں بن سکتیں۔ اس کے لئے

ضرورت تھی۔ حضرت فاطمہ زہرا کی۔ یہاں تینوں پہلو مکمل۔ بحیثیت بیٹی باپ کے ساتھ شریکِ عمل مباہلے میں۔ بحیثیت زوجہ کے امیرالمومنین کی شریکِ حیات عمر بھر۔ اور بحیثیت ماں کے چاہے حسن و حسین کا نام لے لیجئے چاہے زینب و ام کلثوم کا۔ یہاں تینوں شعبے مکمل مگر اب مصائب عرض کرنا ہیں میں خود بارگاہِ سیدہ عالم میں عرض کروں گا کہ بے شک آپ کی زندگی مکمل معاذ اللہ آپ کی سیرت میں کوئی نقص نہیں مگر قدرت نے آپ کو بھائی عنایت نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس رشتے کے تقاضے کیا ہوتے ہیں وہ آپ نہیں ظاہر فرما سکیں جس طرح مریم کے بعد آپ کی ضرورت تھی وہاں آپ کے بعد مخدومہ عالم آپ کی بیٹی کی ضرورت تھی۔ آپ شریکِ جہاد مباہلہ۔ یہ شریکِ جہاد کربلا۔ مگر بہ اعتبار صنف جہاد کے تقاضوں پر عمل الگ الگ ہوا۔ میں کہتا ہوں وہ عصر تک کا جہاد اس میں سرگردہ حسین ابن علی۔ عصر کے بعد کا جہاد اس کے سرگردہ زینب بنت فاطمہ۔ اور میری کیا مجال کہ میں حضرت امام حسین کے کارنامہ پر کسی کارنامے کو فوقیت دوں مگر جو واقعاتی فرق ہے وہ میں کیونکر عرض کروں کہ مولا جب میدان جہاد میں تھے تو ہر مصیبت میں زینب شریک تھیں۔ کونسی مصیبت مولا نے اٹھائی جو زینب نے نہ اٹھائی ہو مگر جب زینب کا وقتِ جہاد آیا تو اب بھائی موجود نہ تھا بھائی کا سر تھا جو کربلا سے کوفہ تک اور کوفہ سے شام تک ساتھ ساتھ چلا گیا۔ بس ایک جملہ اور۔ اور اسی پر ختم۔ میں کہتا ہوں کہ کربلا والوں نے عصر تک کا جہاد بے مثال کیا۔ بے شک شہزادہ قاسم نے بہترین جہاد کیا۔ شہزادہ علی اکبر نے بے نظیر جہاد کیا۔ ہمارے آقا ابوالفضل العباس نے بہترین جہاد کیا ہمارے مولا نے جب تلوار لے کر جہاد کیا تو وہ بھی بے مثال تھا مگر پھر انہی ہستیوں کی بارگاہ میں عرض کروں گا کہ اے میرے شہزادے

قاسم و علی اکبر لے میرے چھوٹے آقا عباس۔ اے میرے امام حسین بے شک آپ نے جہاد بے مثال کیا مگر جو جہاد آپ نے کیا وہ خاندانی روایات کے مطابق تھا علیؑ کے پوتے یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا۔ حمزہ کے وارث یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا۔ جعفر کے وارث یوں جہاد نہ کرتے تو کون کرتا مگر زینبؑ نے جو جہاد کیا وہ خاندانی روایت سے الگ تھا۔ ارے جس کی ماں کا جنازہ رات کو اٹھا ہو وہ روز روشن میں شہر بہ شہر۔

مجلس دوم

شعائر اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ ۔

جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا ایک جز ہے۔ میں نے عرض کیا کہ عبادت اللہ کے ساتھ ہے۔ کسی اور چیز یا کسی اور شخص کے لئے عبادت نہیں ہو سکتی۔ مگر جہاں تک تعظیم کا تعلق ہے تو اس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم پرہیزگاری کا ایک جز ہے تو اس سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اور چیز ہے اور تعظیم اور چیز ہے۔ پیغمبرِ خدا کی تعظیم کی دعوت جس طرح دی گئی ہے اس کے لئے میں نے دو آیتیں پڑھی تھیں۔

لا تجعلوا دعا الرسول بینکم کدعا بعضکم بعضا۔ اس طرح نہ پکارا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو دوسرے لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی اپنی آوازوں کو رسول کی آواز سے اونچا نہ کیا کرو اب ایک اور آیت الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورٰۃ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

ارشاد ہو رہا ہے تائید کی جارہی ہے کہ وہ جو پیروی کرتے ہیں اس نبی امّی کی۔ اس وقت ہر ہر لفظ کی تشریح منظور نہیں ہے۔ جسے لکھا ہوا دیکھتے ہیں خود اپنے پاس یعنی اہل کتاب خود اپنے پاس لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ توریت اور انجیل میں اور یہ انہیں نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اور ان کے لئے اچھی صاف ستھری پاک غذاؤں کو حلال قرار دیتا ہے اور جو خبیث چیزیں ہیں انہیں منع کرتا ہے انہیں حرام قرار دیتا ہے اور جو بوجھ ان پر تھے ان کو دُور کرتا ہے اور جو زنجیریں ان کے پیروں میں پڑی ہوئی تھیں ان کو دُور کرتا ہے۔ یہ ایک طویل آیت ہے اس کے ہر جز کی تشریح نہیں کرنا ہے۔ تو جن لوگوں نے اس پر ایمان اختیار کیا۔ آمنو بہ کے معنی ہیں اس کے بعد ہے عزّروہُ۔ اس کے بعد ہے نصرُوہ۔ اب عزّروہ کے معنی لغت میں دیکھے گیا ہیں۔ آمنوا بہ کے معنی سب جانتے ہیں۔ نصروہ کے معنی سب جانتے ہیں۔ نصرت کے معنی ہیں مدد کرنا۔ مگر لغت میں دیکھیے تو عزّروہ کے معنی ہیں ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ جو لوگ ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ آیا ہے۔ یہی لوگ دین و دنیا کی بہتری حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ تو خصوصی انداز سے جنکو میں کہتا ہوں کہ ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ تعظیم ہے۔ یعنی نام اس طرح نہ لو جیسے اوروں کا نام لیتے ہو۔ لیکن یہاں تو عزّروہ کے معنی ہیں عزّروہ کہ انکی تعظیم کرتے ہیں۔ اب جو جو چیز داخل تعظیم ہو وہ مطلوب خالق ہوگی جب تک کہ استثناء نہ ہو۔ کسی ایک طریقہ تعظیم کو خاص طور سے منع کردیا جائے تو وہ اور بات ہے لیکن جب تک کہ استثناء نہ کیا جائے اس وقت تک جو بھی طریق تعظیم ہوگا۔ وہ اس حکم الٰہی میں داخل ہوگا اور یاد رکھنا چاہیئے کہ تعظیم ایک عنوان ہے جس کے تحت میں جو جو طریقے ہیں وہ بہ اختلاف زمانہ بہ اختلاف ملک بدلتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں کوئی طریقہ تعظیم کا نہ ہو اور دوسرے

وقت میں وہ طریقۂ تعظیم کا رواج پا جائے جس طرح توہین۔ وہ جو اس کا مقابل رُخ ہے۔
وہ بھی ملک، آب و ہوا اور زمانے کے اعتبار سے بدلتی ہے۔ ایک جگہ ایک بات توہین
نہیں ہوتی دوسری جگہ وہ توہین ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اگر شہروں میں نہیں
تو دیہاتوں میں پنجاب کے۔ تو اور تم کہہ کر بات کرنا خاص طور سے کوئی توہین نہیں ہے
بعض جگہ گفتگو کا انداز ہی یہی ہے۔ لیکن مثلاً ہمارے ہاں ہندوستان میں اور خصوصاً
یوپی میں۔ تم یا تو کہنا یہ تذلیل اور توہین قرار پاتا ہے ویسے بھی تعظیم کے انداز مختلف
ملکوں میں مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ تو جو حکم خالق کی طرف سے سب کے
لئے آئے وہ ہر ملک کے لحاظ سے اس کی تہذیب کے اعتبار سے اس کے تمدن کے
اعتبار سے جو طریقۂ تعظیم ہو اس پر حاوی ہوتا ہے اور ہر ملک کے لحاظ سے جو
طریقۂ توہین ہو جو طریقہ اہانت ہو۔ وہ حرام ہو جائے گا، بلکہ کفر ہو جائے گا تو اس
مصداق کے طریقے بدلتے رہ سکتے ہیں مگر اصل حقیقت اپنے حال پر قائم رہے گی کہ
خالق کی طرف سے تعظیم کا حکم ہے۔ جیسے میں نے کہا کہ ذکرِ رسولؐ کے درمیان قیام بعض
جماعتوں میں رائج نہیں ہے۔ بعض جماعتوں میں رائج ہے لیکن رائج جن جماعتوں میں
ہے وہ کس بنا پر۔ تعظیم کی بنا پر۔ لہٰذا وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اسی تعظیم و
احترام میں داخل ہو گا جس کا خالق نے حکم دیا ہے۔ اب ایک اور بات۔ کل کا بیان
تھا جس کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے ابتدا ہی میں۔ میں نے کہا کہ تعظیم اور ہوتی
ہے عبادت اور ہوتی ہے یعنی تعظیم اور عبادت ایک چیز نہیں ہے مگر اب میں
یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی تعظیم جو حکمِ الٰہی سے ہو وہ یقیناً عبادت ہے مگر فرق
صرف اتنا ہے کہ تعظیم کسی کی ہے عبادت کسی کی ہے۔ تعظیم شعائر اللہ کی ہے اور
عبادت اللہ کی ہے تعظیم رسولؐ کی ہے اور عبادت اللہ کی ہے کیونکہ عبادت
اس کی ہے جس کے حکم سے تعظیم ہے اور تعظیم اسی کی ہے جس کی تعظیم کا اس نے

حکم دیا ہے تو متعلق تعظیم اور ہے متعلق عبادت اور ہے۔ تو تعظیم بہرحال شرک نہیں ہو سکتی اگر حکم خدا سے ہو تو عبادت ہو گی اگر از خود ہے یا کسی محرک دنیاوی کے لحاظ سے تو وہ عبادت نہیں ہو گی۔ جیسے بہت سے کام ہمارے جو اس کے حکم کی بنا پر نہ ہوں خود سے ہوں فرض کیجیے کہ کسی حاکم ضلع کی تعظیم کر رہے ہیں یا اپنے کسی بزرگ کی تعظیم کر رہے ہیں۔ ماں باپ کی تعظیم کر رہے ہیں تو اگر اس وقت تصور ہو حکم خدا کا تو عبادت ہے کیونکہ اس نے حکم دیا ہے تعظیم کا۔ اسی طرح فرض کیجیے اپنے استاد کی تعظیم کر رہے ہیں تو وہ بھی اس نے کہا ہے کہ جو تمہیں تعلیم دے وہ ایسا ہے جیسے تمہارا آقا و مولا عالم دین کی تعظیم کریں کہ وہ اس دین کا عالم ہے تو یہ سب تعظیمیں عبادت ہوں گی۔ اگر کسی امیر کبیر کی اس کی دولت کی وجہ سے تعظیم کریں تو وہ بس تعظیم ہو گی عبادت نہیں ہو گی۔ اگر کسی بوڑھے کی اس کے بزرگ ہونے کی وجہ سے بر اعتبار سن تعظیم کی تو وہ بھی حکم خدا سے ہے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو سن رسیدہ بڑے لوگ ہیں ان کی توقیر کرو۔ تو اگر اس کا حکم پیش نظر ہے تو وہ بھی عبادت ہو گی۔

غرض یہ کہ اگر اس کے حکم کے ماتحت تعظیم ہے تو وہ تعظیم بھی ہے اور عبادت بھی ہے۔ مگر تعظیم کسی کی ہے عبادت کسی کی ہے۔ عبادت ہے خالق کی۔ اب جو طریقے تعظیم کے ہوں اکثر نام لے لے کر ان کو شرک کہا جاتا ہے مثلاً جا کر روضہ نبوی کی ضریح کو بوسہ دیا تو بہت زیادہ زبان ہی سے شرک شرک نہیں ہوا بلکہ پشت پر تازیانہ بھی پڑ گیا گویا پاداش شرک یہیں مل گئی۔ اسی طرح سے اور اسی طرح کے کاموں کو جو شرک کہا جاتا ہے۔ سجدہ گاہ پر امام نے سجدہ کر لیا آواز آئی شرک۔ جب ضریح نبوی کا بوسہ لینے پر شرک کا حکم لگ گیا تو پھر ظاہر ہے کسی علم کو ضریح کو تعزیے کو۔ جو ایام عزا میں ہوتی ہے اس کو بوسہ دے لیں۔ تو وہ بھلا کہاں توحید کے دائرے میں ہو گا۔ یہ جو ان کاموں کو ترک کرایا جاتا ہے میری سمجھ میں تو اس کے معنی ہی نہیں آتے۔

رد کرنا تو اور بات ہے وہ تو اس وقت ہے جب مفہوم سمجھ میں آئے اور جب کسی چیز کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں تو اس کی رد کیا ہو۔ اب میں عرض کرتا ہوں۔ خانہ کعبہ کا طواف ہوتا ہے۔ اب فرض کیجیے کوئی بنظر عقیدت کسی ضریح کا طواف کرے تو بڑی شدت سے آواز آئے گی کہ شرک اسی طرح حجر اسود کا بوسہ متفق علیہ لیکن کسی علم کو کوئی بوسہ دے تو آواز آئے گی شرک اور ایک چیز ابھی کہ۔ چنانکہ ہم نے سجدہ گاہ پر سجدہ کر لیا کہا گیا کہ شرک۔ اول تو ایک اصولی بات عرض کروں۔ وہ خشک بات یہ ہے اصولی۔ کہ جو شرک ہو اسمیں استثنا۔ کی گنجائش نہیں۔ میری زبان سے لوگ خشک باتیں سن لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم کہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے تو کیا اس میں الا کی گنجائش ہے کہ سوا اس کے شرک۔ جیسے اللہ کا شریک کوئی نہیں۔ اب اس میں سوا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح شرک حرام یا کفر یا ظلم عظیم اسمیں الا کی گنجائش کوئی نہیں ہے کہ سوا اس کے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جن جن چیزوں کو میں نے متفق علیہ کہا۔ طواف خانہ کعبہ جزو حج سب کے نزدیک۔ تو اگر کسی چیز کا طواف شرک ہے تو کیا خانہ کعبہ کو شریک بنانے پر وہ راضی ہو گیا۔ اسی طرح حجر اسود کو بوسہ دینا متفق علیہ ہے۔ وہ جہاں گویا کارخانہ ہے شرک سازی کا۔ وہ خود بھی اس پر عامل ہیں۔ حالانکہ ہر صاحب فہم غور کرے کہ شباہت بھی ڈرنے کی چیز ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ یہ چیز شرک نہیں ہے مگر تصور ہوتا ہے۔ یعنی ملتی جلتی ہوئی ہے شرک سے۔ تو یہ ملتا جلتا ہوا ہونا بھی محرک ہو سکتا ہے ہولناک بنانے کا تو اب میں ہر صاحب فہم کو دعوت دیتا ہوں کہ یہ حجر اسود کو بوسہ دینے کا جو حکم ہوا تو یہ تو پتھر ہے اور انہی پتھروں کو تو پوجتے تھے یعنی جنس اور نوع کے اعتبار سے اسی شرک کی قسم ہے جو مشرکین کرتے تھے مگر پھر بھی یہ ہی نہیں کہ حرام نہیں بلکہ جزو حج۔ یعنی امکان ہو تو بوسہ دے نہ امکان ہو تو استیلام کرے۔ مجمع کی کثرت کی وجہ سے رسائی نہ ہو تو

استلام کرلے یعنی ہاتھ سے یوں کرے۔ اور وہ پاس نہ جا سکے تو دور سے۔ اس سے ہم کو لوگ کہتے ہیں اتنی دور سے زیارت پڑھنے سے کیا فائدہ۔ وہاں نہیں سوچتے کہ دور سے یوں کیا اور پھر طلبی کر لیا اس سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عمل جذبہ احترام کا مظہر ہے۔ اب یہ سب کے نزدیک عبادت حالانکہ جو واقعی شرک تھا اس سے صورت و شکل میں کتنا قریب ہے اب وہاں ایک بام ددو ہوا۔ حجر اسود کو جا کر بوسہ دیا تو دیکھتے رہے۔ وہاں بھی کوٹے سے چلتے ہیں مگر وہاں وہ روکنے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ دوسروں کو موقع دیں۔ یعنی بس۔ بعض ہیں کہ لپٹے ہوئے ہیں اور ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ تو ان کے لئے کوڑا چلتا ہے کہ بس تم بوسہ لے چکے اب ہٹو۔ اب دوسروں کو موقع دو۔ تو وہاں یہ ترغیب و تحریص ہے۔ گویا اس کے لئے دوسروں کو موقع دینا یہ امداد ہے اس کی اعانت ہے۔ اس عمل خیر میں مگر اسی وقت رکن یمانی کو جو اس کے مقابل میں رخ ہے گوشہ ہے خانہ کعبہ کا اس کو اگر بوسہ دے لیا تو پھر چاروں طرف سے اعتراض کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اس گوشہ کا بوسہ لینا روا   اس گوشہ کا بوسہ لینا ناروا۔ یہاں فقہ کا اختلاف ہے ہمارے ہاں مستحب ہے رکن یمانی کا بوسہ لینا ان کے ہاں استلام تو ہے اس کا بھی لیکن وہ جو بوسہ لینا ہے وہ نہیں ہیں نے کہا جو شرک ہے اس میں استثنا کی گنجائش نہیں۔ اگر شرک ہے تو پھر حجر اسود کا بوسہ لینا بھی ناروا ہونا چاہیئے اور جب حجر اسود کا بوسہ لینے کی اجازت ہی نہیں ہے بلکہ حکم ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شرک تو نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس کا حکم نہیں ہے تو جس بات کا حکم نہ ہو وہ حرام تو نہیں ہو جاتی۔ اب جو جو غذائیں آپ کھاتے ہیں ان کے کھانے کا کہاں حکم ہے۔ جو آپ پیتے ہیں ان کے پینے کا کہاں حکم ہے تو حکم ہونا اور بات ہے ممانعت ہونا اور بات ہے جب تک ممانعت نہ ہو اس وقت تک جائز ہے حجر اسود کے بوسہ لینے کا حکم ہے۔ اس کے غیر کے بوسہ لینے کا حکم نہیں ہے تو

اچھا صاحب آپ عبادت نہ مانیئے اسکو۔ عبادت خدا نہ مانیئے لیکن وہ شرک کیونکر ہو جائے گا۔ جو شے شرک ہو وہ کسی وقت میں بھی نہیں ہے۔ ہاں میں نے کہا تھا کہ کسی طریقہ تعظیم کی کسی طور سے ممانعت ہو جائے وہ بھی شرک نہیں ہوگا گناہ ہو گا۔ شرک میں اور گناہ میں فرق ہے اور میں صاف طور سے کہوں کہ سجدہ طریقہ تعظیم۔ اسے ہمارے سوادِ اعظم کا ایک طبقہ یعنی صوفیا کا ایک گروہ جائز سمجھتا ہے اور بڑا گروہ مخالف ہے۔ ہمارے ہاں بھی شرعاً سجدہ جائز نہیں ہے کسی کو۔ اس کے لئے حدیثیں ہیں پیغمبر خدا کی۔ دو قسم کی حدیثیں میری نظر سے گزریں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا۔ اب یہ بات آج کے ترقی پسند زمانے کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے رسول اتنے ترقی پسند نہیں تھے۔ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ اگر سجدہ جائز ہوتا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ جائز نہیں ہے۔ اب یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں شاگردوں کو حکم دیتا کہ وہ استاد کو سجدہ کریں۔ اب کوئی فقیہ اگر جرأت استنباط رکھتا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جب شاگرد کو حکم دیا کہ وہ اپنے اُستاد کو سجدہ کرے تو پھر بیٹے کو بھی حکم دیتا کہ وہ اپنے باپ کو سجدہ کرے۔ کیونکہ اُستاد کو بھی کہا گیا ہے کہ وہ آبائے ثلاثہ یعنی تین قسم کے باپوں میں سے ہے تو باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی عزت ہے تو جب اس کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو جو واقعی باپ ہے اس کے لئے سجدہ کیوں نہ جائز ہوتا۔ لیکن یہ اگر ہوتا اگر ہوتا اسی نے بتا دیا کہ جائز نہیں ہے لہٰذا ہم سجدہ تعظیم کو جائز نہیں سمجھتے۔ مگر شرک کہنا غلط ہے۔ سجدہ بھی اگر بنظرِ تعظیم کرے تو وہ میرے نزدیک گناہ ہے شرک نہیں ہے اور اس کی دلیل۔ میں نے کہا کہ جو شرک ہے اس میں استثنا کی گنجائش نہیں۔ تو جو شرک ہے اس میں شریعتوں کی تبدیلی کا بھی اثر نہیں۔ کیونکہ ان الدین عند اللہ کا سلسلہ اصولاً

دین تمام انبیاء میں ایک ہے۔ توحید اور شرک اصولِ دین سے متعلق۔ ثواب اور گناہ یہ فروعِ دین سے متعلق تو اگر شرک ہوتا تو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہ دیتا۔ اگر شرک ہوتا تو برادرانِ یوسف اور یعقوب۔ یعقوب کی آنکھوں کے سامنے اور ان کی مرضی سے یوسف کو سجدہ نہ کرتے اور یہ سب باتیں قرآن سے ثابت۔ ہمارے اوپر وہ سندیں پیش نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ہم کہیں گے کہ اب ہم شریعت اسلام کے پیرو ہیں اس وقت سجدہ تعظیمی جائز تھا اور اس وقت پیغمبرِ اسلام نے کہہ دیا ہے کہ جائز نہیں ہے۔ مگر شریعتوں میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اصول دین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جب ناجائز ہوگیا ہے تب بھی گناہ ہے شرک نہیں ہے۔ شرک ہوتا تو کسی دور میں بھی جائز نہ ہوسکتا۔ اب جو بات میں نے شروع کی تھی بیچ میں اس کا دوسرا جزآگیا۔ میں نے کہا کہ میری سمجھ میں تو اس کے معنی ہی نہیں آتے۔ اب یہیں سے شروع کروں کہتے ہیں سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا شرک ہے۔ میں کہتا ہوں سجدہ گاہ کی حقیقت کیا ہے۔ یعنی پیشانی کے نیچے۔ اس کے لئے ایک تمہید کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شرک ہوتا کیا ہے۔ جو بات خدا سے خاص ہو اسے کسی دوسرے کے لئے صرف کرنا مثلاً خداوندِ عالم خالقِ حقیقی ہے اب کسی دوسرے کو خالق مانیں اس کے ذاتی ارادہ واختیار سے خود اس کی ذاتی طاقت سے تو شرک ہوجائے گا۔ اللہ بطور معجزہ کسی کے ہاتھ سے خلق کرادے وہ اور بات ہے لیکن خالق حقیقی بس ایک رازق حقیقی بس ایک ربِ حقیقی بس ایک۔ یہ باتیں کسی دوسرے کے لئے ثابت کردی جائیں تو وہ شرک ہوجائے گا یا جیسے میں نے کہا کہ عبادت جس سے خاص ہے۔ عبادت کسی دوسرے کی کرے۔ اب عبادت کے معنی کیا۔ اللہ ہونے کا تصور کرکے کوئی عمل کرے اس کا نام عبادت۔ کسی دوسرے کے لئے اسی تصور کے ساتھ کرے تو وہ شرک ہوجائے گا لیکن جو بات اللہ کے لئے ہو ہی نہ سکتی ہو اُسے غیر اللہ کے لئے ثابت کریں تو وہ شرک کیونکر ہوگا۔

اللہ کے لئے کوئی بات ہوتی ہو اور اُسے غیر اللہ کے لئے ثابت کریں تو سمجھ میں آتا ہے
کہ شرک ہے اور جو بات ہوتی ہو غیر اللہ کے لئے اُسے غیر اللہ کے لئے ثابت کریں۔
مثلاً کسی باپ ماں سے پیدا ہونا۔ یہ غیر اللہ سے خاص ہے۔ تو اب ہم کسی کی ولادت۔
وہ چاہے کعبے میں ہو۔ وہ ولادت بیان کریں یہ کہہ کر کہ خدا کے گھر میں ہوئی۔ تو گھر خدا
کا ہے مگر ولادت تو غیر اللہ ہی کی ہوگی اسے کیونکر کہا جائے گا شرک اور یہاں تیرہ
رجب کی محفل تھی ولادت جناب امیرؑ کا بیان تھا تو ایک صاحب نے پوچھ لیا کہ اگر
یہ بہت بڑی فضیلت ہے تو آخر رسول کیوں نہیں پیدا ہوئے کعبہ میں۔ اللہ نے
یہ بات رسول کے لئے کیوں نہیں رکھی۔ انہی کو کیوں کعبے میں پیدا ہونے کا موقع دیا۔
بظاہر تو سوال مشکل تھا۔ مگر میں نے جو عرض کیا کہ ہاں۔ یوں تو خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔
بندہ ایک راز کی بات کو کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ مگر کچھ میری سمجھ میں بھی آتا ہے وہ یہ ہے
کہ رسول کو بعد میں خدا کہنے والی کوئی جماعت پیدا ہونے والی نہیں تھی علم الٰہی میں۔
مگر اس کے علم میں اس بندے کے لئے بعد میں خدا کہنے والے پیدا ہونے والے تھے
اس لئے اس کی ولادت کو نمایاں کرنے کی ضرورت تھی کہ دیکھو یہ خدا نہیں ہیں یہ
تو پیدا ہوئے ہیں۔ صلوٰۃ۔

تو ولادت کیونکہ غیر اللہ سے خاص چیز ہے تو اگر ہم کسی کی ولادت کو کتنا ہی
فضیلت کے ساتھ بیان کریں تو یہ تو ثبوت ہے اس کا کہ ہم نے انہیں خدا نہیں سمجھا
ہے اس میں شرک کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ جو بات غیر اللہ کے لئے خاص ہے
اس کو ثابت کریں غیر اللہ کے لئے تو کیسے شرک ہوگا۔ تو اب دیکھئے کہ سجدہ گاہ
پیشانی کے نیچے ہے کیا یہ بات اللہ کے لئے ہو سکتی ہے۔ کیا ہماری پیشانی کے
نیچے اس کا دست حق پرست آسکتا ہے۔ کبھی معاذ اللہ اس کا کوئی حصۂ جسم۔
جسم ہی وہاں کہاں ہے جو ہماری پیشانی کے نیچے ہو۔ ہماری پیشانی کے نیچے جو

ہوگا کوئی حصۂ جسم ہوگا۔ تو یہ بات تو غیر اللہ کے لئے خاص ہے تو کسی غیر اللہ کے لئے ہم وہ عمل کریں تو شرک کہاں سے ہوگا۔ یعنی اگر آپ اپنے کپڑے پر سجدہ کر لیں تو وہ شریک خدا نہ ہو۔ ماشاء اللہ قالین پر سجدہ کریں تو وہ شریک خدا نہ ہو۔ اور ہم خاک شفا پر۔ اسے مٹی کی جنس پر سجدہ کریں جو خاکساری کا نشان ہے۔ قالین پر سجدہ میں تو پھر بھی امارت پسندی کا ایک پہلو ہے خاک پر سجدہ بوریا نشینوں کی علامت ہے۔ جتنی قیمتی چیزیں بھی ہوئی ہوں چاہے وہ ریشم کا فرش ہے چاہے وہ زر تار ہو اس میں سونا لگا ہوا ہو۔ جواہر لگے ہوئے ہوں مگر جب نماز پڑھیں گے تو خاک کی ٹکیہ لائیں گے دنیا اسے خاک کی ٹکیہ ہی کہے گی بہرحال ہم اُسے پیشانی کے نیچے رکھیں گے۔ یعنی یہ ایک اظہار ہوگا کہ ہم ان تمام اسباب ثروت کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اس کی ہمارے نزدیک کوئی عزت نہیں۔ اُسے بوسہ نہیں دیتے اسے بوسہ دیتے ہیں۔ اسے قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اب تو بنظر شرف کربلا کی خاک کہتے ہیں ورنہ مسئلہ حقیقی کے لحاظ سے کوئی خصوصیت نہیں وہ تو ایک اصول ہے درخت کا پتہ لے لیتے ہیں۔ پنکھا ہوتا ہے وہ رکھ لیتے ہیں چٹائی ہوتی ہے اس پر سجدہ کر لیتے ہیں۔ اگر خاک شفا ہے تو اُسے ترجیح دے دیتے ہیں۔ اسے شرک کہنے کے معنی کیا ہیں۔ کا ہے کا شرک۔ یعنی بوسہ دیا ضریح کو۔ وہ بہت بڑا شرک۔ میں کہتا ہوں بوسہ دینے کی کیا حقیقت ہے۔ ہمارے لب کسی جسم سے متصل ہوں۔ یہی معنی تو بوسے کے ہیں۔ تو وہی بات کہ کیا ہمارے لب اللہ سبحانہٗ کے کسی جز سے متصل ہو سکتے ہیں۔ یہ جب بھی ہوگا کسی جسم کے ساتھ ہوگا۔ کسی مخلوق کے ساتھ ہوگا۔ اب میری عمر ایسی نہیں۔ ان باتوں کو پیش کرنا اور پھر جلالت منبر مانع ہے اگر حق منبر کوئی سمجھتا ہو تو بڑی نازک منزل ہے۔ عرفی نے اس قصیدہ میں جو نعتِ رسول میں کہا تھا۔ بڑا معرکہ آرا قصیدہ اس میں کہا تھا . . .

ھُشدار کہ پا بر سرِ تیغ است قلم را۔ ہوش رکھو کہ قلم کا پیر تلوار پر ہے۔ بادشاہوں کی تعریف کر لینا آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی تعریف کرنا۔ جو شایانِ شان ہو وہ بڑی نازک منزل ہے۔ قلم کا پاؤں تلوار پر ہے تو اب اسمیں ذرا سے تصرف کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ اگر منبر کے محل کی عظمت کا احساس ہو تو ہر خطیب اپنے دل سے کہے ھشدار کہ پا بر سرِ تیغ است زبان را۔ ہوش رکھو کہ زبان کا پاؤں تلوار کی دھار پر ہے۔ یہ مقام منبر نہ مذاق کا متقاضی ہے نہ بے فائدہ باتوں کا متقاضی ہے۔ اسمیں حقیقت ہونی چاہیئے۔ اسمیں وہ ہونا چاہیئے جو منبر کے شایانِ شان ہو۔ مگر اپنی غیر شاعرانہ زبان میں کہوں گا کہ جناب بوسہ لینا جذبات نفس کی تحریک سے ہو تو شرک نہ ہوا۔ ازروئے عقیدت ہو تو شرک ہو جائے اب طواف کرنا۔ میں نے کہا خانہ کعبہ میں متفق علیہ۔ کوئی امام بارگاہ کا طواف کرے کوئی مزار کا طواف کرے کوئی روضۂ حسینی کا طواف کرے کوئی کہے غضب کیا غضب کیا۔ میں کہتا ہوں غضب کیا کیا۔ طواف کیا ہوتا ہے۔ بیچ میں کوئی شخص یا کوئی چیز اور اس کے گرد چکر لگانا۔ تو کیا کبھی آپ کو اللہ سبحانہٗ ملے گا کہ اس کے گرد چکر لگائیے۔ کوئی زبان سے کہے یا نہ کہے مگر جسمانیت کے تقاضے ثابت کرتا ہے تو وہ بھی اس کی عظمت کا تصور یہ رکھتا ہے کہ عرش پر نہیں سماتا۔ تو پھر آپ کیا چکر لگائیں گے مگر ہم تو کہتے ہیں کہ جسمانیت سے بری ہے تو وہاں تو چکر لگانے کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی عمارت کے گرد کسی شے کے گرد چکر لگائے جائے گا تو کوئی معنی ہی نہیں طواف کو عبادت سمجھنے کے۔ ہاں ہر چیز میں معنی پیدا ہو جائیں گے اگر جس کا چکر لگا رہے ہیں اسے خدا سمجھ لیں اگر جس کا بوسہ لے رہے ہیں اُسے خدا سمجھ لیں تو شرک ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ شرک بوسہ لینے سے نہیں ہوا ہے خدا سمجھنے سے ہوا ہے اور اسی لئے ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ خدا سمجھ کر آنکھ سے

ایک اشارہ ہوگا تو شرک ہوگا اور بغیر خدا سمجھے ہوئے سجدہ بھی ہوگا تو شرک نہیں ہوگا۔

اب جناب تعظیم کے تقاضے سب جانتے ہیں۔ تعظیم کبھی براہ راست ہوتی ہے اور کبھی اضافتوں کے ساتھ ہوتی ہے تو اب میں مثالوں سے ثابت کروں گا کہ اضافتوں کے ساتھ جو تعظیم ہو وہ بڑے درجہ کی تعظیم ہوتی ہے۔ ایک صاحب کوئی عالم دین کوئی صاحب دولت آ گئے۔ حاکم ضلع آئے آپ کھڑے ہو گئے تعظیم کے لئے۔ مگر اب وہ نہیں آئے ان کا چھوٹا سا بچہ آ گیا مگر اب اس بچے کو دیکھ کر آپ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا یہ آپ اس بچے کی تعظیم کرتے ہیں آپ نے کہا جانتے نہیں کس کا بچہ ہے۔ تو بتائیے جب خود ان کے لئے آپ کھڑے ہوئے تھے وہ بڑے درجے کی تعظیم تھی یا یہ بڑے درجے کی ان کی تعظیم ہوئی اب جناب وہ خود بھی نہیں آئے نہ بیٹے کو بھیجا۔ ارے ان کا نوکر آ گیا۔ نوکر صورت شکل سے کوئی دیہاتی آدمی ہے۔ آپ اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا ارے آپ اس دہقانی کی تعظیم کرتے ہیں۔ آپ نے کہا اسے نہ دیکھو۔ یہ دیکھو کس کا نوکر ہے اب دیکھئے بیٹے کی تعظیم کو جو کھڑے ہوئے تھے اس سے بھی بڑھ گئی یہ تعظیم۔ اور اب جناب وہ ان کا بھیجا ہوا کوئی بھی نہیں۔ ڈاکئے نے لا کر ان کا خط دیا۔ روز ڈاکئے سے خط لیتے تھے چپکے بیٹھے رہتے تھے۔ آج ڈاکئے نے خط دیا اور آپ سر و قد کھڑے ہو گئے۔ دیکھتے ہی کسی نے کہا ارے بھئی کیا ہوا۔ کہا یہ فلاں قبلہ کا خط ہے۔ تم جانتے ہو یہ کس کا خط ہے۔ حالانکہ یہ تو بے جان ہے مگر یہ تعظیم ان سب تعظیموں سے بڑھی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا جتنا رشتہ دور کا ہو اور پھر بھی جذبہ تعظیم باقی رہے وہ اس مرکز کی سب سے بڑی تعظیم ہوگی۔ اب میری عادت نہیں کہ کسی کی نسبت بدگمانی سے کام لوں۔ میں کہتا ہوں کوئی جماعت ہے جس میں جذبہ ہے اللہ کی تعظیم کا۔ مگر اقبال کی زبان میں کہوں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں

میں تڑپتے رہے اس انتظار میں کہ وہ ملے تو سجدے کریں۔ نہ وہ ملے گا نہ سجدے ہوں گے۔ ارے ایک طبقہ کو اُمید ہے کہ اس دارِ دنیا میں نہ سہی وہاں سہی۔ ایک طبقہ کو اُمید ہے کہ ملے گا۔ مجھے ہمدردی ہے کہ وہ اس دن کے منتظر ہیں کیونکہ مجھے انتظار کرنے والوں سے ہمدردی ہوا کرتی ہے اور اس سے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ قسمتِ مسلم میں انتظار لکھا ہوا ہے ہر ایک منتظر ہے یہ اور بات کہ کوئی منتظر ہے ناممکن بات کا اور کوئی ممکن بات کا منتظر ہے صلوٰۃ۔

تو جناب یہ بس انتظار میں ہیں کہ وہ ملے۔ اب ایک جماعت ہے بیچاری جسے وہ نہیں ملتا اور جذبات تعظیم ہیں۔ اب اس تک نہیں پہنچتے۔ اتفاق سے چودہ سو برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت رسول خدا کے سامنے حاضر ہو گئے آپ کے دست حق پرست کو بوسہ دیا۔ اب وہ جو پنجاب کا طریقہ ہے مثلاً پائے مبارک کو بوسہ دیا جو کچھ ممکن تھا فرض کیجئے طواف بھی کر لیا۔ اب آپ نے کہا شرک۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے پوچھئے کس کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہے اگر وہ کہے کہ خاندان بنی ہاشم کے تاجدار کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہوں تو دنیا دار ہے اگر کہے کہ حاکم عرب کو بوسہ دے رہا ہوں تو میں سمجھوں گا کہ دنیا پرست ہے لیکن اگر وہ کہے کہ اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ کو۔ تو سمجھ لیجئے کہ وہ عظمت خدا ہے جو اس عمل کو اس سے کرا رہی ہے۔ تو ایک درجہ اونچا ہے اس کی تعظیم کا۔ اور اب کوئی شخص ہے۔ جو بعد میں پیدا ہوا اور پیغمبر خدا اس کے سامنے نہیں ہیں۔ ایک آلِ رسولؐ ہے۔ اولادِ رسولؐ۔ اب اس نے جو جذبات محبت و عقیدت تھے ان کو صرف کیا ان کی خدمت میں۔ کیوں اس لئے کہ رسولِ خدا کے یہ نور سے ہیں یہ بیٹے ہیں۔ رسولِ خدا کی اولاد ہیں۔ تو دیکھئے وہ جذبہ محبت اور جذبہ عقیدت اور جذبہ تعظیم خدا کا ہے جو وہاں تک پہنچ رہا ہے اور اب بدنصیبی سے اس

دُور میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب ان کی ضریح مطہر سامنے ہے اور ضریح مطہر کو جا کر بوسہ دیتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ جاہل سے جاہل دیہات کا رہنے والا آج کا مسلمان اس سے پوچھئے کہ کس کی زیارت کو آئے ہو کیا وہ کہے گا کہ خاندان بنی ہاشم کے ایک بڑے آدمی کی زیارت کو آیا ہوں۔ کیا وہ کہے گا کہ تاجدار مدینہ۔ مجازاً آپ کہہ لیں کہ مدینہ کے بادشاہ کی زیارت کو آیا ہوں۔ کیا وہ کہے گا کہ قوم عرب کے سردار کی زیارت کو آیا ہوں۔ جاہل سے جاہل آدمی بھی کہے گا کہ رسول اللہ کی قبر کی زیارت کو آیا ہوں۔ دنیا کہتی ہے قبر پرستی ہے قبر پرستی ہے۔ ارے قبر پرستی ہوتی تو ہمارے ملک میں قبروں کی کوئی کمی تھی۔ یہ ہم اتنی مسافت طے کر کے وہاں کیوں جاتے۔ معلوم ہوا کبھی قبر کی پرستش نہیں ہے صاحب قبر کا رشتہ ہے جو لے آیا ہے۔ صلوٰۃ۔

اور اب فرض کیجیے کہ ہم دُور افتادہ ہیں ہماری رسائی کربلا تک نہیں ہے رکاوٹیں بھی ایسی ہو گئی ہیں کہ پہنچنا اب اس دور میں تو آسان نہیں رہا ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں آپ سب بھی دُعا کریں کہ سب رکاوٹیں پروردگار عالم دُور کرے تو یہ ہماری تمنا ہے کہ وہاں پہنچیں۔ اب وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ویسے بھی ہر دَور میں ہر ایک کے حالات تو نہیں ہوتے کہ وہاں ہر وقت پہنچ سکے لہٰذا اس نے شبیہ قبر تیار کی۔ شبیہ ضریح تیار کی۔ اب وہ اس کا احترام کر رہا ہے اس کا طواف کر رہا ہے اس کو بوسہ دے رہا ہے آپ کہتے ہیں اُوہ شرک ہو گیا۔ میں کہتا ہوں یہی اجزائے ضریح وہ کان پر بھی تو تھے ہم نے وہاں جا کر ان کی تعظیم کیوں نہ کی۔ جب ان میں ایک شکل پیدا ہوئی کہ کسی خاص ضریح کی شبیہ بن گئے تو معلوم ہوا کہ یہی جذبہ ہے۔ اب یہ جذبہ کی قوت پر انحصار ہے کہ کتنی دور تک اُبھر بن جاتی ہیں۔ جن کا جذبہ محبت قوی ہے۔ ان کے لئے حکم رسول رہنمائی کے لئے ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں۔ ان میں یہ حدیث ہے کہ ایک شخص پیغمبر خدا کی خدمت میں آیا اور اس نے یہ کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے نذر کی ہے کہ میں پیشانی حورعین اور جنت کی چوکھٹ پر بوسہ دے رہا ہوں چوکھٹ پر جنت کی اور پیشانی پر حورعین کی۔ اول تو ماشاء اللہ آپ ہر موقع پر نکتہ رس ثابت ہوتے ہیں میں کہتا ہوں پہلے ہی رسول کو یہ کہنا چاہیئے کہ یہ خواب تمہارا شیطان کا دکھایا ہوا ہے۔ بھلا بوسہ بھی کہیں ہوتا ہے یعنی گویا خواب میں بھی یا اس نے نذر کی شرک کی۔ تو پیغمبر کا کام ہی ہے توحید کی طرف بلانا تو آپ کو پہلے ہی اس کی زبان پکڑنی چاہیئے کہ ارے یہ کیا یہ شرک تم نے خواب میں دیکھا یا شرک کی تم نے نذر کی۔ تو جناب اس نے یہ کہا کہ پیشانی حورعین اور جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دے رہا ہوں۔ ارشاد فرمایا تمہیں یہ کرنا چاہیئے کہ باپ کی پیشانی اور ماں کے قدموں کو بوسہ دے لو۔ اس نے کہا کہ حضور والا میرے ماں باپ زندہ نہیں ہیں۔ وفات پا چکے آپ نے فرمایا ان کی قبریں ہیں دونوں کی قبروں کو جاکر بوسہ دے لو دیکھئے کیا رسول اللہ قبر پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں فرمایا اگر دونوں کی قبریں ہیں تو دونوں کی قبروں کا جاکر بوسہ لے لو اس نے کہا حضور قبروں کا پتہ نہیں ہے۔ میں کم سن تھا دونوں اس وقت دنیا سے اُٹھ گئے مجھے نہیں معلوم قبریں کہاں ہیں آپ نے فرمایا دو لکیریں کھینچو۔ ایک پر اس کا نام لکھو ایک پر اس کا نام لکھو اور ان کو بوسہ دے لو۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ہمارے مولانے نہیں لکھا یا کہ کسی زیارت کے مشتاق ہو تو شبیہ کو دیکھ کر زیارت کا شوق پورا کرلو کچھ حضرات کا ذہن منتقل ہوگیا ہوگا مگر میں کہتا ہوں کہ ہمارے امام کو اللہ نے ایک زندہ شبیہ رسول کی عطا کی تھی۔ وہ کون شہزادہ علی اکبرؑ اور اسی وجہ سے یہ علی اکبر کی خصوصیت ہے کربلا میں کسی کے جاتے وقت حسین نے اللہ کو گواہ نہیں بنایا مگر جب علی اکبر جا رہے ہیں تو ہاتھ اٹھا دیتے دربار الٰہی میں

اللّٰھم اشھد علی ھولاء القوم فقد برز الیھم غلام واشبہ الناس خَلقاً وخُلقاً ومنطقاً بنبیّکَ وکُنَّا اذا اشتقنا الی نبیک نظرنا الی وجھہ۔

خداوندا تو گواہ رہنا اس قوم کے ظلم پر کہ اب وہ جا رہا ہے۔ ماشاء اللہ آپ غور سے سن ہی رہے ہیں۔ امام کیا کیا کہہ سکتے تھے۔ کون جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ میری ضعیفی کا سہارا جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے بھرے گھر کی رونق جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ پھوپھی کا اٹھارہ برس کا ریاض جا رہا ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ ماں کے دل کی ڈھارس جا رہی ہے ارے یہ کہہ سکتے تھے کہ میرا کڑیل جوان جا رہا ہے مگر مولا نے یہ نہیں کہا۔ کہتے ہیں پروردگارا گواہ رہنا کہ وہ جا رہا ہے جو صورت وسیرت گفتار ورفتار میں تیرے رسول سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ پروردگار جب ہم تیرے نبی کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو بیٹے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے میں کہتا ہوں جب سے علی اکبر پیدا ہوئے۔ امام نے کتنی مرتبہ علی اکبر کو دیکھا ہو گا مگر آج امام نے اپنی پوری عمر کی سیرت کی تفسیر کر دی کہ اٹھارہ برس میں کم سے کم اور بہت سے علماء قائل ہیں پچیس برس کی عمر۔ اس پوری عمر میں جب بھی بیٹے کو دیکھا ہے تو بنظر عبادت خدا دیکھا ہے۔ ہمیشہ شبیہ رسول ہونے کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اسی وجہ سے ایک خصوصیت علی اکبر میں پیدا ہو گئی۔ میرا خیال یہ ہے اسی وجہ سے۔ اور وہ کیا ہے جسے رخصت کر دیا بس رخصت کر دیا مگر علی اکبر کو جب رخصت کیا تو مولا اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکے دور تک علی اکبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلے گئے اور پکار کر کہہ رہے تھے کہ اے بیٹا جب تک سامنا رہے مڑ مڑ کر ادھر دیکھتے رہنا۔ اب مناجات حسین کی روشنی میں میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ بیٹے کی محبت تھی یا شبیہ رسول کی تعظیم تھی۔ شبیہ رسول کی عزت تھی۔ آپ بھی جب تعزیہ، منبر، علم وغیرہ جاتے ہیں تو پیچھے پیچھے

چلتے ہیں تو مولا شبیہ رسول کی مشایعت کر رہے تھے۔ بس اہل عزا اب آخری جز مصائب کا عرض کر دوں کہ مجھے ایک ماں کے صبر کی داد دینا ہے۔ جس کے لئے مولا اپنی جگہ کھڑے نہ رہ سکے ہوں مگر ماں نے خیمے کے باہر قدم نہیں نکالا حالانکہ اس خاندان کی بیٹی نہیں ہے۔ بخدا اس رشتہ کی عزت کربلا کی بہوؤں نے رکھ لی۔ یہ صرف اس خاندان کی بہو ہیں مگر ان کا ضبط دیکھئے انہوں نے خیمے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ ہاں خیمے کے اندر بھی بیٹھا نہیں گیا۔ در خیمہ پر پس پردہ کھڑی ہوئی ہیں اُدھر نہیں دیکھتیں جدھر علی اکبر گئے ہیں کیونکہ اُدھر نامحرموں کی فوج ہے۔ مولا کے چہرے پر نظر کہ یہ امام سہی مگر باپ کا دل ہے اگر میرے بیٹے کے کوئی زخم آئے گا کوئی گزند پہنچے گا تو امام کا چہرہ ضرور متغیر ہوگا۔ ہاں اہل عزا وہ منزل آگئی ایک دفعہ امام کا چہرہ متغیر ہوا اور لیلیٰ نے تڑپ کر پوچھا کہ کیوں مولا میرے بچے کی تو خیر ہے امام نے فرمایا کہ ہاں علی اکبر زندہ ہے سلامت ہے مگر ایک نامی پہلوان مقابلے کو آگیا ہے وہ سیر و سیراب ہے۔ میرا بچہ تین دن سے بھوکا پیاسا ہے اس لئے مجھے اس کے مقابلے میں بھی علی اکبر کے لئے خطرہ ہے میں کہتا ہوں جسے مرنے کے لئے بھیجا ہے اس کے لئے خطرہ کیسا۔ مگر یاد رکھئے یہ آل محمد ہیں مظلوم ہونا پسند کرتے ہیں مغلوب ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک کو مل کر ہزار ماریں یہ اور بات ہے مگر علی کا پوتا کسی ایک کے مقابلے میں اس کی تلوار سے شہید ہو جائے یہ مولا کو گوارہ نہیں ہے فرماتے ہیں اے لیلیٰ یہاں کیوں کھڑی ہو میں نے نانا سے سُنا ہے کہ ماں کی دعا بیٹے کے حق میں قبول ہوتی ہے جاؤ خیمے میں اپنے بچے کی فتح کی دعا کرو حکم امام سے مجبور ہو کر چلی تو گئیں مگر یہ سوچتی ہوئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا در خیمہ پر بھی کھڑا ہونا امام کو پسند نہیں آیا ارے دُعا کرنا تھی تو امام خود دُعا کر دیتے یہ مجھے کیوں ہٹایا یہ سوچتی ہوئی گئیں اس لئے احترام حکم امام میں دُعا تو کرلی کہا اے زینب و ام کلثوم اے

رباب اے سکینہ اے فاطمہ آؤ میں اپنے بچے کے لئے فتح کی دعا کروں گی۔ دعا کی خداوندا اس دشمن پر علی اکبر کو فتحیاب کر۔ ابھی سوکھی ہوئی زبان پر دعا نا تمام تھی کہ اپنے مقابل دشمن پر علی اکبر فتحیاب ہوئے مگر منشائے امام سمجھ گیئں تھیں۔ بس انہی جملوں پر ختم کروں گا۔ سمجھ گیئں تھیں مولا کا منشا۔۔ اس لئے دعا کر کے پھر درِ خیمہ پر نہیں آئیں۔ علی اکبر کی لاش آ گئی مگر لیلیٰ نے قدم باہر نہیں رکھا۔

مجلس سوم

شعائر اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۔

جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا جز ہے۔ دو دن اس سلسلہ بیان کے گزر گئے اور شعائر کے معنی میں نے بیان نہیں کیے۔ میں نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ چاہے شعائر کے معنی ہمیں معلوم نہ ہوں تب بھی ان الفاظ سے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو یہ پتہ چل گیا کہ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ عبادت اور چیز ہے اور تعظیم اور چیز ہے۔ دو دن یہی بیان رہا۔ اب آیئے شعائر کے معنی دیکھیں۔ اب شعائر کی تشریح میں یہ کہنا لازمی ہے کہ شعائر جمع ہے شعیرہ کی۔ لیجیے اب اردو داں طبقے کے لئے اور مشکل ہو گئی۔ مجلسوں میں شعائر کی لفظ تو سُنی ہو گی کہ کچھ نہ کچھ ذہن میں اس کا مفہوم آجاتا تھا۔ مگر یہ واحد جو اس کا معلوم ہوا شعیرہ۔ تو یہ ذہن کے لئے بالکل اجنبی چیز ہے مگر میں عرض کروں کہ ابھی پتہ چلے گا کہ یہ ذہن سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ شعیرہ کے معنی لغت میں علامت کے ہیں جیسے نقش قدم کسی جانے والے کی علامت ہے۔ جیسے دھواں آگ کی علامت ہے۔ تو ایسے ہی شعیرہ کے معنی علامت کے ہیں۔ اب علامت کو علامت کیوں کہتے ہیں۔ علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعۂ علم ہوتی ہے۔ اب علم کے معنی

سب کو معلوم ہیں جاننا۔ تو چونکہ علامت ذریعہ علم ہوتی ہے اس لئے اُسے علامت
کہتے ہیں۔ تو جس طرح علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ علم ہے۔
اسی طرح علامت کے معنی ہیں شعیرہ لغت میں آیا ہے کیونکہ یہ ذریعہ شعور ہے
کیونکہ شعور کے معنی علم کے ہیں۔ علامت کی جمع ہے علائم۔ شعیرہ کی جمع ہے
شعائر۔ اب علامت کون ہوتی ہے۔ جو جانی پہچانی لفظ ہے اُسے دیکھیں شعیرہ
ہوتی ہے علامت ۔شعائر یعنی علائم اب علامت کون ہوتی ہے علامت وہ
ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے ذہن کسی اور کی طرف جائے۔ اب نئے دَور کی
مثال دیدول۔ تھرمامیٹر میں پارے کو دیکھا کس نقطے پر ہے۔ کہا کہ اسے اتنا
بخار ہے تو اس کا بخار اس تھرمامیٹر میں تھوڑی آیا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے
پارے کا وہاں پر پہنچنا یہ علامت ہے اس بخار کی۔ پرانے زمانے کے حکیم نبض
دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اتنا بخار ہے تو نبض میں بھی اس کا بخار تھوڑی آتا تھا
جیسے پارے کے چڑھنے میں ذہن منتقل ہوا بخار کی طرف۔ اسی طرح نبض کی
تیزی نے بخار کا پتہ دیا۔ وہ اسے سمجھتے تھے نبض سے یہ اس کو دیکھتے ہیں تھرمامیٹر
میں پارے کی رفتار سے۔ اب رفتار کی یہاں ایک اور بات یاد آئی ہے۔ دنیا والے
کہتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو بغیر دیکھے نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کسی چیز کو آپ دیکھ کر مانتے
ہیں۔ بخار کو آپ دیکھتے ہیں جو مانتے ہیں۔ دیکھتے تو پارے کو ہیں اور رائے قائم
کرتے ہیں بخار کی۔ اسی طرح دنیا میں آجکل جتنے ذرائع ہیں کسی چیز کو سمجھنے کے۔
تو علامت کو دیکھتے ہیں۔ اب میں تو اس چیز کی حقیقت سے واقف نہیں ہوں:
مگر اخباروں سے کچھ ذہن میں آیا کہ وہ ہوائی جہاز جو بھیجے گئے ہیں جن پر
بہت سی دنیا احتجاج کر رہی ہے تو دشمن کا ہوائی جہاز دکھائی تھوڑی دیتا ہے نہیں
اس کے اٹھنے کی کچھ علامت ہے جو اسمیں نمودار ہوتی ہے۔ اس علامت کو دیکھکر

جو چیز نہیں دیکھی۔ اس کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں کہ دشمن کا جہاز اڑ گیا۔ تو دیکھتے نہیں ہیں بلے دیکھے علامات کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں تو میں کہا کرتا ہوں کہ خدا کو بے دیکھے مانئے۔ آفتاب کو دیکھئے اُسے مانئے چاند کو دیکھئے اُسے مانئے کائنات کو دیکھئے اُسے مانئے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ اثر کو دیکھئے موثر کو مانئے اور اس کے بعد اب ایک اور منزل ہے میں یہیں سے اسکو عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں ہے کہ ماکان اللہ لیعذبھم وانت فیھم۔

رسول سے کہا گیا قرآن کی آیت ہے کہ اللہ ان پر عذاب عام نہیں کرے گا یعنی جیسے دنیا کی قومیں تہس نہس ہوئیں برباد ہوئیں اس طرح یہ قوم برباد نہیں ہو گی دراں حالیکہ آپ اس میں ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ آپ کے وجود کا اثر ہے کہ یہ قوم قائم ہے اب اگر دکھائی دیتا ہو کہ آج بھی قائم ہے تو سمجھ لیجئے کہ رسول کا کوئی جز برقرار ہے۔ تو حضور والا علامت جس کو دیکھ کر کسی طرف ذہن جائے تو وہ اس شے کی علامت۔ تو اب اللہ کے شعائر کون ہوں گے۔ جن کو دیکھ کر ذہن اس کی طرف جائے۔ وہ اس کی علامت ہوں گے تو جن جن چیزوں کی نسبت اس کی طرف قائم ہے۔ اس نسبت کی وجہ سے۔ ان کو دیکھنے سے ذہن اس کی طرف جاتا ہے۔ مثلاً اپنے گھر کو دیکھیں گے تو خدا یاد نہیں آئے گا۔ لیکن اگر خانہ کعبہ جائیں گے۔ کہا یہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا خانہ خدا۔ اللہ کا گھر۔ قرآن نے کہا بیت اللہ۔ تو اللہ کا گھر۔ جب کہا خانہ خدا۔ بیت اللہ تو ذہن کس کی طرف گیا۔ خدا کی طرف۔ لہٰذا کعبہ ہوا شعائر اللہ میں۔ یہ ان علامتوں میں سے ہوا جو ذہن کو اللہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ اب اسی بیت اللہ کا ترجمہ ہے خانہ خدا۔ اور میں تو اس دنیا کا آدمی نہیں ہوں مگر اخباروں میں بہت شور تھا کہ ایک فلم آئی ہے خانہ کعبہ۔ ہندستان میں آئی تھی۔ یہاں بھی آئی ہو گی وہ خانہ خدا فلم تھی۔ اس میں جناب حج کے مناظر

دکھائے گئے تھے۔ بیت اللہ کا ترجمہ خانۂ خدا کیا اور فلم کا نام رکھ دیا۔ تو اب کسی فلم کے دیکھنے پر کبھی علماء کا جلسہ نہیں ہوا۔ مگر وہ فلم جو آئی تو بڑی بڑی کانفرنسیں علماءؑ کی ہمارے ہاں ہوئیں اب مجھے ذرا تعجب ہوا کہ صاحب کبھی کسی فلم پر تو احتجاج نہیں ہوا۔ شرعاً تو علماءؑ کسی فلم سے راضی نہیں تھے۔ تو اس سے پہلے کبھی کسی فلم پر اعتراض نہیں ہوا۔ یہ آخر اس کے خلاف کیوں احتجاج ہو رہا ہے تو میں نے دریافت کیا لوگوں سے کہ صاحب اس فلم میں کیا بات ہے تو معلوم ہوا کہ اسمیں آلِ رسول کا ذکر ذرا زیادہ ہے اور ہماری نماز ہماری جماعت اور ہمارے بہت سے طریقے اس میں نظر آتے ہیں تو اب پتہ چلا کہ یہ احتجاج ہو رہا ہے کہ جنہیں ہم دنیا کے ذہنوں سے بھلا دینا چاہتے تھے یہ فلم انہیں یاد دلاتی ہے۔ یہ احتجاج اس پر ہو رہا ہے۔ اب میں نے لوگوں سے اس فلم کے اور خصوصیات دریافت کئے تو لوگوں نے کہا کہ نہیں اس میں تو گانا بجانا بھی بہت کم ہے وہ مہملات جو فلموں میں ہوا کرتے ہیں وہ تو اس میں تقریباً بالکل نہیں ہیں۔ اور بس یہی ہیں۔ تو میں سمجھ گیا کہ بس اسی سے ناراضگی ہے۔ اب جناب چونکہ بہت چل گئی بات۔ ہمارے پاس بھی سوالات آنے لگے استفتا کے۔ کہ صاحب فلم خانۂ خدا کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں۔ اب ان سوال کرنے والوں پر بھی ہنسی آئی کہ کسی اور فلم کے دیکھنے کو کبھی نہیں پوچھا۔ ہمیشہ شوقیہ جاتے اور دیکھتے۔ مگر اس فلم کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں۔ تو میں آزادی سے یہ لکھ دیتا کہ فلم جائز ہے۔ جا کے دیکھئے تو وہ کہتے کہ انہوں نے فلم دیکھنے کی اجازت دیدی۔ تو اس سے فائدہ۔ پھر اور بھی اٹھاتے کہ صاحب فلم دیکھنا جائز ہے ان کا فتویٰ موجود ہے۔ غلط فائدے بھی تو اٹھائے جاتے ہیں۔ غلط استعمال ہوتا ہے فتوے کا۔ تو میں نے یہ لکھا جواب میں کہ جو شخص فلم دیکھنے کا عادی نہیں ہے اس کے لئے بہتر

ہے کہ اسے بھی نہ دیکھئے اور جو فلم دیکھنے کا عادی ہے اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس کو بھی دیکھے۔ صلوٰۃ۔

تو اب خانہ خدا جب کہا تو خدا کا تصور لازماً ہوا یا نہیں ہوا اور بیت اللہ تو وہی ہے بنصِ قرآن۔ مگر ہم اپنے ہاں کی مسجد کو بھی خانہ خدا کہتے ہیں۔ خانہ خدا کا جو محاورہ ہے وہ مکے والے کعبے کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ہاں کی مسجد کو بھی خانہ خدا کہتے ہیں تو اب میں ایک طبقے سے پوچھوں گا کہ وہ ہے بیت اللہ اور یہ بھی ہے خانہ خدا تو اس میں کون بات درست ہے وہ بیت اللہ ہے یہ خانہ خدا ہے اور اسی بیت اللہ کا ترجمہ خانہ خدا ہے۔ اسی خانہ خدا کی عربی بنا دیجئے تو بیت اللہ ہے تو اب میں لفظ بدل کر کہتا ہوں کہ یہ مسجد بیت اللہ ہے یا نہیں تو وہ کہیں گے کہ عربی کے لحاظ سے تو بیت اللہ ہے۔ اگر ذرا سی بھی عربی جانتے ہوتے تو کہیں گے کہ ہاں خانہ خدا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بیت اللہ۔ تو میں کہوں گا کہ پھر اتنی دُور جانے کی کیا ضرورت ہے اسی کا حج کر لیا کیجئے تو وہ کہیں گے کہ نہیں صاحب حج تو وہیں ہوگا حج یہاں نہیں ہوگا میں کہوں گا پھر نہیں ہے بیت اللہ کھل کر کہہ دیجئے کہ جیسے ہمارا گھر ویسے وہ بھی ہم نے بنوایا یہ بھی ہم نے بنوایا۔ تو یہ بیت اللہ نہیں ہے۔ آپ نے کہہ دیا کہ نہیں ہے۔ تو جب نہیں ہے تو نجاست اس کے اندر لے جائیے۔ ارے وہ کسی ایک میں اختلاف ہے کہ نجس ہے کہ نہیں۔ اُسے لے گئے ہوں کبھی مجھے معلوم ہے لیکن یہ کہ جسے سب نجس سمجھتے ہیں اُسے تو کوئی نہیں لے جائے گا ورنہ یہ ہمارے ہاں ہندوستان میں ابھی ابھی فساد ہوا تھا وہ کا ہے پر ہوا تھا ارے ایک جانور جسے سب نجس سمجھتے ہیں وہ آگیا تھا مسجد میں تو ایک جانور کے چلے آنے سے کتنے آدمیوں کی جان چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ جو نجاست ہے وہ مسجد میں نہیں آسکتی۔

تو یہ کیوں۔ اگر یہ نہیں ہے بیت اللہ۔ عام گھر ہے۔ تو پھر یہ کیوں۔ آپ کے گھر میں
آجاتا تو خونریزی نہ ہوتی اور مسجد کے اندر آگیا تو خون بہہ گئے۔ یہ آخر کیا ہے
تو اب اگر ذرا بھی سمجھ ہے تو میری بات کا صرف ایک جواب ہو سکتا ہے کہ اصل
بیت اللہ تو وہی ہے۔ خانہ کعبہ۔ مگر یہ بھی گویا اس کی نقلیں ہیں اس کی شبیہیں
ہیں جو ہر جگہ ہیں وہ اصل جو ہے وہ ابراہیم و اسمٰعیل انبیاءؑ نے بنایا تھا۔ اسے
ہم خود بنا لیتے ہیں مگر چونکہ بحیثیتِ خانہ خدا بناتے ہیں تو احترام اس کا بھی ہے
کیونکہ وہ اصل ہے لہٰذا یہ نقل۔ اس لئے پورے احکام تو اس کے اس پر جاری نہیں
ہیں۔ حج تو اس کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن طہارت کی ضرورت یہاں بھی ہے۔ نجاست
کا لانا بھی ناجائز ہے بس میں کہوں گا کہ اسے یاد رکھئے کہ کچھ اصل ہوتی ہے کچھ نقلیں
ہوتی ہیں۔ اصل احکام جو ہیں وہ اصل ہی پر جاری ہوتے ہیں، مگر وہ نقل بھی
قابلِ احترام ہوتی ہے۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ کربلا سرزمین عراق ہی پہ ہے اس لئے
زیارت کا ثواب ہمیں وہاں جا کے ملے گا۔ لیکن کوئی بھی عمارت بنام کربلا بن گئی ہے تو
احترام اس کا بھی ہے اور وہ جو شبیہیں ہم بناتے ہیں اس میں اب یہ نہ کہیئے گا کہ اسے
خود ہی تو بنائی ہیں۔ کاغذ ہیں اور کھپچیاں ہیں اور یہ ہے اور وہ ہے اس کا نام رکھ
لیا تعزیہ اور اس کا نام ضریح رکھ لیا۔ تو خود ہی تو ابھی بنایا ہے۔ اور خود ہی لگے
مرکز تعظیم سمجھنے لگے کہ اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ خلافِ احترام کوئی بات نہیں
ہونی چاہیئے۔ اب ہمارے جلنے کہ اس کو پوجنا کہنے لگے۔ ورنہ کون جاہل ہے
جو کہے کہ میں تعزیے کو پوجتا ہوں جو کہے گا وہ کہے گا احترام کرتا ہوں تعظیم و تکریم
کرتا ہوں عبادت کوئی نہیں کہے گا کہ میں عبادت کرتا ہوں۔ عبادت کرے تو
کافر۔ وہ چاہے اپنے بنائے ہوئے نہیں خدا کے بنائے ہوئے کسی آدمی کی عبادت
کرے تو کافر۔ عبادت تو خالق سے خاص ہے۔ مخلوق جو بھی ہو چاہے اسی کا مخلوق

ہو عبادت اس کی بھی نہیں ہے تو اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کی عبادت کیا ہو گی۔ عبادت کسی کے لیے نہیں ہے مگر یہ کہنے سے احترام ختم نہیں ہو گا کہ ہمیں نے تو بنایا ہے۔ قرآن بھی تو ہمیں لکھتے ہیں۔ مسجد بھی تو ہمیں بناتے ہیں۔ ہمارے بنانے سے اس کا احترام ختم نہیں ہو گا۔ یہ دیکھئے کہ ہم نے کس نیت سے بنایا ہے ایک لفظ بھی اگر ہم نے اپنی تقریر کی روانی میں کہی جو قرآن میں بھی ہے اتفاق سے۔ تو وہ لکھی جائے تو وہ قرآن نہیں ہو گا اس کا چھونا بلا وضو جائز ہو گا لیکن وہی لفظ اگر بقصد قرآن لکھ دی گئی تو پھر بغیر وضو چھونا حرام۔ تو معلوم ہوا کہ حقیقت ایک ہے مگر قصد کے بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔ تو اسی طرح سے یہ بھی بات ہے کہ گھر بھی میں بناتا ہوں مگر اس نیت سے کہ میرا گھر ہے۔ مسجد بھی میں ہی بناتا ہوں مگر اس نیت سے کہ یہ خانہ خدا ہے اب اس کا احترام ہے فقہ اسلام کی رو سے واجب۔ اس لئے نہیں واجب کہ میں نے بنایا ہے۔ اس لئے واجب کہ خانہ خدا ہے۔ چونکہ میں نے بقصد خانہ خدا بنایا ہے تو اسی طرح سے یہ کہنا بے معنی ہے کہ تعزیہ تم ہی تو بناتے ہو ضریح تم ہی تو بناتے ہو تابوت تم ہی تو بناتے ہو۔ خود ہی بناتے ہو اور خود ہی تعظیم کرتے ہو۔ تو ہاں۔ چونکہ بنایا ہے بقصد شبیہ روضہ مقدس۔ بنایا ہے بقصد شبیہ علم اسلام۔ اس لئے اس کا احترام۔ تو ہمارے بنانے سے یہ نہیں ہو گا کہ اس کا احترام ختم ہو جائے۔ تو اب کعبہ بیت اللہ۔ اس کی تعظیم اس کا احترام بلکہ اس کی طرف رُخ کر کے نماز بنص قرآن۔ اور یہ اجماع اہل اسلام جزو شریعت۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہ ایک دن کسی مجلس میں کہہ چکا ہوں کہ کیا اللہ اس گھر میں رہتا ہے۔ سکونت تو کوئی نہیں کرتا۔ کوئی قائل نہیں کہ اللہ اس میں سکونت رکھتا ہے۔ تو پھر کیا نسبت ہے۔ جیسے مہینے سب اس کے ہیں مگر ایک مہینے کو کہہ دیا۔ شہر اللہ۔ اللہ کا مہینہ۔ وہ ہے ماہ رمضان

اسی طرح گھر بھی اس کا ہے۔ جب ہم اس کے ہیں تو کیا ہمارا گھر اس کا نہیں ہے۔ اور پھر ہم گھر کہاں بنائیں گے۔ اجزا گھر کے سب اس کے ہیں۔ زمین اس کی ہے چاہے ملک ظاہر میں اس کے قانون کے مطابق کسی کا کہلائے مگر اصل میں تو سب اسی کا ہے۔ پوری زمین اللہ کی ہے تو جناب ہر چیز اسی کی ہے۔ میرا گھر بھی اس کا ہے مگر یہ کہ مجھے اس نے نسبت دے دی کہ یہ میرا گھر ہے۔

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔

ابراہیم و اسمٰعیل سے کہا کہ میرے گھر کو پاک۔ بس وہ موضوع عرض نہیں کرنا ہے۔ کبھی انشاء اللہ وعدہ ہے۔ اس سفر میں نہیں کرنا ہے۔ مگر ایک جز اس کا۔ تو میں نے آیت پڑھ دی تو ترجمہ اس کا کرتا ہے۔ تو اب علمائے اسلام سے پوچھوں گا کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ۔

ابراہیم و اسمٰعیل سے کہا جا رہا ہے کہ میرے گھر کو طَهِّرَا بَيْتِيَ مصدر اسکا تطہیر۔ اب ان سب سے پوچھوں گا کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ کے معنی کیا ہیں۔ یہ کہیں گے میرے گھر کو پاک کرو تو کیا نجاست تھی اس میں۔ ارے جس گھر کا معمار خلیل ہو اور بحیثیت مزدور ذبیح نے کام کیا ہو۔ بت بھی کبھی اور لا کر رکھے گئے۔ ابھی تو بتوں کا پتہ نہیں تو وہاں نجاست کہاں سے آئی تو ماننا پڑے گا طَهِّرَا بَيْتِيَ اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا کہ میرے گھر کو پاک رکھو۔ پاک کرو نہیں پاک رکھو۔ میں کہوں گا کہ بس جو معنی بیت میں آیۂ تطہیر کے لیجیے وہی معنی اہل البیت میں آیۂ تطہیر کے لیجیے۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ تم نے معنی لکھے کہ میرے گھر کو پاک رکھو تو پھر یطہرکم تطہیرا۔ وہاں بھی معنی یہ رکھئے کہ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم کو اہل البیت پاک رکھے یہ کیوں کہتے ہو کہ پاک کرے۔ یہ کہو کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ تم کو اہل بیت پاک رکھے وہ۔ آیۂ تطہیر ہے بیت کے لئے یہ آیۂ تطہیر ہے اہل بیت کے لئے۔ بس ایک فرق مجھے محسوس ہوتا

ہے کہ بیت کی تطہیر انبیا کے ذمہ کردی اور اہل بیت کی تطہیر اپنے ذمہ رکھی بس اسی وجہ سے نتیجہ مختلف ہوگیا۔ اس کی تطہیر انبیاء کے ذمّہ کردی تھی اور انبیاء اسکی تطہیر کے ذمّہ دار ہوئے اور دنیا اسمیں نجاست کے لانے پر قادر ہوئی لیکن جنکی تطہیر اپنے ذمّہ رکھی تھی سلطنتوں کی طاقت ختم ہوگئی مگران کے دامن پر کسی قسم کا داغ نہ لگایا جاسکا۔ صلوٰۃ۔

تو یہ میرا گھر، جس کی بنا پر آپ کہتے ہیں بیت اللہ۔ یہ فقط نسبت ہی تو ہے۔ وہ جاکر وہاں رہتا نہیں۔ بود و باش نہیں رکھتا اور دنیا کے ہر حصے سے دنیا کھنچ کر جاتی ہے اور یہ خدا کا وعدہ ہے کہ جو پورا ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے جس طرح قرآن زندہ معجزہ ہے۔ ویسے ہی خانہ کعبہ کی مرجعیت بھی مرکزیت بھی۔ یہ زندہ معجزہ ہے۔ ابراہیم و اسمٰعیل سے کہہ دیا گیا تھا جناب ابراہیم سے مخاطب ہو کر وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو۔ اذن کے معنی ہیں اعلان کرنا۔ اسی سے اذان ہے۔ اذان بھی ایک اعلان ہے اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ لوگوں میں حج کا اعلان کرو۔ اور لوگوں میں کہاں مکّے کی سرزمین پر۔ جو بے آب و گیاہ میدان۔ تو وہاں لوگ کہاں رہتے۔ اعلان کرو لوگوں کے لئے۔ مجازی جملہ ہوگا کنایہ مگر مجھے تو اس وقت حقیقت نظر آرہی ہے صدا بصحرا پر محمول کر رہا ہے مگر خود وعدہ کرتا ہے کہ تم صدا بلند کرو پہنچانے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس صدا کو پہنچاؤں گا اور اپنی توحید کے لئے ذمّہ داری نہیں لی ہے کہ ہر ایک مان بھی لے گا یا کسی دَور میں ہر ایک مان لے گا یا اکثریت مان لے گی مگر یہ جو حکم دے دیا تھا اس کی ذمہ داری لے لی۔ میں سوچ رہا ہوں وہ صدا بصحرا۔ حضرت ابراہیم کو تصور نہ ہوتا کہ کیا فائدہ یہاں اذانِ حج دینے سے۔ اعلانِ حج کرنے سے۔ تو ضمانت دے

رہا ہے یاتوک میں کہتا ہوں کہ آئیں گے اس آواز پر اور رجال کے ملنے وعدہ نہیں ہے مستقبل کے لئے یاتوک آئیں گے تمہاری آواز پر رجالاً پیادہ پا بھی آئیں گے۔ وعلی کل ضامر۔ اور ہر دبلے پتلے جانور پر آئیں گے۔ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ صاحبانِ فہم ہیں صاحبانِ علم ہیں تو وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دبلے پتلے سے کوئی محبت ہے۔ عرب میں دُبلا پتلا ہونا گھوڑے کی تیز رفتاری کی علامت تھا جب گھڑ دوڑ ہوتی تھی تو بھوکا رکھا جاتا تھا گھوڑوں کو اور جہاں مشق کرائی جاتی تھی اس میدان کا نام تھا مضمار یعنی دُبلا کرنے کی جگہ تو یہ دُبلا ہونا تیز رفتاری کا کنایہ ہے اب میں کہتا ہوں یہ اجمال قرآنی کہ ہر تیز رفتار سواری پر۔ اب جتنا ارتقائے زمانی کے ساتھ تیز رفتاری کے منازل طے ہوتے جائیں گے وہ سب قرآن کی آواز کی تصدیق ہے۔ ہر تیز رفتار سواری پر۔ اب موٹر پر سوار ہوئے تو وہ وعدہ قرآنی کی تکمیل کا ایک درجہ۔ ریل پر سوار ہوگئے تو وہ اس کے وعدہ کا ایک درجہ۔ اب دنیا سوچتی رہے یہ سواریاں نئی ہیں تو بدعت۔ میں کہوں گا کہ اعلان قرآنی کی تصدیق ہے تو عبادت۔ شکل نہ دیکھئے کہ نئی ہے یہ دیکھئے کہ کام وہ ہے۔ نہیں تو کہاں تھا کہ ہر تیز رفتار مرکب پر آئیں گے۔ اب یہ تیز رفتاری میں جتنی زیادتی ہو اتنا ہی سمجھئے کہ اعلان قرآنی کی تصدیق ہے اور ہمارے ہاں تو مجاز تھا۔ اس وقت تو یہ حقیقت ہے کہ دُنیا اُڑ اُڑ کر جا رہی ہے۔ پرواز کر کے جا رہی ہے تو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ سب آئیں گے۔ بحمداللہ حجاج کی تعداد جو اخبار میں آتی ہے وہ لاکھوں پر مشتمل ہوتی ہے تو یہ سب جو جاتے ہیں تو میں کہتا ہوں کیوں جا رہے ہیں کس لیئے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر کسی کی زیارت ہوگی وہاں جا کر کسی کی قدم بوسی ہوگی وہاں جا کر کسی کے دست حق پرست پر بوسہ دیں گے۔ ایک مکان بنے گیں۔

ایسا گھر جس میں رہنے والا کوئی نہیں۔ یہ تمام دنیا جاتی ہے اس مکان کے لئے۔ تو کیا ہوتا ہے صرف ایک شب کا اعزاز صرف ایک شب کا احترام ہمارا ہمدرد بن کر بھی ہمیں بہت سمجھایا جاتا ہے کہتے ہیں دیکھو یہ جو سب کچھ تم کرتے ہو تو بہت دولت تمہاری جیبوں سے خرچ ہو جاتی ہے۔ بیکار۔ یہ اتنی دولت تم تعمیری کاموں میں لگا دو۔ ادارے قائم کرو۔ اور جو کام کی باتیں ہیں وہ کرو۔ یہ بیکار اتنی دولت تمہاری جیب سے چلی جاتی ہے۔ میں اس دنیا سے کہتا ہوں کہ یہ جتنی دولت ہمارے ہاں ہر جگہ صرف ہوتی ہے کیا وہ اس کے برابر ہے جتنی تمام مسلمانوں کی جیبوں سے دولت صرف ہو جاتی ہے۔ ہر سال حج کو جاتے ہیں اور وہاں جا کر کیا ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسبتوں کے اعزاز میں معاشی پہلوؤں پر نظر نہیں کرنی چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کچھ نہیں ملتا۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ ہم وفادار بندے ثابت ہوتے ہیں فرض کیجئے کہ جس جس چیز پر ہم پیسہ صرف کرتے ہیں آپ کا دل دکھتا ہے آپ ہمارے بڑے خیر خواہ ہیں۔ ہمیں خیر خواہی کا پتہ تاریخ سے معلوم ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم چاہے کتنے ہی سادہ لوح ہوں۔ کند ذہن ہوں۔ ہم افادیت اپنے ان شعائر کی نہ سمجھیں مگر آپ کی مخالفت سے ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہماری زندگی کے لئے کوئی ضروری چیز ہے۔ صلوٰۃ۔

تو جناب یہ تمام دولت جو صرف ہوتی ہے ایک ایسے گھر کو دیکھنے پر جہاں رہتا کوئی نہیں۔ اس کے بعد خیر یہیں تک غنیمت۔ لیکن یہ دسویں ذی الحج کو عوام منیٰ میں قربانی بھی کرتے ہیں۔ ارے صاحب حج کر لیا۔ اتنا روپیہ آپ نے صرف کر دیا اب یہ ایک بے چارے کی جان بھی لیں اور اپنا پیسہ بھی صرف کریں۔ آجکل تو حقوق حیوانات تک کے نئے ادارے قائم ہیں وہ بھی فریاد

کریں اور آپ بھی بل کر فریاد کیجیے کہ یہ ایک جانور کی جان بھی جاتی ہے اور بھاری جیب سے روپیہ بھی جاتا ہے تو یہ کتنا پیسہ اس کے خون کے ساتھ زمین پر بہہ جاتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ کسی فقہ اسلامی کی رو سے اگر حج کرنا ہے تو پھر یہ قربانی بھی کرنا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے یہ قربانی ہے کیا۔ وہاں تو میں نے کہا تھا کہ ایک نسبت کا احترام ہے وہ خدا کی طرف کی نص ہے مگر یہ قربانی آخر کیا ہے اور پھر وہ بھی منیٰ میں ہو اور پھر دس ذی الحج کو ہو تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کے خلیل کی جو قربانی تھی اس کی یاد ہے۔ اب یہ اللہ کی یاد نہیں۔ خاص براہ راست اس کے خلیل کی یاد ہے۔ چونکہ دس ذی الحج کو انہوں نے اپنے فرزند کو حکم الٰہی سے ذبح کرنا چاہا تھا تو اب قیامت تک کے مسلمانوں کو حکم ہو گیا۔ اور وہاں تو حج میں واجب ہے۔ لیکن جو حج کو نہیں گئے تو اپنے اپنے گھروں پر۔ وہ بھی سنت۔ اور پھر اس کے۔۔۔ مسلمان ایسے پابند کہ بہت سے واجبات چھوڑ دیں گے مگر اس قربانی کو ضرور کریں گے۔ تو صاحب اب دیکھیے کہ کتنی دولت جیب سے جا رہی ہے اس قربانی کے حکم کی بدولت۔ وہ حج کا جز۔ جو قربانی ہے وہ بھی اور یہ جو بقرعید پر اپنے اپنے گھر میں قربانی کرتے ہیں وہ بھی۔ اسمیں کتنی دولت چلی جاتی ہے۔ اور یہ قربانی ہے کیا۔ چونکہ خلیل اللہ نے قربانی کی تھی تو اب نہ خلیل اللہ ہیں نہ وہ قربانی اس وقت ہے یہ یادگار رہی تو ہے۔ یہ خلیل اللہ کی یادگار میں اتنی قربانیاں اسی تاریخ میں ہو جاتی ہیں۔ اور اب میں آپ سے پوچھوں گا ذرا غور کیجیے ہر نقطہ نظر کے مسلمان کی متفقہ روایت کہ کیا واقعی وہ قربانی عمل میں آ گئی تھی۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ قربانی عمل میں نہیں آئی بعد میں فدیہ آ گیا تو بس ٹھنڈے دل سے غور کیجیے ہر مسلمان، جو رسول کو مانتا ہے وہ غور کرے کہ سابق دور کے رسول کی

فتویٰ شدہ قربانی تو یاد رکھنے کے قابل ہو اور اپنے رسول کے گھر کی دقوع میں آئی ہوئی قربانی وہ فراموش کرنے کے قابل ہو ارے میں کہتا ہوں کہ ایک ہی مہینے کا تو فرق ہے وہ قربانی دس ذی الحج کو یہ قربانی دس محرم کو۔ اس قربانی کی یادگار پر اتنا زور دیتا ہے۔

اور اس قربانی کے خلاف فتوے دیتا ہے آخر اس کی یادگار نے کیا قصور کیا اور اب یہ دیکھئے کہ قربانی حسین اور قربانی ابراہیم۔ ادھر سے قربانی ابراہیم پہلے اور قربانی حسین بعد کو۔ یوں کہہ دیجئے سان میں اتنا بڑا فرق ہے وہاں ابراہیم کا کردار اور ہے اسمٰعیل کا کردار اور ہے۔ ابراہیم کا کردار ہے قربانی کرنا اور اسمٰعیل کا کردار ہے قربان ہونا۔ اور کربلا میں حسین بیک وقت واحد خلیل بھی ہیں اور ذبیح بھی۔ یہ ذبیح ہیں رسول اللہ کی نسبت سے اور خلیل ہیں علی اکبر و علی اصغر اور سب قربانیوں کے لحاظ سے جو انہوں نے پیش کیں۔ تو یہ اہمیت ہے اس قربانی کی۔ اور اب یہاں سے ایک سوال کا میں جواب دوں۔ دنیا کہتی ہے کہ ہاں صاحب یادگار قائم کی جائے مگر غم کیوں کیا جائے۔ ارے اونچے درجہ پر فائز ہوئے شہادت کے تو اس پر خوش ہونا چاہیئے یہ غم کیوں کیا جائے۔ میں کہتا ہوں اصول بدلتا نہیں ہے نتیجہ دیکھئے قربانی اسمٰعیل اور قربانی حسین میں فرق ہے۔ پہلے جو منطقی صورت ہے وہ عرض کروں پھر تشریح کروں گا ماشاء اللہ ارباب فہم تو اسی سے سمجھ جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر روز عید قرباں غم کیا جاتا، مسلمانوں میں تو پھر ہم عاشور کے دن خوشی کرتے مگر روز قربانی اسمٰعیل عید ہے۔ نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں عیدیں ملی جاتی ہیں تو میں کہتا ہوں یہ عید کاہے کی ہے۔ اب مصائب کے انداز میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عید کاہے کی ہے۔ اس کی ہے کہ نبی زادہ بچ گیا تو عاشور کے دن غم کیجئے کہ رسول زادہ قتل ہو گا۔

اور رسول زادہ ہی تھوڑی۔ ارے پیغمبر کا پورا گھر لوٹ لیا گیا۔ پورا باغ قطع کر لیا گیا بس ہو سکتا تھا کہ میں یہیں مصائب عرض کروں۔ مگر ایک ضروری پہلو اور عرض کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ روز عید قرباں یاد رکھنا ہے تو مسلمان جمع ہوتے۔ تذکرۂ قربانی اسمٰعیل ہو جاتا۔ جن قرآنی آیات میں یہ ذکر ہے ان کی تلاوت ہو جاتی خطبہ عید الاضحیٰ میں وہ آیتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں ذکر قربانی ہے۔ یہ کافی تھا۔ لیکن آخر یہ اتنے جانور کیوں ذبح کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ لفظی تذکرہ کا ذہن پر اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا اثر عملی شبیہ کا پڑتا ہے تو جس شریعت نے یہ حکم دیا ہے اُسی اصول پر آپ قائم رہتے۔ پھر ہم سے نہ کہتے کہ تذکرہ حسین میں بس مجلسیں کافی ہیں۔ یہ سب مظاہرات کیوں ہوتے ہیں یہ سب شبیہیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ عید قرباں کے دن جس لیے جتنی قربانیاں کی جاتی ہیں وہ منیٰ میں جزو حج کی حیثیت سے۔

بس اسی لیے شبیہیں بنائی جاتی ہیں کہ لفظی بیان میں وہ طاقت نہیں ہے جتنی کہ شبیہ میں ہوتی ہے اب ماشاء اللہ اس سوال کا جواب تو ہو گیا۔ آپ حضرات مطمئن ہو گئے۔ اب آخر میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ یہ شبیہ کا ہے کی ہے۔ کس کی شبیہ ہے۔ یہ روا روی میں کہہ دیجیے گا جناب اسمٰعیل کی۔ میں کہوں گا ذرا غور کر کے بتائیے کہ یہ شبیہ جناب اسمٰعیل کی ہے۔ وہ تو ذبح نہیں ہوتے۔ وہ تو نہیں ہوئے ذبح۔ پھر یہ شبیہ کا ہے کی ہے۔ اگر غور کیجیے تو یہ جناب اسمٰعیل کی شبیہ نہیں ہے یہ اس گوسفند کی شبیہ ہے جو جناب اسمٰعیل کے بدلے میں آیا۔ وہی تو ذبح ہوا تھا تو بس ایک اصول یاد رکھیے کہ اگر جانور بھی نبی زادے کے کام آئے تو وہ یاد رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اب اگر ہم ذوالجناح نکالیں تو نہ کہیے گا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہم وفادار ہیں ہم اُس جانور کو بھی یاد رکھتے ہیں

جو آلِ رسول کے کام آیا۔ اب انسان اگر نہ کام آئے ہوں وقت پر تو ہم انسانوں کو بھول جائیں گے مگر اس جانور کو یاد رکھیں گے جو آلِ رسول کے کام آیا۔ ذوالجناح نے کس نازک وقت پر حسین کا ساتھ دیا۔ اربابِ عزا ذرا غور کیجئے جہاں سوار تین دن کے بھوکے پیاسے ہوں وہاں مرکبوں کو کیا غذا ملی ہوگی۔ مرکبوں کو کیا پانی ملا ہوگا جس طرح وہ تین دن کے بھوکے پیاسے اسی طرح مرکب بھی تین دن کے بھوکے پیاسے۔ اور جو مجاہد پہلے شہید ہوگیا اس کے مرکب نے اتنی ہی دیر تک کام کیا اور جو زیادہ وقت تک رہا۔ اسی لئے شہدائے کربلا میں میں کہتا ہوں کہ ہر ایک کی پیاس اس وقت تک رہی جب تک وہ درجۂ شہادت پر فائز نہیں ہوا تھا۔ تو اب کربلا کے مجاہدین میں سب سے زیادہ پیاسے ہمارے مولا حسین۔ بس یہاں میرا ذہن ایک اضافہ کرتا ہے کہ مولا کی بھی حدِ عطش عصرِ عاشور رہی جس وقت تک ہم آپ فاقہ کر لیتے ہیں مگر زینب کب تک پیاسی رہیں ام کلثوم کب تک پیاسی رہیں۔ علی اصغر کی حدِ عطش بتا سکتا ہوں۔ سکینہ کی حدِ عطش کب تک رہی یہ نہیں بتا سکتا۔ تو اب جب حسین انسانوں میں سب سے زیادہ پیاسے تو ماننا پڑے گا کہ فرسِ حسین اپنی نوع میں سب سے زیادہ تشنہ لب۔ پھر تشنہ لبی صرف خاموشی کے ساتھ ہو رہی تھی جس نے پکارا مولا اس کی لاش پر گئے۔ یہ آمد و رفت پوری اسی ذوالجناح کی پشت پر ہو رہی تھی۔ تو اس پیاس میں کتنی دفعہ مولا کو لے کر گیا اور کتنی دفعہ واپس آیا۔ اربابِ عزا میں کہتا ہوں کہ شاید ذوالجناح کو کسی خدمت میں اتنی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ مگر۔ اسے اسی کی پشت پر ایک بے شیر کو ہاتھوں پر جب بلند کیا اور اس کی لاش کو لے کر خیمے کی طرف آئے تو بے زبان بھی تڑپ گیا کہ ارے مجھے یہ بھی خدمت ادا کرنی تھی۔ ماشاء اللہ اجرکم علی اللہ۔ جب تک حسین مصروفِ جہاد تھے

فرس شریک جہاد تھا اور ماشاء اللہ مجمع میں سپہ گری کے فن سے بھی واقف ہوں گے اور فوج کے لوگ بھی ہوں گے ہر ایک جانتا ہے کہ میدانِ جنگ میں گھوڑا ساتھ والا ایک سپاہی ہوتا ہے وہ واروں کو رد بھی کرتا ہے وہ حملہ آور ہونے میں مدد بھی کرتا ہے۔ تو کربلا کے جہاد میں حسین کے ساتھ یہ گھوڑا شریک ہے۔ تو اب خلاف فطرت کیا بات نہ ہوگی اگر کوئی سوچے۔ کیا گھوڑے کو کوئی زخم نہیں آیا۔ ارے یہ راوی نے بیان نہیں کیا کہ گھوڑا کتنا زخمی ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود آخر دم تک مولا کا ساتھ دیا مگر کب تک۔ جب تک مولا پشت پر تھے۔ مگر جب پشت راکب دوش رسول سے خالی ہوگئی تو عرب میں فرس کی فراست مشہور ہے اسی لئے نام فرس ہوا ہے چہ جائیکہ وہ فرس جو کارنامہ کربلا کے لئے منتخب ہوا ہو۔ اب جب پشت پر حسین نہ رہے تو کیا خدمت ادا کرے۔ اب جو کام کیا وہ یہ کہ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ اگر عباس سامنے ہوتے تو ان کو جا کر اشارہ کرتا۔ اگر علی اکبر ہوتے تو ان کو جا کر اشارہ کرتا مگر وہ تو سب زمین گرم پر تھے اسی لئے پیشانی اپنی خونِ حسین سے رنگین کی اور اب سیدھا خیمے کی طرف گیا اور اب تفصیل سے عرض کرنا نہیں ہے مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی بی بی خیمے کے باہر ہوتی تو ذوالجناح کو خیمے پر جانے کی ضرورت نہ ہوتی مگر وہ تو سب وہیں بیٹھی تھیں جہاں حسین بٹھا کر گئے تھے اسی لئے خیمے کی طرف گیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر ایک صدا بلند کی۔ سنا کہتے ہیں آپ نتیجہ نہیں نکالتے۔ میں کہتا ہوں کہ دیکھئے آپ نے سنا ہو گا کہ اب بھی آواز سن کر درِ خیمہ پر سکینہ۔ اب سکینہ نے دیکھا باگیں کٹی ہوئیں۔ زین جدا ہوا۔ جا بجا تیر پیوست بس خیمے کے اندر گئیں بلبلنے لگیں ہائے بابا ہائے بابا۔

مجلس چہارم

شعائر اللہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔

دو دن بعنوانِ شعائر کی لفظ کے معنی سمجھاتے ہوئے اور بتاتے ہوئے اُصولاً عبادت اور تعظیم کا فرق۔ اس کا بیان ہوا۔ کل تیسرے دن شعائر کے لغوی مفہوم پر تبصرہ ہوا۔ اب آج یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید نے جو حکم دیا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کرو تو خود قرآن مجید سے بھی کچھ رہنمائی ہوتی ہے کہ آخر شعائر اللہ ہوتے کیا ہیں تو یہاں یہ پہلے سے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن مجید نے کہیں کوئی جامع فہرست شعائر اللہ کی بیان نہیں کی ہے اگر کوئی فہرست شعائر اللہ کی بیان کر دی جاتی تو پھر کوئی بھی کسی چیز کو شعائر اللہ میں سے کہتا یا بتاتا تو اُس سے اس مطالبے کا حق ہوتا ہر ایک کو۔ کہ قرآن نے تو اس فہرست میں اس چیز کو بیان نہیں کیا ہے۔ یہ تم اسے کیونکر شعائر اللہ میں قرار دے رہے ہو لیکن اگر قرآن مجید کے اندازِ بیان سے یہ ظاہر ہو کہ اسے شعائر اللہ کی کوئی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ذہن انسانی کی رہنمائی کے لئے بطور مثال کچھ شعائر اللہ کا تذکرہ کرنا ہے جس سے تمہیں مدد ملے یہ سمجھنے میں کہ کس قسم کی چیزیں شعائر اللہ ہوا کرتی ہیں تو اس کے لئے مجھے قرآن مجید میں دو آیتیں ملتی ہیں۔ دونوں

جگہ ایک ہی طرح کی لفظیں ہیں جن سے ہر ایک - اس کے لئے عربی دانی کی ضرورت نہیں - جب ترجمہ اس کا تحت لفظی کیا جائے تو اس سے ہر غیر عربی دان بھی اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح کہ میں نے عرض کیا - تو ایک آیت یہ ہے ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ - یقیناً صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں - یہ رٹن نہ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ یہ دونوں شعائر اللہ ہیں - مگر جیسے اُستاد شاگرد کو سمجھانے کے لئے دو ایک مثالیں دے دیتا ہے - تو ارشاد ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں اور یہ جن جمادات میں سے ایک چیز منتخب کی - جیسے حجر اسود کے بیان میں ایک دن کہہ چکا ہوں کہ یہ بت پرستی سے بہت مشابہ تھا - وہ بھی پتھروں کو پُوجتے تھے اور یہ بھی پتھر تھا - مگر شباہتوں سے حقیقت کا تعلق نہیں ہوتا - یہ پہاڑ کیا ہوتا ہے پتھروں کا مجموعہ تو انہی جمادات میں سے ایک چیز منتخب کی اور اُسے بیان فرمایا کہ صفا اور مروہ یہ دو پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہیں اب دونوں آیتیں ایک ساتھ پیش کئے دیتا ہوں مگر تبصرہ الگ الگ ہوگا - یہ جمادات میں سے ایک قسم نام دو لے دیئے اس کے بعد نباتات کی صنف کو چھوڑ دیا - نباتات کی نوع میں سے کوئی چیز مجھے نہیں ملتی ہے جسے کہا گیا ہو - اب حیوانات کو لیا - تو حیوانات کے لئے کہا - والبدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ جو لفظیں وہاں وہی لفظیں یہاں - دیکھو یہ قربانی کے جانور یہ شعائر اللہ میں سے ہیں تو یہاں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قربانی کے جانور شعائر اللہ ہیں بلکہ وہی لفظیں استعمال کی گئیں کہ قربانی کے جانور شعائر اللہ میں سے ہیں اب ہمارے لئے دعوت فکر ہوگئی کہ ہم غور کریں کہ آخر صفا و مروہ میں کیا بات ہے کہ یہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہوگئے اور یہ جانور ان میں کیا بات ہوگئی کہ یہ شعائر اللہ میں سے ہوگئے اور ان کی تعظیم کو کہا گیا کہ تقویٰ

کا جز ہے جیسے کہا گیا کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ تم میں سب سے زیادہ عزت اس کی ہے پیشِ خدا جو سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ دونوں کو ملایئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پیشِ خدا اس کی عزت زیادہ ہے کہ جو شعائر اللہ کی زیادہ تعظیم کرتا ہے۔ صلوٰۃ۔

اب جناب یہ صفا اور مروہ ان میں کیا خصوصیت ہے۔ سنتے رہے ابتدا سے کہ کوہ صفا اور کوہ مروہ۔ کوہ کے معنی پہاڑ۔ عربی میں جبل فارسی میں کوہ اردو میں پہاڑ۔ پہاڑوں سے ہمارے ذہن میں تصور عظمت جسمانی کا آیا۔ پہاڑ تو پہاڑ ہی ہے۔ تو ہم سمجھے۔ اوہ کوئی اتنے اونچے پہاڑ ہوں گے کہ ان کی جسامت کے لحاظ سے اللہ نے ان کو شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ لیکن مجمع میں ماشاء اللہ بہت افراد ہوں گے۔ جو فریضۂ حج سے سبکدوش ہوئے ہوں یا جو عمرے کو گئے ہوں اور پھر سب نے برابر سنا ہے کہ یہ پہاڑیاں ہیں۔ تو پہاڑ ہیں۔ ورنہ ہم نے جیسے جیسے پہاڑ دیکھے ہیں۔ اس کے لحاظ سے وہ کیا ہیں۔ ہمارے ہاں تو بعض ٹیلے اس سے زیادہ اونچے ہیں جتنے زیادہ اونچے وہ پہاڑ ہیں۔ لہٰذا اگر عظمتِ جسمانی معیار ہوتا شعائر اللہ میں سے ہونے کا تو میں تو ہندوستانی ہوں ہمالیہ زیادہ حقدار تھا جس کی بلندی کی حد معلوم کرنے کے لئے یا اس کی بلند چوٹی پر پہنچنے کے لئے آجکل دنیائے متمدن مشغول ہے اور اس کو معیار ارتقائے انسانی سمجھتی ہے تو جناب اب وہ پہاڑیاں کیا ہیں۔ جب گیا ہوں حج کے لئے تو اسی سال ڈائنا منٹ سے وہ پہاڑیاں اڑائی گئی تھیں کیونکہ میں پہلے بھی ہوائی جہاز سے گیا تو اتفاق سے سب سے پہلا جہاز جو جا رہا تھا اسی سے میں گیا تو ڈیڑھ مہینے پہلے پہنچ گیا تو جب میں گیا ہوں تو اڑائی جا رہی تھیں۔ ایک طرف سے ایک حصہ باقی تھا تو شاید میں یا میرے ساتھ کے چند آدمی آخری فرد ہوں

جو پہاڑی کی شکل میں اس پر چڑھے ہوں اور ان کے بعد پھر پیرسے ہی سامنے پھر سیڑھیاں بن گئیں۔ اب سُنا ہے کہ ڈھلان ہوگئی ہے وہ سیڑھیاں بھی ختم ہوگئی ہیں۔ ایسی باتوں کو کوئی نہیں سوچتا کہ یہ بدعت ہے۔ وہ تو پہاڑ پر چڑھنے کا حکم تھا اب وہ پہاڑ رہا ہی نہیں۔ اب ان سیڑھیوں پر چڑھ کر وہ چوٹی تصور کرلی کہ آگئی۔ اونچے زینے پر چڑھ کر۔ اور وہاں اس ڈھلان پر چڑھ کر وہ ہوگیا کہ جناب یہ بلندی ہے اس کی۔ ہمارے ہاں کا بڑا منبر سات زینوں کا ہوتا ہے تو بس اتنی بلندی کوہِ صفا کی ہے اور اسی کے لئے کبھی ممکن ہے کہہ چکا ہوں کہ جب تبلیغ عام کے لئے رسول کوہِ صفا پر تشریف لے گئے تو یہ کوہِ صفا پر جانا نہ تھا تبلیغ رسالت کے لئے ایک منبر کی تلاش تھی۔ جہاں صفا موجود تھا وہاں اُسے منبر بنا لیا جہاں صفا نہ تھا وہاں پالان شتر کو منبر بنالیا۔ تو اب جسامت کے لحاظ سے تو یہ ہے کہ وہ پہاڑ مجھے تو معلوم نہ ہوتا کہ پہاڑ ہے۔ پہلے سے معلوم تھا کہ پہاڑ ہے تو سمجھا کہ پہاڑ ہے۔ اس کے بعد پھر وہ کیوں ہے شعائر اللہ میں سے۔ کیا معاذ اللہ اللہ سبحانہٗ کے جلوہ کا ظہور کبھی اس پر ہوا ہے۔ تو حضور والا ہم اُسے لامکان سمجھتے ہیں جسم وجسمانیات سے بری۔ کسی کو اوتار ماننا بھی شرک سمجھتے ہیں کسی جگہ اس کے جلوۂ ذات کا ظہور بھی ناممکن سمجھتے ہیں تو یہ بات نہیں ہوسکتی کہ وہاں کبھی اس کا جلوہ نمودار ہوا ہو۔ تو پھر آخر کیا بات ہے کہ یہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہوگئیں اس کا جواب مجھے تاریخ مذہب سے ملا اور وہ تاریخ مذہب جو حدیث سے مرتب ہوئی کیونکہ اس دور کی باتیں تاریخ نویسوں کے حدود علم سے باہر ہوتی ہیں۔ ماوراء التاریخ کا دور ہے تو اس لئے دنیا کو جو حدیثوں سے ثابت ہو اسی کو تاریخ ماننا پڑیگا۔ تو جناب تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ پر توکل کرنے والی ایک بی بی۔

وہ کون جناب ہاجرہ۔ خلیل اللہ کی شریکِ حیات۔ جناب اسمٰعیل ان کے فرزند۔ ابھی صغر سنی کی منزل میں۔ دودھ پیتا ہوا بچہ اور اب یہاں دنیا کی عام لفظیں یا عام تصور یہ کہ پہلی بیوی جو تھیں جناب سارہ انھوں نے کہا کہ میں یہاں ان کا رہنا گوارہ نہیں کرتی ان کو لے جایئے۔ تو گویا بیوی کی فرمائش سے مجبور ہو کر دوسری بیوی کو لے کر نکل آئے اور ہو سکتا ہے کہ اس بیوی کی فرمائش بہانہ بن گئی ہو کسی مقصودِ الٰہی کی تکمیل کا۔ کیونکہ وہ بیوی کوئی معمولی بیوی نہیں تھی خاندانِ رسالت سے تھی وہ بیوی اور ایسی بیوی تھی اور قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں نے اُسے اہل البیت کہہ کر خطاب کیا۔ بیوی اہل البیت میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ ام سلمہ جیسی بیوی اہل البیت میں داخل نہیں کی جاتی مگر اُسے ملائکہ نے اہل البیت کہہ کر خطاب کیا تو وہ اس لئے نہیں کہ رسول کی بیوی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بیت رسالت سے ہے اور کچھ خاص صفات کی حامل ہے اور میرے پاس ان کی جلالت قدر کے اور شواہد احادیث سے موجود ہیں کہ جس منزل پر مثلاً جناب سیدہ عالم کی ولادت میں روایت ہے کہ جناب خدیجہ سے پیغمبر اسلام کی شریکِ حیات ہونے کی وجہ سے تمام خواتینِ مکہ نے قطع تعلق کر لیا۔ تھا تو اب ان کے ہاں ولادت ہونے والی تھی تو کوئی مکے کی عورت تیار نہیں تھی کہ وہ مدد کو آئے تو قدرت کی طرف سے کچھ خواتین بھیجی گئیں۔ ان خواتین میں سارہ کا بھی نام ہے اور اسی طرح سے اور موقعوں پر خاندانِ رسالت کے۔ مثلاً حورانِ جناں آئی ہیں۔ یا دہاں حوّا ہیں اور ان کے ساتھ سارہ کا بھی نام ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارہ کوئی معمولی عورت نہیں تھیں۔ بلند مرتبہ خاتون تھیں۔ اسی طرح اس بلند مرتبہ فہرست میں کلثوم خواہر موسیٰ کا نام آیا۔ یہ بھی عام طور سے معلوم نہیں عام لوگوں کو کہ کلثوم نام تھا جناب موسیٰ کی بہن کا تو وہ بھی ایسی ہی خواتین میں سے ہیں جو

ایسے محل پر آئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ خواتین بھی وہ ہیں کہ جو ایک طرح کی زندگی کی مالک ہیں۔ زندہ نہیں ہیں تو وہ کیونکر آئیں مدد کو۔ وہ آ رہی ہیں مدد کر رہی ہیں خالق کے حکم سے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین بھی بلند پایہ خواتین ہیں۔ ان میں سے ہیں جناب سارہ۔ تو بہر حال انہوں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ بہر حال ہے یہی کہ ان کے کہنے سے یہ گئے۔ اب یہ لیجاتے کسی شہر میں۔ لے جا کر پہنچاتے۔ مگر یہ انہیں ایک بے آب و گیاہ میدان میں لے آئے وہ کون۔ جہاں کعبہ ہے اور وہاں لا کر انہیں رکھ دیا۔ ایک خاتون محترمہ اور ان کا ایک بچہ صغیر ایک کوزہ آب اور دو تین روٹیاں پاس رکھ گئے۔ وہ کہاں تک وفا کرتیں۔ اب یہاں ایک جملہ جو عرض کروں گا اُس سے پتہ چلے گا کہ کیا بیوی کے کہنے سے لائے۔ جب چلنے لگے ہاجرہ نے پوچھا یا خلیل اللہ کس پر چھوڑا کہا جس کے حکم سے لایا۔ صلوٰۃ۔

چلے گئے اب وہ روٹی ختم ہوگئی پانی ختم ہوگیا۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ پہلے ماں پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ بھوک اور پیاس کا اور وہ غلبہ اتنا ہوا کہ بچے کا جو فطری ذخیرہ غذا ہے وہ ختم ہوگیا۔ شروع میں بچے کی غذا ربع تھوڑی ہوتی ہے تو اب جب یہ منزل پہنچی تو بچے پر پیاس کا غلبہ ہوا بھوک کا غلبہ ہوا جب تک اپنی بھوک اور پیاس رہی برداشت کیا لیکن جب بچہ تڑپنے لگا تو اب اپنی جگہ سے اُٹھیں ممکن ذریعہ کیا تھا۔ چاروں طرف دیکھا تو کہیں پانی کا نشان نہیں۔ ایک طرف کوہ صفا نظر آیا دوسری طرف کوہ مروہ نظر آیا۔ چونکہ بلندی پر جانے سے حدِ نظر میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے لہٰذا پہاڑ پر گئیں کہ کہیں تو چشمہ ہوگا اُدھر تو نظر آئے گا اُدھر گئیں کہ کہیں اِدھر ہوگا تو نظر آئے گا مگر وہاں ہوتا تو نظر آتا۔ کہیں دُور دُور تک پانی نہیں۔ اب صورت واقعہ یہ بتاتی ہے کہ پانی تلاش کرنے کے لئے جاتی ہیں مگر پھر تصور یہ ہوتا ہے کہ بچہ اکیلا ہے تو اُتر کر آجاتی

ہیں بچے کے پاس پھر اس کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی تو گویا اپنی نگاہ کو جھٹلاتی ہیں کہ پھر جاؤں پھر دیکھوں تو چشمہ نظر آئے یا کوئی قافلہ آتا ہوا نظر آئے اتفاق سے۔ تو اس سے پانی دستیاب ہو۔ غرض سات مرتبہ گئیں صفا سے مروہ تک اور مروہ سے صفا تک۔ تو جناب وہ عمل ان کا اللہ کو اتنا پسند ہوا کہ قیامت تک کے لئے جزوِ حج بنا دیا۔ وہی سعی۔ سعی کے معنی ہیں دوڑنا۔ اور ظاہر ہے کہ صورتحال یہ ہے کہ اپنی ممکن تیز رفتاری سے چل رہی ہوں گی۔ تو وہ جزوِ حج بنا دیا سعی کے نام سے۔ اور ہر حاجی کسی بھی نقطۂ نظر کا ہو لیکن حج اگر کرے گا تو وہ سعی بھی کرے گا۔ تو اب ان حاجی صاحب سے پوچھئے کہ کیا یہ بھی پیاسے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ کیا یہ بھی تلاشِ آب کر رہے ہیں۔ تو نہ یہ پیاسے ہیں نہ یہ تلاشِ آب کر رہے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ اصل مقصد کا تعلق پہلے صاحب عمل سے ہوتا ہے دوسرے احکام جو ہیں وہ اس کی یاد کو قائم رکھتے ہیں اور اگر شعوری طور پر ذہن میں اسکی یاد رہے گی تو پھر اس مقصد کی اہمیت بھی ذہن میں ضرور رہے گی۔ جس کے لیے اس نے وہ کارنامہ انجام دیا۔ تو اس کو جزوِ حج بنا دیا۔ اور اب ایک اور پہلو کی طرف با فہم مجمع کو مخاطب کروں متوجہ کروں کہ وہ قادرِ مطلق جس نے بعد میں انتظام کیا جو ابھی میں عرض کروں گا وہ کیا اس پر قادر نہیں تھا کہ پہلے ہی وہ انتظام کر دیتا سیرابی اسمٰعیل کا۔ کیا اسے اچھا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فاقہ زدہ خاتون اتنی تگ و دو کرے اتنی جدوجہد کرے مگر اسے تو قیامت تک کے افراد کو یہ سبق دینا تھا کہ جب تک سعی نہیں کرو گے نتیجہ حاصل نہیں ہو گا۔ اگر دنیا چاہتے ہو تو بغیر سعی نہیں ملے گی اور اگر آخرت چاہتے تو بغیر سعی نہیں ملے گی۔ صرف نعرے لگا دینے سے صرف کچھ نام لے لینے سے یہ امید نہ کرو کہ بہتر سے بہتر نتیجہ مل جائے گا اس کی راہ میں جدوجہد

بھی کرنی ہوگی۔صورت واقعہ یہ بتاتی ہے کہ یہ ہم تر و تازہ جاتے ہیں سات دفعہ چکر لگاتے ہیں۔ تھوڑا سا تھک جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ بی بی جو نہ جانے کتنے دن سے بھوکی تھی اور کتنے دن سے پیاسی تھی تو معلوم ہوتا ہے کہ امکانی طاقت اتنی ہی تھی اب جیسے تھکن سے چور ہوگئی تھیں اور اب جیسے کچھ ناامید سی ہوگئی تھیں تو بس جہاں انسانی طاقت ختم ہوئی وہاں سے خدا کی قدرت شروع ہوئی۔ بس اب ساتویں دفعہ کے بعد جو پلٹیں تو دیکھا کہ جہاں بچہ ریت پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے وہیں سے پانی ابل رہا ہے۔ اب یہ تفصیل تو قرآن مجید میں نہیں ہے روایتوں میں ہے۔ اب خلاف توقع خلاف امید ایسی مایوسی کے عالم میں پانی نظر آرہا ہے تو اب یہ انسانی تصور کی کمزوری ہے۔ اضطراب ہے کہ پانی چلا نہ جائے تو اپنی زبان میں کہا کہ زم زم یعنی تھم تھم۔ روایت بتاتی ہے کہ اگر زم زم نہ کہا ہوتا تو نہ جانے کہاں تک نہر بن کر جاتا۔ کیونکہ اللہ کی خاص خاتون جو اس کے ہاں مقبول تھی اس نے زم زم کہہ دیا تو گویا پانی اس کی اطاعت کر رہا ہے۔ اب وہ وہیں رُک گیا۔ کنواں کہا جانے لگا چاہ زمزم ہوگیا ورنہ وہ چشمہ زم زم ہوتا یا نہر زم زم ہوتی۔ خصوصیت زمزم کی کیا ہے ماشاءاللہ حجاج کرام اندازہ کر سکتے ہیں جو نہیں بھی گئے ہیں انہوں نے سُنا ہوگا۔ اب تو سُنا ہے کہ کچھ ایسا کر دیا ہے کہ بند ہوگیا ہے وہاں تک رسائی ہی نہیں ہے لیکن جب تک رسائی تھی اس وقت تک وہ لاکھوں آدمی۔ لاکھوں سے کم تو بحمداللہ مردم شماری ہوتی ہی نہیں حاجیوں کی۔ تو وہ لاکھوں آدمی پیتے ہیں ہر وقت۔ سقے مشکیں بھرے ہوئے زمزم کا پانی پلاتے ہیں پھرتے ہیں جس کے پیسے وہ وصول کرتے ہیں اور لوگ اس زمانے میں اب نہیں کر سکتے ہوں گے اپنے کپڑے دھوتے ہیں چادریں دھو دھو کرلے جاتے ہیں اس سے۔ کفن اس سے دھوتے

ہیں۔ دنیا والی چادریں بھی اور عقبیٰ والی چادریں بھی۔ اور ڈبوں میں مشکوں میں جتنا ظرف ہو جس کے پاس اتنا پانی ہر ایک بھر لیتا ہے لیکن کبھی سننے میں نہیں آیا کہ زمزم نے بخل کیا ہو۔ کسی وقت سنا ہو کہ زمزم خشک ہو گیا۔ اب وہ پانی اس میں سے نہیں نکل رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عالم امکان میں اللہ نے نقشہ پیش کر دیا ہے اپنے خزانہ عطا کا کہ یہ میرا مخلوق ایک چشمہ فیض ہے کہ اس میں سے جتنا لو وہ دیگا اسمیں کمی نہیں ہو گی تو میرا خزانہ عطا کہاں ختم ہوتا ہے تو یہ ہے بس جو تاریخ مذہب سے ہمیں روایت ملی۔ اب ہر صاحب فہم غور کرے کہ کوئی روایت نہیں بتاتی کہ جناب ہاجرہ کے پیر سے خون کا کوئی قطرہ اس زمین پر گر گیا ہو مگر اللہ کی راہ میں جو چلی بھی تو اس بی بی کے قدم سے تھوڑی دیر کے لئے جو پہاڑیاں مس ہو گئیں وہ شعائر اللہ میں داخل ہو گئیں بنص قرآن تو برائے خدا بتائیے کہ وہ زمین جہاں شہیدوں کا خون جذب ہو جائے ہم اگر اُسے خاک پاک کہیں اور اس کا احترام کریں تو اُسے شرک کہا جائے اگر وہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں ہو سکتی ہیں تو پھر کربلا کی زمین بھی شعائر اللہ میں سے ہم کہیں تو اُسے مانیے اُسے قبول کیجئے اس کے بعد وہ دوسری آیت جو میں نے پڑھی تھی۔ والبدن جعلنٰھا من شعائر اللہ۔ وہ جانور کون جو قربانی کے لئے رکھے گئے ہیں وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اب اسی ترجمہ سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ابھی وہ قربان ہوتے نہیں ہیں مگر چونکہ قربانی کی نیت سے وہ رکھے گئے ہیں اسی غرض سے وہ ساتھ رکھے گئے ہیں لہٰذا بحالت حیات بھی وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ بس اب عقل سے کام لیجئے اور یاد رکھئے کہ دین انہی کے لئے ہے جن کے پاس عقل ہو۔ وہ کوئی اور مذاہب ہوں گے جو عقل کے اُوپر پہرے لگاتے ہیں۔ قرآن تو ہر جگہ صاحب عقل کو پکارتا ہے۔ ارے بے عقلوں کو تو اس نے تکلیف شرعی ہی سے بری کر دیا ہے مگر فطری طور سے بے عقل جو

جان بوجھ کر بے عقل نہ ہو۔ ان کے خلاف وہ عقل ہی حجت ہو گی۔ عقل رکھتے تھے مگر تم نے عقل سے کام نہ لیا۔ تو اب دیکھئے کہ حیوان جو راہِ خدا میں بحکم خدا یعنی حج کی راہ میں ہیں۔ لہٰذا راہ خدا ہی کہہ سکتے ہیں۔ قربانی کا حکم اس کا ہے لہٰذا حکم خدا ہی ہوا۔ لہٰذا راہِ خدا میں حکم خدا سے قربان کرنے کے لئے ساتھ رکھے گئے ہوں تو وہ اپنی حیات میں بھی شعائر اللہ ہیں اور اسی سے سمجھ میں آئے گا کہ جب قربانی ہو جائے تو بھی وہ قابل احترام ہیں شعائر اللہ ہیں۔ تو بتائیے حیوان راہ خدا میں بحالت حیات شعائر اللہ ہوں تو وہ انسان جو راہ خدا میں قربان ہو جائیں وہ انسان شعائر اللہ میں نہ ہوں گے۔ ان کی تعظیم کیجئے تو شرک ہو جاتے جانوروں کی تعظیم خدا کا حکم ہے اور انسانوں کی تعظیم شرک قرار پائے جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں راہ خدا میں قربان کر دی ہوں اور ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں ذرا غور کیجئے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ شہید ہونا اپنے اختیار کی بات نہیں ہے شہید ہونا قسمت سے وابستہ ہے۔ اپنے اختیار کی بات تو میدانِ جنگ میں جمے رہنا ہے تو حضور وہ جانور شعائر اللہ ہوں اور انسان شعائر اللہ نہ ہو اور میں نے کہا کہ وہ جانور ابھی ذبح نہ ہوئے ہوں بحالتِ حیات شعائر اللہ تو اب نتیجہ نکال لیے اگر عقل ہو تو پھر وہ انسان جو راہِ خدا میں قربان ہونے والے ہوں وہ بعد شہادت ہی شعائر اللہ نہیں ہیں بلکہ وقتِ ولادت ہی سے شعائر اللہ ہیں اور اس کے بعد آپ کے جانے پہچانے ہوئے واقعات۔ سب کے ہاں ہیں کہ رسول اللہ بچوں کے بوسے لیتے تھے۔ بلاشبہ ہے روایت تو میں اب نہیں سمجھ سکتا اور فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ بچوں سے محبت تھی یا شعائر اللہ کا احترام تھا۔ فیصلہ یہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ دین اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا بچوں سے محبت بھی کوئی خلاف شان بات نہیں ہے۔ بچوں سے محبت کرنا بھی منظورِ قدرت ہے۔ ہمیں بھی اپنے بچوں سے محبت

ہونی چاہیئے تو خلافِ شان ہوتا تو میں شک کا اظہار نہ کرتا یقین کے ساتھ تو میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ بچوں کی محبت ہے یا شعائر اللہ کا احترام مگر اب جو روایتیں گوش زد ہیں اور آپ کے بھی گوش زد ہیں اور میری نظر سے بھی کتابوں میں گزری ہیں ان کے پیشِ نظر ابھی تک تو میں شک کا اظہار کر رہا تھا لیکن اب میں اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ نہیں بچوں کی محبت محرک بوسہ نہ تھی بلکہ شعائر اللہ کا احترام ہی مدِنظر تھا۔ اور اس کا ثبوت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بچوں کی محبت ہو تو پیشانی بھی اپنے بچے کی ہے رخسار سے بھی اپنے بچے کے ہیں ہاتھ بھی اپنے بچے کے ہیں سینہ بھی اپنے بچے کا ہے مگر کیا بات ہے کہ جب بوسے لیتے ہیں تو ایک کے دہن کے بوسے لیتے ہیں اور ایک کے گلے کے بوسے لیتے ہیں۔ میں پوری ضمانت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ سند کیسی ہے کس درجہ کی روایت ہے مگر بہر حال یہ روایت آپ نے سنی ہوگی کہ بعض وقت بچے کو ذرا محسوس ہوئی یہ بات۔ یہ آپ نے سنا ہوگا۔ ایک دفعہ سیدہ عالم کے پاس گئے اور یہ کہا کہ مادرِ گرامی ذرا دیکھئے ہمارے منہ سے کیا بدبو آتی ہے اور سیدہ عالم نے کہا کہ تمہیں یہ تصور کیوں ہوا۔ تمہارے دہن سے تو مشک و عنبر سے بہتر خوشبو آتی ہے یہ تم پوچھ ہی کیوں رہے ہو تو کہا بس اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ ہم بھی نانا کی گود میں ہوتے ہیں بھائی حسن بھی ہوتے ہیں مگر۔ بھائی حسن کے دہن کے بوسے لیتے ہیں اور جب ہماری باری آتی ہے تو ہم اپنا دہن بڑھاتے بھی ہیں تو نانا ہمارے منہ کو ہٹا کر گلے کے بوسے لے لیتے ہیں سیدہ عالم حقیقت سے تو واقف تھیں مگر فرمایا کہ چلو تمہیں تمہارے نانا جان سے بھی سنوا دیں۔ ساتھ لیا حسین کو۔ اور آئیں باپ کی خدمت میں اور ممکن ہے بالکل لفظیں نہ ہوں۔ اس دن نقل بالمعنی کے متعلق عرض کر چکا ہوں۔ حقیقت حال وہی ہو

اور ممکن ہے کہ لفظیں ہماری ہوں کہ وہ سیدہ عالم نے جیسے فرمایا کہ بابا جان آپ ہی تو کہتے ہیں کہ حسین کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے مگر کیا بات ہے کہ آپ ہی کے عمل سے کوئی بات ایسی ہو جائے کہ اسکی آنکھیں اشک آلود ہو جائیں۔ فرمایا کیوں کیا ہوا۔ کہا اس نے ابھی جاکر مجھ سے یہ کہا۔ تو میں تو اسے محسوس کرتا ہوں کہ رسول نے فرمایا ہو کہ ارے فاطمہ جانے دو حسین کر کیا کر دگی۔ کہا ہر گز نہیں میں تو چاہتی ہوں اسکو اطمینان دلانا فرمایا تو پھر سنو کہ حسن کے لب کے بوسے لیتا ہوں اس لئے کہ زہر دغا متصل ہے اس کے لبوں سے۔ اس کے گلے کے بوسے لیتا ہوں اس لئے کہ خنجر جفا متصل ہے اس کے گلے سے۔ بس اب اس روایت سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ وہی قربانی پیشِ نظر ہے جس کی بنا پر بوسے لے رہے ہیں اور اب یہ سلسلہ برابر قائم ہے یہ بھی روایت میں ہے کہ حسین آتے ہیں اور رسول فرماتے ہیں کہ یا علی ذرا پیراہن اُٹھاؤ جسم سے حسین کے۔ جناب شیخ جعفر شوشتری نے لکھا ہے خصائص حسینیہ میں، پیراہن اٹھاتے ہیں اب جا بجا رسول بوسے لیتے ہیں اور علی بھی کہتے ہیں یا رسول اللہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں فرماتے ہیں اقبّل مواضع السیوف وابکی۔ جہاں جہاں تلواریں پڑیں گی وہاں وہاں بوسے لے رہا ہوں۔ اب وہ تو ہر دن کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں عرض ہوتا ہے کہ ہمارے گروہ پر مختلف سوالات ہوتے رہتے ہیں تو ان میں سے ایک یہ سوال بہت بڑا ہے جیسے ایک شاعر نے کہا کہ زندہ کو رویا جاتا ہے رد میں وہ جو قائل ہوں ممات شہدا کے۔ ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ یہ گویا بہت مشہور شعر ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہم سے تو بعد میں پوچھنا چاہیئے وہ بچہ جب پیدا ہوا اور رسول کی گود میں لا کر دیا گیا اسی وقت پیغمبر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور گریہ فرمانے لگے تو کسی نے کہا کہ رسول اللہ یہ تو خوشی ہونے کا موقع ہے یہ آپ

گریہ کیوں فرماتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں تمہیں نہیں معلوم اس پر مصائب کیا پڑیں گے تو میں کہتا ہوں ہم سے آپ پوچھ رہے ہیں کہ زندہ کو کیوں روتے ہو اسی وقت رسول اللہ سے یہ پوچھتے کہ زندہ کو کیوں رو رہے ہیں اسے یہ زندگی تو عالم معنی کی ہے آنکھوں کے سامنے والی زندگی نہیں ہے اور وہ تو اس وقت حیات عنصری کے ساتھ سانس لیتی ہوئی زندگی کے ساتھ رسول کی گود میں تھے اور اس کے باوجود رسول گریہ فرما رہے ہیں تو اب تو سمجھے کہ گریہ موت پر نہیں ہوتا مصائب پر ہوتا ہے اگر پیغمبر کو اس کی زندگی میں رونے کا حق تھا تو ہمیں اس نوع زندگی میں رونے کا حق ہے یہ کیا کہ زندہ کا ماتم نہیں ہوتا زندہ کو رویا نہیں جاتا میں کہتا ہوں کہ جناب یوسف بھی تو زندہ تھے اور روایت کی بات نہیں ہے نص قرآن کی بات ہے۔ قرآن سے ثابت ہے کہ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ زندہ ہیں۔ بعد میں کہا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے تو بتایا جا چکا تھا انہیں کہ زندہ ہیں اور اس کے بعد کتنا روئے ہیں ابیضت عینا ہ۔ آنکھیں سفید ہو گئیں روتے روتے اب وہ ہر وقت رنج و غم سے خاموش رہتے تھے۔ معلوم ہے کہ زندہ ہیں۔ تو یہ نہیں کہ مرنے کا غم ہوتا جدائی کا بھی غم ہوتا ہے۔ مصائب پر بھی رونا ہوتا ہے مختلف صورتیں ہیں گریہ کی۔ اب جو چیز عرض کر رہا ہوں وہ چاہے مختصر ہو مگر آپ کے لئے بڑے مرثیے کے برابر ہے میں کہتا ہوں عقلی اصول کے لحاظ سے۔ (میں کہیں عقل کا دامن نہیں چھوڑتا) کہ اگر ایک بھائی کے لب شعائر اللہ ہیں ایک بھائی کی گردن شعائر اللہ میں داخل ہے تو ماننا پڑے گا کہ ایک بہن کے بازو بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اور وہ بھی باب مصائب میں جو روایات بیان ہوتے ہیں اس میں ضمانت نہیں ہوتی صحت سند کی۔ بس کتاب میں ہوں۔ ہاں وہ چیز روا نہیں ہے کہ

منبر پر جا کر تصنیف ہو بر وقت۔ گویا ایک چیز جس کا کہیں وجود نہ ہو اور میں نے تو دیکھا کہ زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں بلکہ وہ افترا علی اللہ والرسول میں داخل ہے جو اگر حالت روزہ ہو تو روزے کو باطل کر دیتی ہے۔ تو وہ حدیث کربلا میں بیان ہوئی ہے اور بڑے سخت وقت میں بیان ہوئی ہے بس ارباب عزا اسی ذکر پر مجلس کو ختم کروں گا کہ وہ وقت ہے جب ابوالفضل العباس جا رہے ہیں اور سکینہ سے مشک لے چکے اور اب رخصت ہو رہے ہیں تو حضرت ثانی زہرا سب سے آخر میں زینب سے رخصت ہونے آئے کہا بی بی اب میں جا رہا ہوں۔ زینب تو جانتی تھیں کہ یہ پانی لانا فقط بہانہ ہے جانے کا جو گیا واپس نہیں آیا۔ عباس بھی واپس نہیں آئیں گے کہنے لگیں بھائی جاتے ہو تو چلتے چلتے ایک حدیث سُنتے جاؤ اب مجھے تو اس کے بیان کے لئے یہی لفظیں ملتی ہیں کہ شیر خدا کا شیر سر جھکا کر بہن کے قدموں پر بیٹھ گیا اس لئے کہ جانشین فاطمہ حدیث سنانے لگی ہیں فرماتی ہیں اے بھائی سُنو بچپن میں ایک دفعہ بابا کے زانو پر بیٹھی تھی میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ بابا سے مراد امیرالمومنین یا رسول اللہ اگر حسن و حسین فرزند رسول ہیں تو زینب کو کیوں حق نہیں تھا کہ وہ رسول اللہ کو بابا کہیں بہر حال وہاں ایک ہے بابا۔ باپ کے زانو پر بیٹھی تھی اب اندازہ کیجئے کہ کم سن اتنی ہیں کہ بزرگ کے زانو پر بیٹھی ہیں اور اب یہ ہوائے زمانہ سے کتنی مخالف بات ہے مگر جب موقع آئے گا ایسی بات کہنے کا تو کہوں گا ضرور کہ اتنی کم سن کہ بزرگ کے زانو پر بیٹھی ہیں مگر تہذیب خاندان رسالت۔ یہ ہے کہ اس وقت بھی دوش پر چادر ہے یہ جزو روایت ہے کہتی ہیں کہ بابا کے زانو پر بیٹھی تھی۔ کہ ایک دفعہ میرے دوش سے چادر ہٹ گئی تو بابا نے جھک کر میرے بازو

کا بوسہ لے لیا چونکہ اک نئی بات تھی اس لئے میں کھڑی رہ گئی میں نے کہا بابا یہ آپ نے آج کیا کیا۔ فرمایا زینب ایک دن ان بازوؤں میں رسی بندھے گی کہتی ہیں اس وقت تو میں کم سن تھی بعد میں جب بڑی ہوئی اور گھر بھائیوں سے بھر گیا تو نہ جانے کب میں نے سوچا بچپن کی اس بات کو کہ جس بہن کے اٹھارہ بھائی ہوں کس کی مجال ہے کہ اس کے بازوؤں میں رسی باندھ سکے، مگر اے عباس سب جا چکے اب تم بھی جا رہے ہو یقین ہو گیا کہ بہت جلد ان بازوؤں میں۔

مجلس پنجم

شعائر اللہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ؕ

وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ ۔

جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا جز ہے۔

تعظیم شعائر پر جو الزام شرک کا لگتا ہے اس پر چار دن تک گفتگو کر چکا۔ اب جس طبقہ کو شرک کی لفظ بہت حفظ ہے اسی کو ایک دوسری لفظ بدعت کی بہت یاد ہے۔ زیادہ تر تو شرک شرک کی آواز بلند ہوتی ہے اور جہاں ذرا رعایت سے کام لے کر شرک نہیں کہا وہاں بدعت کہہ دیا جاتا ہے تو اس لئے آج بدعت کے متعلق عرض کروں گا۔ بدعت کی لفظ کا ہمارے ہاں مفہوم الگ ہے اور مسلمانوں کی اکثریت میں اس کا مفہوم الگ ہے۔ میں دونوں مفہوم پیش کروں گا۔ اور زیادہ تفصیل سے دوسرے مفہوم کو، کیونکہ اسی کی بنیاد پر بدعت کی آوازیں زیادہ سُننے میں آتی ہیں۔ اس سے پہلے اپنے نقطۂ نظر کو عرض کروں گا۔ بدعت کے معنی جو بہت ہی سطحی نگاہ والے سمجھتے ہیں کہ ہر نئی بات۔ تو مطلق طور پر۔ آنکھ بند کر کے ہر نئی بات کو کوئی بدعت نہیں سمجھتا۔ اس میں ہمارے ہاں بھی ایک اصطلاح ہے اور ان کے ہاں بھی اک اصطلاح ہے۔ ہمارے ہاں بدعت کی تعریف ہے ادخالُ مالیس من الدین فی الدین واخراج ماھو فی الدین من

الدین ۔ جو چیز دین میں نہیں ہے اس کو دین میں داخل کرنا اور جو چیز دین میں داخل ہے اس کو دین سے خارج کرنا یہ ہمارے نزدیک بدعت کی تعریف ہے کوئی بھی کام کریں اور اس کو یہ سمجھ کر نہ کریں کہ یہ دین کا جز ہے تو اُسے بس یہ دیکھنا ہوگا کہ شرع میں اس کی ممانعت تو نہیں ہے۔ اگر شرع میں ممانعت ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ بدعت ہے یہ کہیں گے حرام ہے یعنی شرع نے ناجائز قرار دیا ہے یعنی ممانعت شرعی کی بنا پر اُسے حرام کہیں گے۔ فرض کیجئے ممانعت اس حد پر نہیں ہے کم درجہ پر ہے تو اُسے مکروہ کہیں گے۔ غرض یہ جو شرع کے احکام ہیں دو مثبت دو منفی۔ مثبت حکم واجب اور مستحب، منفی حکم حرام اور مکروہ۔ پانچواں حکم ہے بین بین یعنی مباح جائز۔ یعنی نہ اس کے کرنے کا حکم نہ اس کے نہ کرنے کا حکم۔ تو اب اگر کسی چیز کی ممانعت ہوئی ہے تو وہ کچھ ممانعت کا لب ولہجہ کچھ انداز۔ اس سب سے علما۔ یہ اندازہ کرتے ہیں کہ یہ ممانعت حرمت کی حد تک ہے تو اس کو کہتے ہیں حرام۔ اور اگر سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بس گویا اولیٰ یہ ہے کہ نہ کریں بہتر یہ ہے کہ نہ کریں تو اسے کہتے ہیں مکروہ۔ اسی طرح جس کا حکم ہوا ہے اگر لزومی حکم ہوا ہے تو واجب کہتے ہیں۔ غیر لزومی حکم ہے یعنی بہتر ہے کہ کریں تو اسے مستحب کہتے ہیں۔ جہاں حکم نہ ادھر کا ہے نہ اُدھر کا ہے اسے مباح کہتے ہیں۔ تو یہاں بدعت کی لفظ کہیں پر نہیں آئے گی۔ نہ فعل میں آئے گی نہ ترک میں آئے گی۔ اگر فعل ہو جزوِ دین سمجھ کر اور وہ دین کا جز نہیں ہے تو وہ فعل بدعت اور ترک ہو جزوِ دین سمجھ کر حالانکہ وہ جزوِ دین نہیں ہے تو وہ ترک بدعت اور جہاں فعل یا ترک جزوِ دین ہے وہاں اس کو خارج کرنا وہ فعل جو جزوِ دین ہے اُسے خارج کرنا وہ بھی بدعت اور وہ ترک جو جزوِ دین ہے اُسے خارج کرنا وہ بھی بدعت۔ اب جزوِ دین کیونکر ہوتا ہے فعل۔ ایک تو اعتقادات کا

باب ہے کہ کون جزوِ دین ہیں یعنی کن کا ماننا ضروری ہے وہ اعتقادات کا باب ہے۔ افعال میں کون جزوِ دین ہیں یعنی قربۃ الی اللہ بجالایا گیا۔ یعنی نیت اس میں ہو کہ خدا کے حکم کی وجہ سے جیسے نماز قربۃ الی اللہ بجالائی جاتی ہے۔ روزہ قربۃ الی اللہ ہوتا ہے۔ تو یہ قربۃ الی اللہ۔ یعنی اللہ کی رضا کے لئے۔ اللہ کی خوشنودی کے لئے۔ اس سے تقرب کے لئے ہم اس کام کو کرتے ہیں۔ تو اس میں فرض کیجئے اللہ کی طرف سے کوئی ثبوت نہیں اس کا کہ اللہ کو یہ کام پسند ہے۔ اور ہم پھر یہ نیت کر کے اسے انجام دیں کہ یہ اللہ کی رضا کے لئے کرتے ہیں تو یہ اللہ پر گویا بہتان ہے اللہ پر افترا ہے جھوٹ ہے۔ یہی مشرکین سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ کیا اللہ نے تم سے کہا ہے کہ ان بتوں کی پرستش کرو تم اللہ پر افترا کرتے ہو تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔ تو اس چیز کو جس کا حکم اس کی طرف سے نہیں ہے یہ سمجھ کر کرنا کہ اس کا حکم ہے۔ قربۃ الی اللہ انجام دینا یہ بدعت ہوگا۔ اب اس میں ہم اپنی عقل آرائی سے کام لیں کہ نہیں یہ اللہ کو ضرور پسند ہوگا اب اس کی مثالیں۔ نماز پنجگانہ کا حکم ہے۔ اب یہ دَوْر تو ریسرچ کا ہے کہ نئی بات کوئی کہے۔ کہ صاحب جب پانچ نمازیں اُسے پسند ہیں تو ہم دس نمازیں اگر واجب کی نیت سے پڑھیں تو کیا حرج ہے۔ حرج یہی ہے کہ اس نے پانچ واجب کی ہیں آپ دس کئے دیتے ہیں۔ کوئی اس کی حمایت کرنے والا کہے کہ صاحب کمی تو نہیں کی اور زیادتی ہی کر دی تو وہ زیادتی ناجائز ہوگی حرام ہوگی۔ ایک بدعت کی ایجاد ہوگی۔ اب اس میں کہ جو نماز پنجگانہ ہے اس کی رکعتیں جتنی مقرر ہیں صبح کی نماز دو رکعت مغرب کی نماز تین رکعت باقی سب چار چار رکعت۔ اب کوئی عقل آرائی کرے کہ صاحب وہ ہماری آسانی کے لئے ہے کہ ابھی سو کر اٹھے ہو نیند کا اثر ہے تو دو ہی رکعتیں پڑھ لو تو کہئے کہ ہماری

آسانی کے لئے تھا ہم رضا کارانہ طور پر چار پڑھتے ہیں تو کیا مضائقہ۔ تو یہاں عقلی بحث سے کام نہیں چلے گا۔ یہاں اطاعت مولا ہے۔ اس نے دو رکعت کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہ تصور پہلی صدی سے شروع ہو گیا کہ جو حکمران ہے وہ نماز پڑھاتے اُسے نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق ہے۔ لوگ فخریہ کہیں گے کہ ہم نے فلاں کے پیچھے آج نماز پڑھی۔ تو جناب جو کہیں گورنر ہوتا تھا اس کا کام ہوتا تھا نماز پڑھانا۔ اب دَورِ بنی اُمیّہ میں ایک گورنر صاحب تھے جو شراب کے نشے میں چُور محراب عبادت میں آئے صبح کی نماز پڑھانے اور شروع کے گورنر تھے جب صحابہ بھی دنیا میں موجود تھے اور بیچارے صحابہ اس نماز کی صف جماعت میں تھے یہ روایت سے ثابت ہے تاریخی روایت ہے۔ اب یہ سوچتے رہیئے گا کہ یہ جماعت میں شامل تھے تو تقیہ تھا یا نہیں تھا۔ تو جناب جماعت میں صحابہ بھی شامل تھے اب انہوں نے آج یوں کہوں کہ ذوق عبادت تھا تو دو رکعت کی بجائے چار رکعتیں صبح کی نماز کی پڑھا دیں اور اس کے بعد مڑ کر پوچھا اور کچھ اضافہ کر دوں۔ کہو تو دو چار رکعتیں اور تو وہ ایک آوازیں ہیں وہاں۔ تمام ہیں صحابہ میں سے بعض کے۔ جو وہاں تھے۔ کہ۔ معاذاللہ۔ مَکَ فی زیادۃ۔

آپ کے ساتھ تو ہم زیادتی ہی میں رہے ہیں تو اس وقت بس کافی ہے۔ اتنا ہی احسان آپ کا بہت ہے کہ دو کی بجائے چار پڑھا دیں۔ تو یہ ہوا یہ ہے بدعت کہ مثلاً دو کی بجائے چار رکعتیں پڑھا دینا۔ یا اجزائے نماز میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا کہ جناب سورہ حمد ایک دفعہ کا حکم ہے۔ ہم ایسی نماز پڑھیں جس میں سورۃ حمد دو دفعہ پڑھا کریں۔ پانچ سورے پڑھا کریں۔ اب کوئی کہے کہ یہ کیا۔ ارے صاحب ہم نے کوئی کمی کی ہے۔ ہم نے تو زیادتی کی ہے۔ ہماری تعریف کیجیے کہ ہم اتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں۔ تو یہی بدعت ہو گی کہ آپ نے

چھوٹی نماز کو لمبا کر دیا۔ آپ کو کیا حق تھا۔ جتنا مقرر تھا آپ کو پڑھنا چاہیئے تھا اسی وجہ سے علما کہتے ہیں۔ قِران دو سوروں میں حرام ہے قِران کے معنی ہیں دو سُورے بجائے ایک سُورے کے۔ سورۃ الحمد کے بعد ایک سورہ پڑھنا چاہیئے دو سُورے پڑھیں تو وہ قِران ہے۔ یا ماہِ رمضان میں ہم دو دن کا روزہ رکھیں۔ رات کو بھی افطار نہ کریں۔ شروع ہی سے اگر نیت یہ کریں کہ ہم دو دن کا روزہ رکھیں۔ اگر نیت ایک ہی دن کے روزہ کی ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ رات کو آپ کچھ کھائیے بھی۔ وہ تو وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا روزہ۔ کھانا آپ کا فعل ہے وہ وقت ہی نہیں رہا تو روزہ کہاں رہے گا۔ اور نیت بھی ایک ہی کی تھی اس سے زیادہ کی نہیں ہو گی تو اس سے لازم نہیں آئے گا کہ وہ صوم وصال ہو جائے۔ صوم وصال حرام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دو دن کا مسلسل روزہ۔ اسی طرح گھٹا کر کوئی روزہ ایجاد کیا جائے۔ عوام میں کچھ مشہور ہے بعض جگہ کہ ڈھائی پہر کا روزہ اور دو پہر کا روزہ۔ تو وہ فاقہ کیجئے آپ کو اختیار ہے۔ چاہے جتنی دیر کا کیجئے لیکن روزہ رکھنا ہے تو وہ جتنا حکم ہوا ہے۔ اتموا الصیام الی اللیل۔ پس جب رات آئے تو روزہ ختم کرو۔ اور قرآن کی ایک یہی لفظ بہت سی بحثوں کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ معلوم ہوا روزہ کی حد ہے کہ رات آئے اگر صرف سورج کے نظر سے اوجھل ہونے سے رات ہو جایا کرتی ہو تو افطار کا وقت وہ ہے اور اگر کچھ تاریکی کی ضرورت ہے تو پھر افطار کا وقت یہ سمجھئے۔ کہ ذرا تو تاریکی پیدا ہو جائے۔ بہر حال قرآن کی لفظیں یہ ہیں۔ واتموا الصیام الی اللیل۔ رات کے آنے تک تم روزہ کو پورا کرو۔ تو یہ سب جو ہے اسی بنا پر بعض لوگ عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ واقعی ہمیں ہمدردی ہوتی ہے کہ اتنی محنت اتنی زحمت۔ وہ کوئی آسان تھوڑی ہوتا ہے افطار کے بعد کھڑا رہنا۔ مگر اب

ہم کیا کریں کہ ہمیں اصول شرع یہ معلوم ہو گیا ہے کہ واجب نماز میں جماعت درست ہے اور نفل میں جماعت نہیں ہو سکتی۔ اب اگر کسی قسم کے بھی نفل۔ چاہے غیر ماہ رمضان میں۔ چاہے ماہِ رمضان میں۔ چاہے دن کو چاہے رات کو۔ کسی قسم کے نفل با جماعت ادا کیے جائیں گے تو اسے ہم کہیں گے کہ یہ بدعت ہے۔ اور یاد رکھیے کہ ہمارے ہاں جو چیز بدعت ہو وہ پھر حسنہ نہیں ہو سکتی۔ بدعت کی دو قسمیں نہیں اچھی اور بری۔ بدعت ہے تو بس بری چیز ہے۔ وہ اچھی چیز نہیں ہے اور متفق علیہ حدیث ہے کل بدعة ضلالة۔ وہاں اس میں قید نہیں لگائی ہے کوئی۔ کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔ عربی داں افراد جانتے ہیں کہ شکل اولی رسول نے بنائی ہے جس کا نتیجہ بدیہی ہوتا ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی کا نتیجہ دوزخ ہے یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ اس میں سوال اچھے اور برے کا پیدا نہیں ہوتا۔ بدعت جو ہے وہ بری ہی ہے۔ ان میں کوئی اچھی نہیں ہو سکتی۔ تو اب کوئی بھی اس طرح کی ایجاد۔ نئی قسم کی نماز۔ نئی قسم کا روزہ۔ نئی قسم کا حج۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نئی قسم کی۔ اور ظاہر ہے کہ روزہ ہے تو قربة الی اللہ رکھا جائے گا۔ نماز ہے تو وہ قربة الی اللہ تو وہ بدعت ہو گی یعنی نئی قسم کی نماز وغیرہ۔ اب فرض کیجیے کہ عید کی سویاں۔ اس کا شرع میں کہاں حکم ہے کہ عید کے دن سویاں کھاؤ۔ مگر وہ ہمارے ہاں تو ہر جگہ ہے۔ میرے خیال میں تو جو ناواقف مسلمان بھی ہیں وہ بھی یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ سویاں کھانا خدا کا حکم ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی عبادت ہے۔ آج سویوں کا کھانا۔ تو جناب یہ دعوتوں میں اکثر سویاں ہوتی ہیں شیرینی کی بجائے ان کا کھانا جائز ہے۔ ایک دن کی قید کر کے بھی ان کا کھانا جائز ہے۔ یعنی جو چیز جائز ہے وہ بلا قید جائز ہے تو قید کے ساتھ جائز کیوں نہ ہو گی۔ بس یہ تصور نہ ہو کہ اللہ کا

حکم ہے۔ یہ تصور نہ ہو کہ شرعاً آج سویاں کھانا واجب ہے۔ یا باعث ثواب ہے
تو کوئی عالم ہم میں کا سویاں کھانے میں عذر نہ کرے گا۔ علماء کے گھر میں بھی پکائی
جاتی ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لطف یہ ہے کہ اکثر ایسی باتیں ہندوستان
ہی میں رائج ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ مگر اتو یہ ہندوستان
ہی کا ہے۔ اب بس یہ سمجھ کے نہ ہو کہ یہ آج کے دن خدا کا حکم ہے۔ وہ تو ایک
دن میں شرک کے موضوع پر بھی کہہ چکا۔ کہ شرک کا سوال ہزار کام ہوں ان
میں یہ لوگ پیدا نہیں کرتے۔ کسی حاکم کی تعظیم میں یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ کسی اور
بڑے یا مالدار آدمی کی تعظیم ہو یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب رسول کی تعظیم ہو
تو یہ لوگ فوراً وہاں یہ سوال اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ بدعت کا سوال بھی ہے
سویاں کھائیں گے تو بدعت ہو جائے گی اس کے بارے میں میں نے تو نہیں دیکھا
فتویٰ بدعت کا۔ کسی مکتب خیال کے عالم نے فتویٰ دیا ہو کہ یہ بدعت ہے۔
اس سے پرہیز واجب ہے اور اب میں کہتا ہوں کہ اگر عید کی قید سے سویاں
پکتی ہیں۔ ہر جگہ عید کے دن۔ اور بدعت نہیں ہوتیں تو اگر ۲۲ رجب کو کونڈے
بھریں تو کیوں بدعت ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام
کی طرف نسبت ہے۔ اور وہ نسبت بھی جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف
ہے وہ اس معنی سے نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کوئی نذر دینے والا یہ نہیں سمجھتا
کہ امام جعفر صادقؑ کی کوئی حدیث ہے یا انہوں نے کوئی حکم دیا ہے۔ وہ تو تم
اُسے نسبت دے دیتے ہیں امام جعفر صادقؑ کی طرف۔ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ
آج کے دن خاص طور سے شریعت میں وارد ہوا ہے۔ ایک دن جیسے اُس کے
لئے مقرر خود کر لیا ہے ویسے ایک دن اس کے لئے مقرر ہو گیا ہے۔ اور
ہمارے ہاں تو کثرت سے اہل سنت کے گھروں میں بھی امام جعفر صادقؑ

کے گوشے ہوتے ہیں۔ تو اب یہ کہیئے کہ پھر یہ ہوا کیوں۔ ممکن ہے ہمارے جو سابق لیڈر تھے قوم کے ان کا مقصد یہی ہو کہ ہم اس ذریعہ سے کم سے کم ایک امام کے نام کو دوسرے حلقوں میں بھی پہنچا دیں۔ ارے پورے سلسلے کے نام یاد نہ ہوں۔ ایک تو یاد ہو جائے گا۔ اپنے مطلب کے لئے سہی۔ تو ایک یہ کمار مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ اب اس کے آغاز کے وقت تو ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہم نے تو اب دیکھا ہے کہ یہ ہے۔ اس کا نتیجہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ عام ہے۔ مجھے تو کانپور کا حال معلوم ہے۔ کہ فتوے آنے لگے کونڈوں کے خلاف۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ کی طرف نسبت ہے اس لئے بڑے زور سے فتوے آنے لگے۔ بڑے بڑے پوسٹر لگ گئے۔ مگر حضرات اہلِ سُنّت ہی کا وہ طبقہ جو اس پر عامل ہے اُسے کد ہو گئی کبھی تو مکانوں کے اندر ہوتے تھے۔ اب شاہراہِ عام پر شامیانے لگا کر صلائے عام۔ اور شاید پہلے کبھی اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا بلانے میں۔ جتنا اب ہونے لگا۔ کہ لوگ اس میں شرکت کریں۔ اب یہ بھی کہ صاحب شیرینی تو بہرحال شیرینی ہے کچھ لوگ ذوق کام و دہن کے لئے اس میں شریک ہو گئے۔ جو لوگ عامل تھے انہوں نے انہیں اپنے تجربے بتائے کہ ہماری یہ حاجت پوری ہوئی۔ ہمارا یہ کام پورا ہوا۔ اور میں کہتا ہوں خدا نے دعا کا کیوں حکم دیا۔ کیا وہ خوشامد پسند ہے۔ کہ خوشامد کرو معاذ اللہ۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ نہیں چونکہ یادِ الٰہی ہماری تعمیرِ زندگی کا سبب ہے اس لئے اس نے دعا کا حکم دے کر کہا کہ اپنی غرض سے ہی سہی مجھے یاد کیا کرو۔ صلوٰۃ۔

اسی طرح جن ہستیوں کو اسے مرکزِ ہدایت بنانا تھا ان کو مرجع خلائق بنانا تھا۔ طرح طرح سے ان کی طرف بلایا۔ دعوت دی کہ ایسے   نہ اس سے اللہ کا فائدہ ہے نہ اس سے ان کا فائدہ ہے۔ جو ان کے وجود کا فائدہ تھا جو

ان کی ہدایت کا فائدہ تھا اس فائدہ کو اس تصور سے تقویت ہوتی ہے اور اب یہ شرک ہی کے باب کا جز پھر آگیا بدعت میں کہ وہ قوم جو شرک شرک کی آواز بلند کرتی ہے وہ توسیلے کی بھی منکر ہے اور توسل کو بھی کہتی ہے کہ شرک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں قرآن کی آیت پڑھتا ہوں اس کا صرف ترجمہ آپ دیکھئے گا ضروری نہیں ہے کہ کوئی تفسیر بھی آپ دیکھیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ لولا انھم اذاظلموا۔

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا یعنی گناہ کئے تو جاؤک وہ آپ کے پاس آتے۔ وہ آپ کے پاس آتے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ مسجد میں جاتے۔ گناہ کئے ہیں خدا کے اور بھیجا جاتا ہے رسول کے پاس۔ لولا انھم اذا ظلموا انفسھم جاؤک۔ یہ کیوں نہیں ہوا کہ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے۔ یعنی گناہوں کا ارتکاب کیا تو جاؤک۔

آپ کے پاس آتے۔ عربی سے واقف افراد جانتے ہیں ف بلا تاخیر کے لئے آتی ہے۔ پرانے زمانے میں ترجمہ اس کا ہوتا تھا۔ پس۔ اب وہ ہماری اردو پس والی نہیں رہی۔ تو اب وہ مفہوم یوں ادا ہوتا ہے کہ جاؤک فستغفر اللہ۔ یعنی آپ کے پاس آنے پر بات ختم نہیں ہوتی بلکہ آپ کے پاس آکر اللہ سے استغفار کریں۔ آپ کے پاس آتے اور اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے اور اتنا بھی نہیں لیجئے رسول کے پاس آتے ان کے سامنے ان کی بارگاہ میں اللہ سے مغفرت طلب کی واستغفر لھم الرسول۔ اور پھر رسول بھی ان کے لئے سفارش کرتے اس سے۔ رسول ان کے لئے استغفار کرتے۔ لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ پھر پاتے اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا۔

تواب اللہ تو ہے اپنی جگہ تواب۔ اب اگر یہ بات نہ ہو۔ تو کیا وہ تواب

نہیں ہے۔ وہ ہے اپنی جگہ رحیم۔ اگر یہ نہ ہو تو کیا وہ معاذ اللہ اپنی جگہ رحیم نہیں ہے
نہیں یہ اگر نہ ہو تو اس کی وہ توابیت تمہارے شاملِ حال نہ ہوگی۔ یہ نہ ہو تو اس کی
رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوگی۔ لیکن اگر ایسا کرو کہ رسول کے پاس آؤ اور رسول
کے پاس اگر آپ کے سامنے خود استغفار کرو اور پھر رسول تمہارے لئے استغفار
کریں تو اللہ کو پاؤ گے توبہ قبول کرنے والا۔ یہ اس وقت پاؤ گے۔ ہے تو وہ
یوں اپنی جگہ۔ لیکن ان پر فیضانِ رحمت اس وقت ہوگا۔ تو اب یہ کیا ہے۔ یہ
یہ ہے۔ کہ مرکز بنانا تھا ان کو خلائق کا۔ تو اب جب رسول کے لئے قرآن مجید نے
کہا تو دنیا چاہے رسول ہی کو اس نے دیکھا ہو لیکن ہمیں اگر کچھ اور ہستیاں معلوم ہیں
جنہیں اللہ کو منظور تھا مرکز بنانا اور اگر منظور نہیں تھا تو محبت کیوں جزو دین ہے
اور یہ بات بلا تفریق فرقہ سب کے نزدیک مسلم کہ محبت ان کی جزو دین ہے
ہم نہ مانتے ہوں محبت کرنے والا وہ بھی محبت کو جزو دین مانتے ہیں۔ ہے
کہ محبت ان کی ہر مومن کا فریضہ ہے۔ بس نتیجہ میں نکالتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ
ایسے افراد جن کے لئے خالق کو منظور ہو کہ گوشہ نشین رہیں۔ خلق خدا کو ان سے صرف
تعلق نہ رہے یہ ان کی محبت کی دعوت دینا جو متفق علیہ ہے عالم اسلام میں۔ میرے
نزدیک تو اس لئے ہے کہ ان کو مرکز اطاعت بنانا تھا اور ایک نفسیاتی حقیقت
ہے کہ اطاعت محبت کے واسطے سے نہ ہو تو ناخوشگوار اور محبت کے ذریعہ سے
ہو تو لذیذ ہو جاتی ہے۔ کسی راستے پر آپ روز جاتے ہوں لیکن کسی دن پابندی
عائد کر دی جائے کہ تم کو ضرور جانا ہوگا تو اسی دن تکلیف دے گا جانا تو پابندی
ناخوشگوار ہوتی ہے۔ اطاعت لذیذ نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی ایسا جس کی محبت کا
آپ دم بھرتے ہوں وہ کوئی فرمائش کرے تو آپ اسمیں روز سے زیادہ اگر
زحمت ہو تو ایک قسم کی بالیدگی محسوس ہوتی ہے کہ ہم نے بہر حال یہ کام انجام

دے لیا جاتا ہے کتنی مشقت کیوں نہ ہو گی۔ معلوم ہوا کہ وہ زحمت زحمت معلوم نہیں ہوتی جو برائے محبت ہو اس لئے جو افراد مرکزِ اطاعت بنانے تھے ان کو پہلے مرکزِ محبت بنا دیا۔ مثال کے طور پر یہ ہے کہ۔ کوئی وہاں معلوم تھا رسول کو۔ کہ میری اُمّت کی ہر فرد ایسی نہیں ہے کہ وہ گھر میں خادم رکھ سکے۔ تو بعد میں ایک کنیز سپُردگی پہلے ہی دن نہیں دے سکتے تھے کنیز۔ مگر نہیں۔ رسول تو یہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی خاتون اپنے گھر میں چکی بھی پیسے تو وہ فخر محسوس کرے کہ میں وہ خدمت انجام دے سکتی ہوں۔ جو مخدومۂ عالم انجام دیتی تھیں۔ اگر اپنے گھر میں جھاڑو دے تو وہ ذلت محسوس نہ کرے بلکہ عزت محسوس کرے کہ شاہزادی کائنات اور خاتون جنت اپنے گھر میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتی تھیں۔ تو وہاں جو محبت کا قدم بیچ میں آجائے گا تو پھر ہر مشقت خوشگوار ہو جائے گی تو معلوم ہوا کہ انہیں مرکزِ اطاعت بنانا تھا لہٰذا ان کی طرف ہر حیثیت سے نگاہوں کو موڑنا تھا۔ ارے دنیاوی حاجتوں میں کسی کو شک ہو کہ ان کے ذریعے سے کام نکلتے ہیں یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنت کی فکر تو ہر ایک کو ہے۔ کوثر کا شوق تو ہر ایک کو ہے۔ تو اگر کوثر کا شوق ہے تو یاد رکھو کہ ساقی یہ ہے۔ لہٰذا کوثر کے شوق میں ہی اس کی طرف آئے اس کا دامن نہ چھوڑو۔ ارے ہر مسلمان کو جنت میں تو جانا ہے تو یاد رکھو کہ جنت و نار کا تقسیم کرنے والا یہ ہے لہٰذا اس کی طرف آؤ اور یہ حدیث وہ ہے کہ مامون عباسی نے امام رضاؑ سے پوچھا کہ آپ کے جدِ بزرگوار کی فضیلت میں ایک حدیث سُننے میں آئی ہے۔ وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا کیا۔ کہا۔ کہتے ہیں کہ رسول کی حدیث ہے کہ اے علی تم جنت و نار کے تقسیم کرنے والے ہو۔ جنت و نار اللہ کی چیز ہے۔ اُسے دوسرا کون تقسیم کرے گا۔ گویا وہی تصورِ شرک تھا۔ اللہ کو نہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے حکم سے تقسیم نہیں کرے گا ان کو کہہ رہے ہیں۔

مگر یہ جنت و نار کے تقسیم کرنے والے ہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک اور حدیث آپ کے سُنی ہے وہ سمجھ میں آتی ہے یا نہیں وہ جو رسول نے فرمایا کہ یا علی حبك ایمان و بغضك نفاق۔ اب یہ بھی صحاح میں موجود ہے اے علی تمہاری محبت ایمان ہے اور تمہارا بغض کفر و نفاق ہے۔ مامون عباسی نے کہا کہ یہ تو بالکل صحیح ہے یہ تو بالکل مُسَلّم ہے آپ نے فرمایا کہ بس پھر جنت و نار تقسیم تو ہو گئے۔ تو بس یہی ہے کہ امام جعفرؑ کے یاد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نذر کو یہ سمجھ کر نہ کیا جائے کہ یہ حکم شرع ہے۔ ایک چیز کو ہمارے ہاں علماؒ نے روک دیا۔ یہاں معلوم نہیں ایک وقت میں بائیس رجب کے کونڈوں کے ساتھ ایک لکڑ ہارے کی روایت پڑھی جاتی تھی۔ تو اسے علما نے منع کر دیا۔ کہ اس میں نسبت ہے امام کی طرف۔ ایک تو جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ امام کا قول ہے یا فعل ہے تو اس وقت تک یہ افترا و بہتان ہو جائے گا۔ اس لئے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دے دیا۔ ہمارے ہاں کے علما نے چنانچہ ہمارے ہاں سب کے ہاں جہاں جہاں میرے علم میں بائیس رجب کے کونڈے ہوتے ہیں۔ وہ روایت نہیں پڑھی جاتی۔

تو زیادہ سے زیادہ کوئی فضول کہہ دے لیکن اسے بدعت کہہ دینا شرک کہہ دینا یہ بیکار کی بات ہے اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ زیادہ وقت دوسرے جزو پر صرف کروں گا یعنی یہ تو ہمارے ہاں کی تعریف تھی۔ اب دوسرے حضرات، اکثریت والوں کے ہاں بدعت مقابلہ سنت ہے یعنی ہمارے ہاں سنّت تو واجب کے مقابلے میں ہے۔ یہ واجب ہے یہ سنّت ہے۔ وہاں سنّت ایک قرآن کے ساتھ ساتھ بولی جاتی ہے قرآن اور سنّت اور ایک پھر بدعت کے مقابلے میں کہ یہ سنّت ہے اور یہ بدعت ہے اس سنّت کے معنی طریق رسول۔ اور طریق

رسول سے مراد قولِ رسول فعلِ رسول تقریرِ رسول۔ قولِ رسول کے معنی سب جانتے ہیں کہ پیغمبر کوئی حکم دیں۔ فعلِ رسول کے معنی بھی سب نے سمجھ لیئے کہ رسول کوئی کام کریں۔ ہاں تقریرِ رسول۔ تقریر ہمارے ہاں یہ ہونے لگی کہ منبر پر یا سٹیج پر ہوتی ہے تو وہ تو قولِ رسول میں داخل ہوگئی۔ اور وہ منبر پر بھی اگر ہے تو قولِ رسول میں داخل ہے۔ وہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا کوئی کام کرے اور پیغمبر خاموش رہیں منع نہ کریں اس کا نام ہے تقریرِ رسول۔ تقریر کے کیا معنی۔ یعنی برقرار رکھنا جب اس کی رد نہیں کی اس کو منع نہیں کیا تو یعنی برقرار رکھا۔ تو یہ ہے معیار سنّت۔ اور جو سنّت قولِ رسول میں ہو نہ فعلِ رسول میں نہ تقریرِ رسول میں اور وہ انجام دی جائے تو اسے کہتے ہیں بدعت۔ سنّت کے مقابلے میں بدعت۔ اسے میں بھی مان لوں گا کہ ٹھیک ہے۔ سنّت سے مطلب قولِ رسول فعلِ رسول تقریرِ رسول۔ کیا مطلب یہ شکل جو اس وقت آرہی ہے۔ تو اگر یہ معیار ہو جائے سنّت و بدعت کا تو پھر ہمارا حج بھی بدعت ہماری مسجدیں بھی بدعت ہماری نمازیں بھی بدعت۔ سب باتیں ہماری بدعت۔ زندگی ہماری بدعت بلکہ ایک دفعہ۔ ہنڈرسن اسلامیات کے پروفیسر ہیں لندن میں۔ ان کا خاص موضوع ہے۔ شریعتِ اسلام میں ترمیم کی جائے۔ اس موضوع پر وہ ہر جگہ بولتے ہیں۔ یہ ہے ان کا خاص موضوع۔ وہ ہندوستان میں آئے تھے تو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس وقت صدرِ ہند تھے انہوں نے ان سے کہہ دیا کہ علی گڑھ جایئے گا۔ تو میرا نام لے دیا کہ ان سے ضرور ملئے گا۔ تو اب وہ پہلے ہی دن جو آئے تو مجھے تلاش کرنے لگے۔ پوچھنے لگے ایک ایک سے۔ خیر وہ اسلامی قانون کے پروفیسر ہیں وہاں۔ تو ہمارے ہاں قانون کے شعبہ میں ان کے لیکچر کا انتظام ہوا۔ گویا وہ ہم جنس جو تھے تو قانون کے شعبے میں۔ چیئرمین نے مجھے کہلوایا کہ وہ جب سے

آئے ہیں آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا عصر لانے میں آپ آئیے تو وہاں آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں وہاں چلا گیا۔ تو اس وقت سے متعلق جو بات ہے وہ یہ کہ فوٹو کھینچنے لگا۔ تو اس میں انہوں نے مجھے بھی بلوایا۔ تو صاحب میں بیٹھ گیا۔ تو انہوں نے گویا مجھ پر چوٹ کی۔ میری مولویت سے فائدہ اٹھا کر۔ کہ یہ بدعت تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جی بدعت ہے تو پھر میں خود ہی بدعت ہوں۔ تو اگر وہی شکل۔ تو کون عمل ہمارا اسی شکل میں آج ہے۔ رسول کی مسجد ایسی تھی جیسی ہماری جامع مسجد ہوتی ہے۔ رسول کے زمانے میں حج جو ہوتا تھا وہ کیا ان سواریوں پر ہوتا تھا جن پر اب ہوتا ہے اور رسول کے ساتھ نماز جماعت میں کیا اتنا مجمع ہوتا تھا جتنا مجمع ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ تو صاحب اگر یہ معیار ہے تو ہمارا لباس بھی بدعت ہماری غذائیں بھی بدعت۔ ہماری سواریاں بھی بدعت۔ ہماری عبادتیں بھی بدعت۔ تمام زندگی بدعت میں گزر رہی ہے۔ دو چار بدعتیں اور سہی۔ تو یہ معیار نہیں ہے۔ معیار یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ دیکھئے کہ کام وہی ہے یا کام کچھ اور ہے۔ یہ اونٹوں پر جو ہوتا تھا اس کا نام کیا تھا حج۔ اور یہ جو موٹروں پر جا کر کام ہوتا ہے وہ حج کے سوا کچھ اور ہے۔ اگر حج ہی ہے یہ بھی۔ تو وہ اونٹ پر حج تھا اب یہ سواری پر حج ہے۔ موٹروں پر اور ہوائی جہاز پر۔ تو یہ بھی حج ہے۔ جس طرح وہ واجب تھا اسی طرح یہ واجب۔ ارے جو ایک دفعہ کر چکا ہے اس پر وہ بھی سنت تھا یعنی مستحب اسی طرح یہ بھی سنت ہے یعنی مستحب۔ جو حکم اس کا تھا وہی حکم اس کا ہوگا۔ اگر شکل نئی ہے اور بات وہی ہے کام وہی ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ میں نے خود تقریریں سنی ہیں۔ کہ میلاد کے جلسوں میں یہ قمقمے اور یہ اتنی روشنی کا انتظام یہ جھاڑیں اور مقررین کرام آ کر سب کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو ہو رہا ہے یہ کیا ہے ذکر رسول ہے یا کچھ اور ہے۔ اگر ذکر رسول ہے تو

وہ اندھیرے میں ہوتا تب بھی عبادت روشنی میں ہے تب بھی عبادت۔ یہ ذہنیت میرے نزدیک قابل افسوس ہے کہ اپنے گھر میں روشنی ہو تو بدعت نہیں ہے۔ رسول کے ذکر میں روشنی ہو تو بدعت ہو گئی اور اب قرآن میں دیکھئے قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ انہیں ان کا ذکر منظور ہے یا نہیں۔ تو قرآن کہہ رہا ہے ورفعنا لك ذکرك۔ اے رسول ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا ہے۔ ماشاء اللہ صاحبان نظر ہیں۔ میں کہتا ہوں قرآن نے جہاں اپنی وحدت پر زور دینا ہوا ہے وہاں میں کہا ہے موسیٰ سے کہا تھا انا ربك۔ میں تمہارا پروردگار ہوں انما انا اللہ واحد میں ایک اکیلا خدا ہوں۔ جہاں وحدت پر زور دینا ہوا ہے وہاں خدا کہتا ہے جہاں طاقت عمل دکھاتا ہے وہاں ہم کہتا ہے۔ ابھی چند مثالیں عرض کروں گا میں کہتا ہوں طاقت عمل دکھاتا ہے اس ہم میں مخالف طاقتوں کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ دوسری مثال۔ انا اعطیناك الکوثر۔ اے رسول ہم نے آپ کو کثرت نسل عطا کی ہے۔ اب بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتیں ختم ہو جائیں گی مگر آپ کی نسل کو ختم نہیں کر سکتیں۔ بس یونہی کہا گیا۔ ورفعنا لك ذکرك۔ ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا ہے یعنی لاکھ بدعت کے فتوے لگتے رہیں مگر آپ کے ذکر کو کوئی نیچا نہیں کر سکتا۔ تو کام دیکھئے کہ وہی کام ہوتا ہے یا نہیں۔ اب جناب یہ میلاد رسول۔ اس پر جہاں جہاں بدعت کے فتوے لگتے ہوں۔ سب میں بس اتنا غور کیجئے۔ آپ کہتے ہیں ہماری مجلس بدعت بس اسی معیار پر لے لیجئے۔ مجلس میں دیکھئے کام کیا ہوتا ہے۔ آل رسول کا ذکر۔ حالانکہ آل رسول ہی کا نہیں خدا کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ رسول کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجلس حسین کی بدولت انبیاء کا تذکرہ بھی ہوتا ہے مرسلین کا

بھی ہوتا ہے۔ جتنے مقاصد اُس میں ہیں سب پورے ہوتے ہیں۔ اگر مجلس کا صحیح مقصد قائم رہے تو بنیادی طور پر بہر حال وہ بھلا محاورہ ہے۔ ہمارے ہاں رواج ہی ہے کہ جب فضائل بیان ہوں تو انہیں محفل کہتے ہیں۔ مصائب جب بیان ہوں تو انہیں مجلس کہتے ہیں۔ اب یوں تو دنیا والے ریڈیو کی تقریر کو بھی مجلس کہنے لگے۔ اور ہمارے مجلس کے لیے بدعت کے فتوے ہیں اس کے لئے نہیں ہیں۔ تو بہر حال میں تو اپنی زبان جو ہے۔ مجلس کا محاورہ۔ اسی کا ذمہ دار ہوں۔ تو جناب یہ محفل ہو یا مجلس ہو۔ اس میں کیا ہوتا ہے۔ رسول اور آلِ رسول کا ذکر۔ تو اب دیکھئے پیغمبر نے کیا ہے ان کا ذکر یا نہیں۔ مجمع کے بدلنے سے کہ اس وقت دو آدمی تھے اس وقت دو ہزار ہیں۔ اس سے تو کوئی کام بدعت نہیں ہو جاتا۔ ورنہ پھر حج کی تعداد دیکھئے کہ رسول کی زندگی میں حج کرنے والے کتنے تھے۔ اب جب لاکھوں تک تعداد پہنچے تو سمجھئے کہ بدعت ہو گیا۔ تو جبھی کام اگر وہی ہے۔ کرنے والوں کی تعداد بڑھے یا گھٹے۔ کبھی مجلس میں دو آدمی ہوتے تھے اس وقت دو ہزار ہوں۔ اصل نوعیت عمل نہیں بدلتی۔ جیسے نماز جماعت اگر ایک امام اور ایک ماموم ہو تب بھی نماز جماعت۔ اور اگر دس ہزار ماموم ہوں امام کے ساتھ تو نماز جماعت۔ فرق تھوڑی ہوتا ہے تعداد کے بدلنے سے۔ تو اب جس کا نام مجلس ہے اُسے دیکھ لیجئے کہ رسول کے ہاں اس کا نمونہ ہے یا نہیں۔ بس ایک روایت جناب ام سلمہ کی۔ پیغمبر خدا آئے جناب ام سلمہ کے ہاں اور حجرے میں تشریف لے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ وحی نازل ہونے والی ہے کوئی میرے پاس نہ آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں حسین آئے ادھر دیکھا اُدھر دیکھا پوچھا نانا جان کہاں ہیں۔ جو واقعہ تھا۔ وہ انہوں نے بیان کیا۔ کہ آپ حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ کوئی نہ آئے۔ اب اصل واقعہ جو ہے۔ جو لفظیں میری سمجھ میں

آئی ہیں وہ یہ کہ حسین نے یہ پوچھا کہ کیا ہمیں بھی منع کیا ہے۔ بس یہ آواز حسین کی پیغمبر نے سُنی۔ پھر کیا ہوا حسین داخل ہو گئے۔ کوئی بتائے۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جیسے انہوں نے پوچھا کہ کیا ہمیں بھی منع کیا ہے۔ بس پیغمبر نے آواز سُنی فرمایا ام سلمہ میرے حسین کو آنے دو حسین داخل ہو گئے۔ پھر دروازہ بند کر لیا گیا۔ اب تھوڑی دیر میں۔ جناب ام سلمہ کہتی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ رسول گریہ فرما رہے ہیں۔ اب ہر صاحب عقل محسوس کرے کہ جو حجرے کے باہر ہو اور حجرے کا دروازہ بند ہو۔ وہ فقط آنسوؤں کا گریہ محسوس نہیں کر سکتا ماننا پڑے گا کہ صدائے گریہ تھی کہ جو جناب اُم سلمہ نے محسوس کی۔ اور اب یہ دروازے کے قریب آئیں۔ کہا یا رسول اللہ کیا میں آسکتی ہوں آپ نے فرمایا ہاں آسکتی ہو۔ یہ جو گئیں تو ان کا بیان ہے کہ پیغمبر خدا کے سینہ مبارک پر شہزادہ ہے اور زار زار گریہ فرما رہے ہیں انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ گریہ کا کیا سبب ہے۔ فرمایا میرا بچہ جو آیا میرے سینے سے لگا۔ تو ایک ملک نے کہا یا رسول اللہ آپ اس بچے کو چاہتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے یہ ملک کس واقعہ کی کیا خبر دینے آیا ہے۔ ارے وہ تو وقت ولادت حسین خبر دی جا چکی تھی۔ اس دن میں بیان کر چکا۔ کہ شہزادے کو گود میں لا کر دیا گیا۔ اور رسول اللہ نے گریہ فرمایا۔ تو پھر یہ اطلاع دینے کو آیا ہے۔ نہیں اطلاع دینے نہیں آیا۔ کہی ہوئی بات کو دہرانے آیا ہے۔ یعنی اس ذکر کو تازہ کرنے آیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجلس اسی کو کہتے ہیں۔ مجھے حق ہے یہ کہنے کا کہ یہ ملک آیا ہے مجلس حسین کرنے کے لئے۔ اب یہ جو پوچھ رہا ہے۔ یہ سوال ہے۔ واقعی کیا کہا وہ نہیں جانتا کہ محبت کرتے ہیں۔ یہ پوچھنا کیا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں یہ تمہید ذکر کی مرتب کر رہا ہے۔ کیا آپ اس سے محبت فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں خدا گواہ ہے کہ کتنی محبت کرتا ہوں۔ اب ملک کہتا ہے اچھا پھر یاد رکھئے

یہی وہ بچہ ہے جو آپ کے دین کی خاطر شہید ہوگا۔ مصائب کافی تفصیل سے ان سے بیان کر دیئے۔ اب جس وقت رسول بیان ملک سے سن رہے تھے تو ملک ذاکر اور خود رسول سامع۔ اور جب رسول ام سلمہ سے بیان کر رہے ہیں تو اب رسول ذاکر اور ام سلمہ اور خود حسین یہ سامعین ہیں۔ بس دو لفظوں میں حقیقت عرض کرتا ہوں کہ ہماری مجلسوں کے دو ہی کردار ہوتے ہیں ایک کردار ذاکر کا ہوتا ہے ایک کردار سامعین کا ہوتا ہے۔ جو ذاکر کا کردار ہوتا ہے وہ بھی عمل رسول اور جو سامعین کا کردار ہے وہ بھی عملِ رسول۔ تو مجلس کا تو ہر جزو سنت ہے۔ بدعت کہاں قدم رکھے گی اور بس یہیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ رسول نے جب سنا تو وہ روئے تھے یا نہیں۔ رو ہی رہے تھے نا۔ اور آواز کے ساتھ رو رہے تھے رو رہے تھے نا تو اب یاد رکھئے کہ اب گریہ بدعت نہیں ہے نہ رونا بدعت ہے۔ رونا بدعت نہیں ہے۔ اور یہ حدیث ایسی ہے کہ بڑی مشہور شخصیت ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ اک دن سر الشہادتین کا مضمون پڑھ چکا ہوں کہ حسین کی شہادت رسول کی شہادت ہے۔ ان کی دوسری کتاب ہے فتاوئ عزیزیہ۔ وہ لوگوں کے سوالات ہیں اور ان کے جوابات وہ بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ چھپی ہوئی موجود ہے فتاوئ عزیزیہ۔ اس میں کسی نے کہا کہ آپ کا عمل روز عاشورہ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے لکھا ہے کہ جو میرا عمل ہے وہ میں درج کرتا ہوں کہ عصر کے وقت میرے پاس میرے احباب معتقدین مخلصیں عاشورہ کے دن جمع ہوتے ہیں اور فقیر خود منبر پر جاتا ہے اور کچھ احادیث رسول فضائل حسنین میں اور کچھ احادیث جو شہادت امام حسینؑ کے متعلق وارد ہوئے ہیں جیسے حدیث ام سلمہ۔ تو یہ کتنے پائے کی حدیث ہے۔ اس کے بعد کچھ شہادت امام کے حالات بیان کرتا ہوں۔ واقعہ کربلا کے حالات اور کچھ جو خواتین بنی ہاشم نے بعد واقعہ کربلا راتوں کو جنات کی

آوازیں مرثیہ کی سُنی ہیں۔ وہ اشعار بھی درج ہیں۔ راتوں کو۔ آدھی آدھی پہر رات گزرے ہوئے مابین فضا و آسماں۔ اشعار مرثیے کے جو پڑھے جاتے تھے۔ وہ اشعار لوگوں نے درج کر دیئے ہیں۔ کتابوں میں درج ہیں۔ وہ بیان کرتا ہوں اور اس وقت مجھ فقیر پر بھی گریہ طاری ہوتا ہے اور جو حاضرین ہوتے ہیں ان پر بھی گریہ طاری ہوجاتا ہے تو یہ جناب ام سلمہ کی روایت ہے اس کے ساتھ صحیح ترمذی کی روایت ہے بس اسی پر ختم کر دوں گا۔ کہ جناب ام سلمہ نے یہ سُنا۔ حضرت نے فرمایا کہ ملک نے کہا کہ آپ وہ زمین دیکھنا چاہتے ہیں جہاں یہ واقعہ پیش آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کہ زیارت کربلا کی سنت قائم ہو رہی ہے رسول فرماتے ہیں ہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو رسول مشتاق زیارت ہوں ہم نہ ہوں یاد رکھئے حالت گریہ میں جو دُعا ہو وہ اُمید ہے کہ مستجاب ہو یاد رکھئے کہ جو رکاوٹیں زیارت کی راہ میں ہیں اور جو اشخاص حائل ہیں۔ خداوند عالم ان حالات میں انقلاب پیدا کرے۔ تو ملک نے اشارہ کیا زمین کربلا سامنے نمودار ہوئی اب مجلس تفصیل کے ساتھ ہو رہی ہے۔ جیسے مجلس ہو رہی ہو زبانی اور پھر مرقع سامنے آجائے تو اثر مجلس میں اضافہ ہوجاتا ہے اب ملک تفصیل سے کہہ رہا ہے دیکھئے وہ جگہ ہے جہاں خیمے نصب ہوں گے۔ اب جو جو اس نے کہا اپنے وقت میں کہا ہو۔ وہ جگہ ہے جہاں عباس کے شانے قلم ہوں گے وہ جگہ ہے جہاں علی اکبر کے نیزہ لگے گا۔ جو جو کہا ہو اس سب کی تفصیل مجھے کیا معلوم۔ کہ کیا کیا اس نے کہا۔ ایسا تھا کہ رسول پر اتنی دیر سے گریہ طاری تھا اور اب آپ نے فرمایا کہ ملک نے یہ کہا ہے کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹھی خاک کی لی اور مجھے دی ہے کہ یہ خاک ہے اس زمین کی۔ جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھ لینا کہ آپ کا فرزند شہید ہوگیا۔ پیغمبر کی مٹھی میں خاک تھی وہ آپ نے جناب ام سلمہ کے سپرد فرمائی۔ یہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بتانا تھا کہ تم

اس وقت زندہ ہوں گی۔ جناب ام سلمہ نے وہ خاک حفاظت سے شیشی میں رکھ چھوڑی کہ اب کتنا زمانہ گزرا پورا امیرالمومنین کا دور گزرا۔ پھر امام حسن کا زمانہ گزرا۔ امام حسین کی عمر کے دس برس بعد امام حسنؑ گزرے۔ یہاں تک کہ امام حسین نے سفر کربلا کیا اور وہ خاک وہاں ہے اس شیشی میں۔ اب جب حسین سفر پر گئے تو ذریعہ تسلی وہ خاک ہے یہ اسے دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ابھی حسین زندہ ہیں اور اب مدینہ میں رہیں کون کون ایک تو یہی چاہنے والی نانی۔ اور ایک وہ خاتون معظمہ جس نے اپنے چار شیر حسین کے ساتھ بھیج دیئے ارے ایک کو بھی تو اپنے پاس نہیں رکھا۔ وہ جناب ام البنینؑ بیوہ حضرت امیرالمومنین یہ لوگ تو یقینی تھے اور کچھ روائتوں میں ہے کہ ایک بیمار بیٹی بھی تھی اسکو بھی مدینہ میں چھوڑا تھا حسین نے۔ اور میرا دل یہ کہتا ہے کہ یہ روایت ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ام البنین زینب کا ساتھ نہ چھوڑتیں معلوم ہوتا ہے کہ امام کا کچھ کام تھا جو ان کے سپرد کر کے گئے تھے۔ بیمار بیٹی کی تیمارداری۔ تو اب ام سلمہ جب دم الٹتا ہے جا کر خاک کو دیکھتی ہیں تسلی ہو جاتی ہے۔ جا کر فاطمہ صغریٰ کو بھی تسلی دیتی ہیں کہ تمہارے باپ زندہ ہیں۔ تفصیل سے اب عرض کرنے کا موقع نہیں وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب جب سے نمودار ہوا محرم تو کلیجا دل کی الجھن کچھ ایسی بڑھ گئی کہ روز آ کر خاک کو دیکھتی ہیں اور اصلی حالت پر پاتی ہیں۔ مگر راوی نے نہیں بیان کیا آپ سے پوچھتا ہوں جو حالات آپ کو معلوم ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ایسا تو نہیں تھا کہ ساتویں محرم سے جب پانی سامنے آتے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہوں چھاتی ہے سمجھ میں نہ آئے کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ پانی میں کیا خاصیت ہو گئی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ وہاں پانی بند ہو گیا ہے وہاں چھوٹے چھوٹے بچے صدائے العطش بلند کر رہے ہیں۔ غرض اب دس محرم کو۔ صحیح ترمذی کا بیان ہے جناب ام سلمہ کبھی خاک کو جا کر دیکھتی تھیں کبھی فاطمہ صغریٰ کو جا کر تسلی دیتی تھیں صدا دیتی

اسی پریشانی اور تگ ودو میں گزرا۔ عصر سے قبل اپنے حجرے میں خاک پر لیٹ کر سو گئیں۔ اب صحیین کی ایک حدیث ہے۔ بخاری اور مسلم کی متفقہ۔ کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ خواب میں۔ من راء نی فقد رائی فان الشیطن لا یتمثل بصورتی۔ جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے مجھی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔ اب صحیح ترمذی میں جناب ام سلمہ کہہ رہی ہیں۔ خواب میں عصر کا وقت آگیا۔ اب ادھر عصر کا ہنگام آیا اور رسول اللہ سر برہنہ۔ بہت سی باتیں ناواقفیت سے لوگ نہیں سمجھتے۔ صحاح ستہ سب کی مانی ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب سر برہنہ ہونا بھی غم حسینؑ میں بدعت نہیں ہے۔ رسول اللہ سر برہنہ ہیں اور ہاتھ میں ایک شیشہ ہے۔ جیسے اس دن شیشہ تھا اُس میں وہ خاک تھی آج ایک شیشہ ہے جس میں خون جوش مار رہا ہے اور اس کے بعد کیا ہے کہ سر و ریش پر خاک پڑی ہوتی ہے بال بکھرے ہوتے ہیں۔ ام سلمہ خواب میں پوچھتی ہیں یا رسول اللہ یہ کیا۔ فرماتے ہیں۔ تمہیں خبر نہیں میرا فرزند حسین شہید ہو گیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں صبح سے اس وقت تک میں کربلا میں تھا۔ یہ میرے سر و ریش پر خاک کربلا ہے۔ اب جو خاک رسول کے سر و ریش پر ہو وہ پاک نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ فرماتے ہیں یہ حسین اور انصار حسین کا خون ہے۔ اسے میں دن بھر جمع کرتا رہا ہوں۔ اگر یہ خون کبھی کام آنے والا نہیں تھا تو رسول کیوں جمع کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے اسکا مقصد شفاعت ہے۔ اس خون سے شفاعت اُمت کا کام لیں گے۔ ام سلمہ بیدار ہوئیں تو جا کر خاک کو دیکھا۔ اس میں خون جوش مار رہا تھا۔ سمجھ گئیں کہ حسینؑ شہید ہو گئے۔ قبر رسول کے پاس آئیں تو محسوس یہ ہوا کہ قبر تھرا رہی ہے۔ اب خیال ہوا کہ جا کر دیکھوں کہ فاطمہ صغریٰ کا کیا عالم ہے جا کر جو دیکھا تو رُخ ہے عراق کی طرف گریبان پھٹا ہوا ہے۔ اے بابا آپ پر کیا گزر گئی۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

مجلس ششم

خلافتِ الٰہیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً الخ

تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو اس میں فساد پیدا کریں اور خونریزی کریں حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میں نے عرض کیا کہ ملائکہ بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں۔ طالب علم کو حق ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے وہ معلم سے پوچھ لے۔ اب انہوں نے خالق کی بارگاہ میں سوال پیش کیا۔ خالق نے کیا جواب دیا۔ کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اب مجمع میں ماشاءاللہ طالب علم بھی ہیں اور اُستاد بھی ہیں اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد بھی ہیں طالب علمی اور معلمی کے جو تقاضے ہیں ان سے کون واقف نہیں ہے۔ کوئی طالب علم اُستاد سے کوئی سوال کرے۔ اُستاد کہے جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ تو کیا یہ اس سوال کا جواب ہوا۔ ارے جناب طالب علم اگر جرأت رکھتا ہے تو وہ کہے گا کہ جناب والا اسی لئے تو پوچھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں ہم نہیں جانتے۔ اسی لئے تو ہم آپ سے دریافت کر رہے ہیں۔ تو یقیناً کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس سوال کا یہ جواب ہے۔ ہاں اسے ہم سوال کا ٹھکرا دینا کہہ

سکتے ہیں۔ یعنی جواب نہیں دیا گیا۔ مگر جواب یہ کسی رُخ سے نہیں ہے۔ اب آخر اُستاد ہے اور شاگرد سوال کر رہا ہے تو وہ کیوں اس کے سوال کو ٹھکرائے۔ حالانکہ اب اس کے بعد کی آیت قرآن مجید کی پڑھئے تو پتہ چلتا ہے کہ خالق اس سوال کا جواب دے گا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ جواب نہیں ہوا۔ اگر جانتے کہ جواب ہوگیا تو بعد کو پھر کیوں جواب دے۔ تو آخر جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہیں جواب دے دیا گیا۔ وہ سوال کر رہا ہے اُسے سمجھا دیا جائے جواب دے دیا جائے۔ اور پھر جواب بعد میں دیا گیا تو کب۔ تو ہم اس آیت کے بعد بلا فاصلہ دوسری آیت پڑھتے ہیں وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صٰدقین قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم قال یاٰدم انبئھم باسمائھم فلما انباھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون۔

اب پوری آیت فوراً اس آیت کے بعد یہ دوسری آیت جتنی زیادہ روانی کے ساتھ پڑھو اتنی ہی جلدی اس آیت کے بعد یہ آیت آجائے گی۔ مگر کیا خود مضمون آیت کو دیکھئے۔ یہ واقعہ فوراً اس کے بعد ہوا؟ وہ اس وقت کی بات ہے جب آدم کا پتلا ابھی آب و گل میں بھی نہیں ہے۔ یہ خلقت آدم کا سوال ہے تو یہ واقعہ جو بیان ہوا اس آیت میں نظر آرہا ہے یہ جب آدم کا پتلا بصورت انسان ذی روح عالم ظہور میں آگیا۔ انسان مکمل کی شکل میں جب وہ جلوہ آرا ہو چکے تب وہ دوسرا واقعہ پیش آیا تو میں کچھ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ کتنے ہزار برس کا فاصلہ بیچ میں ہے۔ کتنی مدت درمیان میں گزری۔ اس وقت پھر اس وقت والے سوال کا جواب خالق دے گا۔ تو جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہ جواب دے دیا جائے۔ مگر ماشاءاللہ ارباب فہم ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر ابھی اللہ مصالح اور اسباب سمجھانے لگے تو ایک

صورت شوریٰ قائم ہو جائے تو جیسے اس موضوع پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ انہوں نے سوال کیا اللہ سمجھانے لگا۔ یہ وجہ ہے   صورت شوریٰ قائم ہو جائے۔ تو اس وقت جواب نہیں دیا گیا۔ میں تو اپنے انداز میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ جیسے خالق نے کہا۔ منصب میرا مقرر کرنا میرا کام تم کون صلوٰۃ۔

اب اگر خطاکار انسان ہوتا تو جم جاتا کہ بغیر سمجھے ہٹوں گا نہیں۔ مگر یہ بے چارہ معصوم ملک ہے۔ خالق نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اس نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا کہ ہاں منصب اس کا ہے مقرر وہ کر رہا ہے ہمیں نہیں بتانا چاہتا کہ اس کے کیا اسباب ہیں تو اسمیں دخل دینے کا ہمیں کیا حق۔ خاموش ہو گیا مگر خالق کے ذمہ گویا فریضہ تعلیمی قرض رہا۔ یعنی بحیثیت معلم جو اس کو جواب دینا چاہیے تھا وہ نہیں دیا گیا چنانچہ اب جب آدم عالم وجود میں آچکے تو اب خالق نے اس دن کے سوال کا جواب دینا چاہا۔ بڑے انتظام و اہتمام سے اور اس کے لئے گویا خاص انتظام کیا۔ وہ کیا۔ وعلّم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی۔ قدم قدم پر مفسرین کو دقت پیش آتی ہے اور مجھے ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ باسماء ھؤلاء ان کنتم صدقین۔ وہ جیسے خلیفہ میں الجھن پیدا ہوتی تھی کہ کس کا خلیفہ۔ اب یہاں کہا اللہ نے کہ آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے۔ اب مفسرین نے اسماء دیکھا کلھا دیکھا۔ اسماء پر جو الف لام ہے اُسے نہیں دیکھا تو ترجمہ کر دیا کہ سب نام سکھا دیئے۔ اب سب نام سکھائے تو جناب کیڑے مکوڑوں کے بھی نام جڑی بوٹیوں کے بھی نام۔ ہر خار و گل کا نام ہر کس و ناکس کا نام۔ غرض ایک ذرہ سے لے کر ستارہ ہائے فلک تک جو کچھ کائنات میں ہے سب کے نام سکھا دیئے۔ یعنی ایک فرہنگ اور لغت آدم کو بتا دی۔ کیونکہ سب نام۔ اسما بھی اور پھر کلھا بھی۔ سب اور سب ہیں تو پھر سب۔ جو جو ذہن میں آئے وہ سب اور جو ذہن

میں نہ بھی آتے وہ بھی سب۔ کیونکہ بتانے والا خدا ہے وہ ہمارے ذہن کا پابند تھوڑی ہے لہٰذا جتنے نام ہم نہیں بھی جانتے وہ بھی۔ اور پھر ازل سے لے کر ابد تک سب نام سکھا دیئے آدم کو مگر اب بعد میں جو آئے گا اس کے ساتھ یہ بات بالکل نہیں کھپتی اب یہیں سے بتا دوں کہ غلطی کہاں ہوئی۔ وہ میں نے ابھی اشارہ کیا تھا کہ انہوں نے الف لام کو نہیں دیکھا۔ اب میں دیکھئے ترجمہ کرتا ہوں۔ سب کے لفظ کو میں چھوڑوں گا نہیں۔ اس سے ٹکراؤں گا بھی نہیں اور پھر بھی دیکھئے کہ وہ سب ہو جاتے ہیں محدود دیا نہیں الف لام۔ الف لام کی قسمیں عربی میں بہت سی ہیں۔ ایک ہوتا ہے استغراق کا خود اس کے معنی سب کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ استغراق کا ہوتا تو کلھا کہا ہی نہیں جاتا کیونکہ استغراق تو خود الف لام میں ہے۔ خصوصاً جب جمع پر داخل ہو۔ عربی دان حضرات جانتے ہیں۔ تو وہ استغراق تو پھر اڑ جاتا ہے۔ پھر کلھا کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب اور جو قسمیں ہیں اس سے بحث اس وقت نہیں۔ ایک الف لام کی قسم ہے عہد۔ عہد کے معنی ہوتے ہیں کچھ خاص اشیا یا افراد کی طرف اشارہ۔ اس کی ایک روزمرہ کی مثال آپ کو دے دوں۔ یوم کے معنی کوئی سا دن اور الیوم کے معنی آج یہ الیوم تو آپ بہت سنا کئے ہیں۔ ایک جانی پہچانی آیت میں۔ الیوم ہی سے شروع ہوتی ہے۔ تو اس کا ترجمہ کیا آج۔ یہ یوم کے معنی آج کہاں سے ہو گئے۔ یوم کے معنی آج کہیں نہیں ہیں۔ کسی لغت میں یوم کے معنی آج کے آپ کو نہیں ملیں گے۔ تو یہ آج کے معنی پیدا ہوئے الف لام سے۔ بالکل لفظی معنی ہیں الیوم یعنی یہ سا دن۔ اب یہ سا دن فارسی میں ہو تو بالکل یہی ترجمہ ہے امروز۔ ہمارے ہاں اس کے لئے منفرد لفظ موجود ہے۔ یہ دن یعنی آج۔ تو اسی طرح الیوم کے معنی ہو گئے آج۔ تو جب الف لام کے یہ بھی معنی ہیں۔ اشارے کے۔ تو اب جو ترجمہ میں کروں اسے دیکھئے۔ آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔ دیکھئے

سب گیا تو نہیں۔ آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔ وہ سب نام کیا۔ وہ نام۔ جنہیں فرشتے لاکھوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ کیونکہ ابواب جنت پر لکھے ہوئے تھے۔ عرش پر لکھے ہوئے تھے؛ حورعین کی پیشانیوں پر اکثر لکھے ہوتے تھے۔ تو ان ناموں کو تو فرشتے نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھے ہوئے تھے۔ تو انہیں تو ملائکہ جانتے تھے۔ ناموں سے خوب واقف تھے۔ تو وہ نام تھے جو فرشتوں کو پہلے ہی سے معلوم تھے۔ کیونکہ آدم مدرسہ قدرت میں آج طالب علم آیا ہے۔ وہ پرانے طالب علم جو نام ان کے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ وہ سب نام آدم کو بتائے۔ وہ سب یعنی ان ناموں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔ اور اسی سے اب بعد میں جنہوں نے شروع میں ٹھوکر کھائی۔ اور بعد میں بھی ٹھوکر کھاتے چلے جائیں گے۔ تو اب جناب انہوں نے کہا کہ سب نام۔ اب اس کے بعد۔ بعد میں سمجھ ہی میں نہیں آئے گا۔ ثم عرضھم علی الملٰئکۃ۔ پھر ان لوگوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ اب یہاں ھُم انہیں نظر ہی نہیں آیا۔ ھُم ذوی العقول کی ضمیر ہے۔ چیزوں کو ھُم نہیں کہتے انسانوں کو ھُم کہتے ہیں۔ جو صاحبانِ عقل ہوں۔ جانوروں کو بھی ھُم نہیں کہتے صاحبانِ عقل کے لئے ضمیر ہے جس کا ترجمہ ہمارے ہاں لوگ ہی ہوئے۔ ان لوگوں کو پیش کیا۔ اب یہ لوگ کہتے تو پھنستے۔ کہ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ لہٰذا مصلحت یہی دیکھی کہ اس مقام پر سب عالم جاہل بن جائیں۔ جیسے ھُم کے معنی ہی نہیں جانتے۔ لہٰذا کہہ دیا کہ وہ سب نام ان کے سامنے پیش کر کے پوچھے کہ یہ نام بتاؤ۔ اب یہاں جو میں نے عرض کیا اُس سے قطع نظر کیجئے تو بڑا سوال ہے۔ طالب علم کے ذہن میں ہر صاحب عقل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر امتحان ایسا ہو کہ ایک طالب علم کو تو چپکے سے سب بتا دیا اور اس کے بعد سب طالب علموں کو بلا کر پوچھا۔ بتاؤ یہ سب۔ تو یہ امتحان سازشی ہوگا یا نہیں۔ میری تو زندگی

یونیورسٹیوں میں گزری ہے۔ تو ایک لفظ کہوں کہ ایک طالب علم کو پرچہ آؤٹ کر دیا۔ مگر بس ایک کے لئے اور اسی کو بلا کر امتحان سب نکال لیا۔ کہ بتاؤ تو۔ تو اس طرح کا امتحان جائز ہوگا تو جو ہم ایسے ناقص عقلوں کے لئے جائز نہیں۔ وہ اس کامل علم کے لئے جائز کیسے ہو سکتا ہے۔ اور پھر آدم کی بلندی ثابت کیا ہوگی۔ تو یہ سب غلطی ہوئی یہ جو الف لام کو نہ سمجھا۔ سب نام سکھائے۔ تو سب نہیں: بلکہ وہ نام جو ان کے دیکھے ہوئے تھے۔ کوئی ثبوت بھی نہیں ہے از روئے قرآن۔ اس کی ضرورت بھی نہیں کہ الگ بٹھا کر فرشتوں سے۔ صیغہ راز میں بتائے ہوں وہ نام۔ اس لئے فرشتوں کے سامنے ان کو وہ نام جو نام ان کو معلوم تھے وہ بتا دیئے آدم کو۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس طرح بتا کر معیارِ تعلیم برابر کیا تاکہ جو انہیں معلوم ہے وہ ان کو بھی تو معلوم ہو جائے۔ اور اب اس کے بعد وہی نام تھوڑی پوچھے جا رہے ہیں جو نام ابھی بتائے تھے۔ وہ بتاؤ تو۔ ماشاء اللہ یہ کیا محل ہے۔ یہ تو حافظہ کا امتحان ہوا یعنی ابھی ابھی تو بتا گئے ہیں نام اور ابھی پوچھ رہا ہے کہ نام بتاؤ۔ کہ بھولے تو نہیں۔ تو یہ تو حافظے کا امتحان ہوتا ہے۔ مگر حافظے کے امتحان کا یہ محل ہی نہیں ہے کیونکہ امتحان کا ایک فریق فرشتہ ہے۔ یعنی فرشتوں کی قوم ہے۔ جن کے ہاں سہو و نسیان کو کوئی صحیح نہیں سمجھتا۔ ارے انبیاء میں سہو و نسیان کو کوئی تصور کرتا ہو ہم تو وہاں بھی تصور نہیں کرتے۔ لیکن ملائکہ میں تو کوئی سہو و نسیان کو داخل نہیں سمجھتا۔ اب جب ایک فریق ایسا ہے جہاں بھولنے کا سوال ہی نہیں ہے تو اب حافظے کے امتحان کے کیا معنی۔ تو اب صورت واقعہ کیا ہے۔ اگر یہ صاحبانِ علم الفاظ قرآن پر غور کرتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ الگ سے کسی تفسیر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چاہے پھر پورے طور سے معمہ حل نہ ہوتا۔ مگر اصل مفہوم تو سمجھ میں آ ہی جاتا۔ آدم کو وہ سب نام سکھائے۔ اب وہ نام نہیں پوچھے جاتے ثم عرضھم۔ پھر ان اشخاص کو سامنے

پیش کیا گیا فقال انبئونی اگر فقط نام پوچھے جاتے تو ھٰذا الاسماء کہا جاتا۔ پھر یہ نام بتاؤ جو میں نے سکھائے ہیں۔ دیکھو ان لوگوں کے نام مجھے بتاؤ۔ ان کنتم صادقین یہ قول والا صادق نہیں۔ یعنی اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم زیادہ مستحق ہو۔ انہوں نے کب کہا تھا کہ ہم زیادہ مستحق ہیں۔ مگر تمہارا تصور اگر یہ ہو۔ اپنی کم علمی سے۔ ان کی عصمت عمل غلط کو مانع ہے۔ مگر احاطہ علمی ان کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا علم کی کمی کی بنا پر اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ تمہیں حق ہے اس منصب کا۔ تو ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ میں نے کہا کہ چاہے بعد میں مفسرین کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ لوگ کون تھے مگر لفظی معنی تو ہر صاحب علم کو سمجھنے چاہئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سمجھ میں نہ آسکے کہ کون۔ کوئی تو تھے جن کو پیش کیا اور وہ جنہیں پیش کیا آدم تو تھے نہیں۔ فرشتے بھی نہیں۔ کیونکہ وہ معرض امتحان میں ہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ کسی نوع خلقت کے اعتبار سے آدم سے پہلے ملائکہ کے علاوہ کوئی صاحب عقل مخلوق موجود تھی۔ تو اب کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ میں کہتا ہوں اتنا تو سمجھ لو کہ وہ جو بھی ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ ان کی معرفت معیار فضیلت انسان ہوئی۔ صلوٰۃ۔

اب امتحان بالکل با اُصول ہے۔ حافظہ کا امتحان نہیں ہے۔ ذہانت کا امتحان ہے۔ فرشتوں کو وہ نام پہلے سے معلوم۔ میں نے کہا ابواب جنت پر دیکھ چکے۔ عرش پر دیکھ چکے۔ آدم کو ابھی بتائے ہیں۔ اس طرح نام تو سب سُنا دیتے مگر صورتیں آدم کو نہیں دکھائی گئی ہیں۔ اسے کسی قدرتی انداز میں۔ ہم اس کی حقیقت کسی کو نہیں بتا سکتے۔ کسی قدرتی انداز میں۔ وہ صلب آدم میں آئیں گے۔ مگر یہ کہ ان کی صورتیں دیکھی تھوڑی ہیں۔ کسی عالم میں کچھ نور دیکھتے ہیں۔ مگر نام دیکھے تو الگ۔ صورتیں دیکھیں تو الگ دیکھیں۔ یہ کبھی نہ انہوں نے پوچھا نہ بتایا گیا کہ کون کس کا نام ہے۔ اور جناب ہمارے لئے یوں بھی مشکل ہے کہ ہم جو نام رکھتے ہیں اس

میں تناسب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ مثل مشہور ہے برعکس نہند نام زنگی کافور۔ زنگی ہے کالا کافور ہے سفید مگر زنگی کا نام کافور رکھ دیا۔ دیوان متنبی جنہوں نے پڑھا ہے۔ غالباً وہیں سے لوگوں نے۔ کوئی متنبی کے دیوان کا حافظ تھا۔ وہیں سے لوگوں نے یہ مثل بنائی ہے کہ نام زنگی کافور۔ اب میں یہاں جانے پہچانے دو نام بتاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ مجمع میں کوئی اس نام کے ہوں مگر واقف نہیں ہوں۔ بطور مثال کہہ رہا ہوں خدانخواستہ کسی پر چوٹ کرنا مقصود نہیں کہ پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام فدا الدین رکھ دیا۔ اب کیا ضروری ہے کہ بہادر بھی ہوں۔ یہ بعد میں ثابت ہوگا کہ بہادر ہیں یا نہیں ہیں۔ ماں باپ نے تو بس نام رکھ دیا اور وہ عمر بھر فدا الدین کہلائیں گے۔ چاہے کارنامے بھی سامنے آجائیں۔ یا مثلاً بدصورت بچے کا نام شمس الدین رکھ دیا۔ آفتاب رکھ دیا۔ ماہتاب رکھ دیا۔ یا کچھ رکھ دیا۔ نام میں تناسب سے کوئی بحث نہیں لیکن یہ جب ہے جب ہم نام رکھیں۔ اور جن کے نام بھی خدا رکھتا ہو۔ تو اس کے لئے واقعات بھی ہمارے سامنے ہوں کہ بچہ پیدا ہوا ہے اور بزرگ خاندان نام نہیں رکھ رہے ہیں۔ وحی کا انتظار ہے۔ جو واقعی اس خاندان کا بزرگ ہے وہ نام رکھے تو جناب نام اسی کے رکھے ہوئے اور یہ وہ نام ہیں جو عرب میں نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی نام کسی کا بعد میں صدیوں چلتا ہے تو کسی کو کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ جو نام عمومی عرب میں ہوا کرتے تھے۔ ان میں سوال کیا کہ کس کے نام پر رکھا۔ جو نام قدرت کی طرف سے کسی کو پہلے پہل دیئے گئے ہوں وہ نام جب رکھے جائیں گے تو کہا جائے گا کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ لیکن جب خالق نام رکھے گا وہ بے جوڑ نہیں ہو سکتے بس قوت نظر کی ضرورت ہے۔ تاڑنے والی نگاہ ہونی چاہیئے۔ امتحان یہی ہے کہ ایک طرف تو نام بتا دیجیے اور اب یہ صورتیں تمہارے سامنے

پیش کر رہا ہوں تمہارا امتحان یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ کون کس کا نام ہے یعنی اپنے ذہن سے اسم اور مسمیٰ میں مطابقت کرو۔ یہ بات بتائے ہوئے سبق سے باہر تھی۔ جو بتایا تھا اس سے باہر تھی۔ ہمارے ہاں کوئی سوال کورس سے باہر آجائے تو جاکر فریاد کرتے ہیں کہ جناب یہ کورس کے اندر نہیں ہے۔ اب وہاں فرشتہ۔ ذہانت کا سوال۔ تو جناب یہ سوال کیا گیا کہ ان کے نام بتاؤ۔ کون نام کس کا ہے بتاؤ۔ بے چارے ملک نے کہا لا علم لنا الا ما علمتنا۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم سوا اس کے جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ اُسے بھولے ہوں تو مجرم۔ معلوم ہوا کہ سوال بتائے ہوئے سے باہر ہے۔ لا علم لنا الا ما علمتنا۔ سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتایا۔ تو بے چارہ ملک ہماری گرامر عربی کی جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ وہ پڑھا ہوا تھوڑی ہے۔ اسے بس ایک ہی ترکیب معلوم ہے۔ ایک لا اور ایک الا۔ وہ لا اور الا کی ترکیب۔ بس ایک عدد لا آیا ایک عدد الا آیا جملہ بن گیا۔ لا علم لنا الا ما علمتنا۔ ہم کو کوئی علم نہیں ہم کو سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتایا۔ وہی جملہ اس نے احد میں کہہ دیا۔ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔ لا علم لنا الا ما علمتنا۔ وہی معلوم ہے جو تو نے ہمیں بتایا۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں کہ ہم بتائے ہوئے سے زیادہ بتا سکیں۔ اب ارشاد قدرت ہوا۔ للکارا فطرتِ انسانی کے نمائندہ کو۔ اے آدم تو تو انسان ہے۔ تیری صفت خاص ہے معلومات سے مجہولات کا پتہ چلانا۔ فکر و نظر کے معنی یہی ہیں کہ جو معلوم ہے اس سے نامعلوم کا نتیجہ نکالنا۔ فرشتوں کو بتا دے کہ کون کس کا نام ہے۔ بس آدم بڑھے اور انسانی ذہن سے فطرت انسانی سے انہوں نے اسماء اور مسمیات میں نسبت دیکھی۔ مناسبت دیکھی نام میں اور شخصیت میں۔ اور فرفر بتا دیا کہ یہ اس کا نام۔ یہ اس کا نام۔ کہیں پر کوئی غلطی نہیں کی۔ کہ نمبر کٹ جائیں یا بالکل

کوئی نمبر نہیں کٹا۔ سو میں سو کامیابی۔ سب ناموں کو مطابق کر کے بتا دیا۔ اب وہ جو میں کہہ رہا تھا۔ اس دن کے سوال کا جواب۔ خالق نے اب اس دن کے سوال کا جواب دیا۔ دیکھا تم نے۔ آلم اقل لکم۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ ماشاء اللہ مجمع میں دو ایک کو تو پہچانتا ہوں۔ ماشاء اللہ اہل منبر ہوں گے۔ مقررین ہوں گے تو ان سب کو میں ایک حجت دے رہا ہوں۔ ہم اکثر حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملے کی حدیث ہے اور اگر حضور نے مثلاً بیان کی ترجمہ کیا۔ تو بہت سے جملے اس کے ساتھ استعمال کئے جو اس حدیث سے سمجھ میں آتے ہیں مگر الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ کوئی بحث کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ جز کا ہے کا ترجمہ ہے۔ وہ ایک جملہ ہے۔ آپ نے دس جملوں میں اس کا ترجمہ بیان کیا۔ تو تحت اللفظی اعتبار سے کوئی ہم سے بحث کرے تو وہ ہماری زبان پکڑ سکتا ہے کہ آپ نے کہا کہ ارشاد رسول ہے تو ارشادِ رسول تو بس اتنا ہے۔ تو آپ نے یہ سب کچھ جو کہہ دیا یہ کہاں ارشادِ رسول ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں روایت نہیں آیاتِ قرآن میں۔ جو اس دن کہا تھا وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اور اس دن جو یہ مختصر جملہ کہا تھا کہ انی اعلم مالا تعلمون۔ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بس اتنا کہا تھا۔ خود اس نے بتایا ہے۔ یہ کلام بھی اس نے نقل کیا اور آج فرشتوں سے کہہ رہا ہے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون۔ یعنی اب یہاں جواب میں زور پیدا کرنے کے لئے اس اجمال کو تفصیل سے بدل دیا۔ وہاں دو ہی لفظ میں جو لپٹا ہوا تھا اُسے یہاں صاف کر کے کھول کر کہہ دیا۔ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس دن اتنا کہا تھا اور آج کہہ رہا ہے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب بھی جانتا ہوں۔ اور اسے بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اُسے بھی

جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو۔ حضور والا تمام اہل منبر یہ یاد رکھیں کہ ہمیں اور آپ کو نقل بالمعنیٰ کا حق دے دیا گیا۔ صلوٰۃ۔

مثال کے طور پر عرض کروں ایک جانی پہچانی حدیث قدسی۔ وہ یہ ہے کہ لولاک لما خلقت الافلاک خالق کا خطاب ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے ہمارے رسول۔ تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرتے۔ اب ہر صاحبِ فہم غور کرے کہ یہاں خاص آسمانوں کی کوئی خصوصیت بیان کرنا ہے کہ آسمان ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرتے۔ تو اب جدید فلسفۂ سائنس میں اگر آسمان کچھ ہے نہیں۔ صرف حدِ نظر ہے۔ تو پھر یہ افلاک ہی قابلِ بحث ہو گئے۔ کہ لما خلقت الافلاک کیا معنی۔ مگر یاد رکھئے کہ تصورِ انسانی میں افلاک محیط کل ہیں یعنی سب کو گھیرے ہوئے ہیں افلاک۔ تو یہ کہنا کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہ کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی پیدا نہ ہوتا۔ جو شے سب پر حاوی ہے اس کا نام لے کر سب کا مطلب ادا کیا۔ اب اصل حدیث اتنی ہے اور میں کسی دن اپنے زورِ بیان میں یہ کہہ دوں کہ خالق نے خطاب کیا کہ آپ نہ ہوتے تو زمین بھی نہ ہوتی کوہ نہ ہوتے آفتاب نہ ہوتا آپ نہ ہوتے تو ماہتاب بھی نہ ہوتا ستارے بھی نہ ہوتے۔ اب کوئی میری زبان پکڑے مجھ سے مطالبہ کرے کہ یہ کہاں ہے تو میں یہ کہوں گا کہ وہیں ہے جہاں لولاک لما خلقت الافلاک ہے۔ وہ اجمال ہے میں نے اُسے تفصیل سے بدل دیا۔ اب آجائیے اس پر کہ انی اعلم مالا تعلمون۔ کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ یعنی میں آسمان و زمین کے غیب کو جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو وہ بھی جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی جانتا ہوں۔ ملک بےچارہ وہ معصوم تو ہے ہی۔ خاموش ارے اس دن بھی خاموش رہا تھا۔

مگر اس دن خاموش رہا تھا ادب سے۔ آج خاموش ہوا ہے سمجھ کے۔ دل کی خلش دور ہو گئی۔ اس طرح سوال کا جواب آج دیا گیا۔ مگر فرشتے ہو گئے خاموش۔ میں ناقص نقصان ہوں میں نہیں خاموش ہوتا۔ میں اب فرشتوں کا وکیل ہوا جاتا ہوں فرشتوں کی طرف سے وکالت میں کرنے لگتا ہوں۔ وہ کیا۔ میرے ذہن میں ابھی خلش ہے۔ میں کہتا ہوں سوال ملک میں دونوں پہلو عمل سے متعلق تھے۔ خونریزی اور فساد بھی کردار سے متعلق چیز۔ اور تسبیح و تقدیس بھی کردار سے متعلق چیز۔ یہ امتحان آدم میں علمی بلندی ثابت ہوئی تو پھر بالواسطہ نتیجہ نکالیں کہ جس کا علم بلند ہوگا اس کا عمل بھی بلند ہوگا۔ یہ بہت منطقی ہیر پھیر کا راستہ ہے کہ یہ نتیجہ نکالیں حالانکہ بجا ہے کتنے مشاہدے ہوں علمائے بے عمل بھی پھر نظر آتے ہیں ورنہ مذمت کیوں ہوتی حدیثوں میں علمائے بے عمل کی۔ بہر حال میں کہتا ہوں کہ علمی بلندی ثابت ہوئی۔ عمل میں بلندی اب ثابت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اتنا جواب تھا فوراً دے دیا گیا۔ جلدی اُسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا ڈر ہو۔ اور وہ عالم الغیب وہ قادر مطلق۔ جو امکانات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ نہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بھی جانتا ہے کہ پورا جواب ابھی نہیں ہوا۔ مگر اس میں بھی ہزاروں برس کا انتظار ہوا ہے گویا کہہ رہا ہے ہم سے بھی اگر ہم میں سمجھ ہو تو کہ آج آدم کے ذریعہ سے ہم نے علم میں بلندی ثابت کر دی۔ اب آنے دو ایک فخر آدم کو۔ تو اس وقت۔ تو یہی جو ملک سے بھی عمل کی منزل میں اقرار لے لیا جائے کہ جو انسان کر سکتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا وہاں تو ہزاروں برس۔ یہاں بھی ہزاروں برس سہی۔ آنے دو ایک ایسے کو۔ وقت آ گیا جب شب ہجرت۔ اب یہاں میں نام نہیں لوں گا۔ جو بحث ہے ملک اور انسان کی وہی کہوں گا۔ وہ وقت آ گیا جب شب ہجرت ایک انسان علی کہنے میں وہ لطافت نہیں ہے۔

جو انسان بکھنے میں ہے۔ جب شب ہجرت ایک انسان جس کا نام علی ہے۔ ایک انسان رسول بنا ہوا حکمِ خدا سے پیغمبر کے بستر پر لیٹا ہے اور حکم تو تھا لیٹنے کا مگر یہ سو بھی گیا ہے حکم ادھر سے لیٹنے ہی کا ہو سکتا تھا۔ سونے کا حکم ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ شریعت افعال اختیاریہ ہی سے متعلق ہو سکتی ہے۔ لیٹنا اپنے بس کی بات ہے سونا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ لیٹنا فعل ارادی ہے سونا فعل ارادی نہیں ہے لیٹ جانے کا حکم ہے مگر سو بھی جائے حکم سے یہ ناممکن ہے یہ سونا تو کیفیت نفس سے متعلق ہے۔ اگر نفس مضطرب ہو گا تو نہیں سوئے گا اور نفس اگر مطمئن ہو گا تو سو جائے گا۔ اب مجھ سے کوئی گواہ مانگے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ایسی بات جو بس آدمی خود ہی جانتا ہو دوسرے کو علم ہی نہ ہو سکے تو اسمیں شرعاً بھی خود اس کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔ گواہوں کا مطالبہ اسمیں غلط ہے راوی لیٹنا دیکھ سکتا ہے راوی سونا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جو لیٹتا ہے وہ خود بتلائے گا کہ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا تو خود اس نے بعد میں بتایا ہے کہ جیسی نیند شب ہجرت سویا ایسی کبھی نہیں سویا۔ ہمیں حیرت ہے کہ کیونکر سو رہے ہیں ہمارے ہاں تو محلے میں کوئی کھٹکا ہو جاتے تو نیند اڑ جائے چہ جائیکہ اپنے گھر کے گرد کھنچی ہوئی تلواریں اور چمکتے ہوئے نیزے اور اس میں ایسی گہری نیند کہ کبھی نہیں سوتے تھے اور وہ جو رات کو کبھی سونے کا عادی نہ ہو وہ کیونکر سویا۔ جس کی رات محراب عبادت میں گزرتی تھی یہ آج لٹا دیئے گئے میں کہتا ہوں کہ یہی تو راز ہے سونے کا کہ جس کے لئے روز جاگتا تھا اسی کے لئے آج سو رہا ہے۔ بس یہ سو رہے تھے اور جاگنے والا دیکھ رہا تھا۔ اُسے تو کبھی نیند آتی ہی نہیں لا تاخذہ سنۃ ولا نوم۔ وہ دیکھ رہا ہے اور اب دیکھا کہ رئیس الملئکۃ۔ ان میں نسلیں بدلتی تھوڑی ہیں جو اس وقت تھے وہی اس وقت ہیں۔ تو ان میں منتخب کیا جو ممتاز ہیں ——

سید الملٰئکۃ جبرئیل اور ویسے ہی ممتاز ملک جناب میکائیل۔ اب یہ جناب جو عرض کر رہا ہوں یہ ادھر ادھر کی کتابوں کی بات نہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی حلیۃ الاولیاء میں یہ حافظ وہ حافظ قرآن نہیں۔ یہ حافظ علم حدیث کی اصطلاح ہے جو تیس ہزار چالیس ہزار ستر ہزار حدیثیں متن وسند کے ساتھ حفظ رکھتا ہو اُسے حافظ کہتے ہیں۔ چنانچہ چودہ سو برس کے علماء میں بڑے بڑے علماء ہیں مگر حافظ چند ہیں۔ صحاح ستہ کے مصنفین حافظ نہیں کہلاتے جو فقہ میں امام کہلاتے ہیں وہ حافظ نہیں کہلاتے۔ حافظ صرف چند ہیں۔ ابن حجر حد ہیں ایک نویں صدی میں ہیں۔ دسویں صدی تک وہ علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ کے مصنف۔ اور ایک ان سے بھی پہلے ابن حجر عسقلانی وہ ساتویں صدی کے آدمی ہیں کہلاتے ہیں حافظ ابن حجر۔ لوگ دھوکہ کھاتے ہیں ان کو حافظ ابن حجر کہہ دیتے ہیں۔ تو وہ ناواقف ہیں تو حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جو اصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے مصنف ہیں اور شرح صحیح۔ البخاری کے مصنف ہیں اور بہت کچھ ہیں)۔

سب سے آخر میں سیوطی۔ حافظ جلال الدین سیوطی۔ یہ دسویں صدی کے آخر کے ہیں۔ ان کے بعد سے کوئی حافظ نہیں ہے۔ حافظ سیوطی کو اپنے مطلب کی وجہ سے لوگ گھٹانے لگے ہیں کہ وہ رطب ویابس لکھ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے کچھ ہمارے مطلب کی باتیں زیادہ لکھی ہیں۔ لہٰذا دنیا والے کہتے ہیں کہ سیوطی کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ تو جو اپنے مطلب کی باتیں کم لکھے کسی کے مطلب کی باتیں زیادہ لکھے وہ گویا بس سب کچھ لکھنے لگا۔ تو حافظ ان کا امتیاز خاص ہے تو اب یہ حافظ ابو نعیم اصفہانی اور دوسرے شیخ مشائخ صوفیا بھی ہیں اور علما میں بھی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ امام غزالی۔ ان کے نام کے ساتھ امام ہے۔ حافظ بھی ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ وسیع ہو گیا ہے مگر علمائے اسلام کی اصطلاح

کے مطابق یہ ایک ہیں غزالی جن کا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ ابو حامد غزالی اور حافظ ابو نعیم کی لکھی ہوئی بات ہے جو عرض کر رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ ان کی بات بغیر پیغمبر کے بتاتے ہوئے کسی تک نہیں پہنچ سکتی۔ چاہے بطور سند درج نہ کیا ہو مگر یقیناً وہیں سے چلی ہوئی بات ہے جو ان تک پہنچی تو وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر جب علیؑ بستر رسول پر آرام کر رہے تھے تو خالق مخاطب ہوا جبرئیل و میکائیل کی طرف کہ جبرئیل و میکائیل میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ قرار دی۔ ماشاء اللہ اہل فہم ہیں میں کہتا ہوں۔ یہ بتا دیا بس کہ ایک کی عمر زیادہ۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کی عمر زیادہ۔ کیونکہ پھر پوچھ رہا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ دوسرے بھائی کو دے دے۔ اس دن ملک نے سوال کیا تھا خبر نہیں دی تھی میں نے کہا تھا کہ خبر دیتا تو سچ ہی بات ہوتی۔ جھوٹی خبر ملک نہیں دے سکتا۔ سوال کیا تھا جس میں سچ اور جھوٹ کا سوال نہیں۔ آج خالق حکم نہیں دے رہا کہ دیدو۔ ورنہ پھر عصمت ملک طاعت کرائے گی حکم نہیں دیتا سوال کرتا ہے کہ تم میں سے ایک کی عمر زیادہ ہے ایک کی کم ہے تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ اپنے دوسرے بھائی کو دے دے اگر بتا دے کہ کس کی عمر زیادہ ہے تو امتحان ایک ہی کا ہوگا لیکن جب پردے میں رکھا تو اب جواب ہر ایک کو دینا ہے جس کی عمر زیادہ ہو وہ کہے کہ ہاں۔ تو ہر ایک کو بولنا چاہیئے یہ بھی کہے کہ ہاں۔ وہ بھی کہے کہ ہاں ہر ایک کہے کہ جس کی عمر زیادہ ہے وہ دینے کے لئے تیار ہے۔ حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔ فقط پوچھا جا رہا ہے تو ملک معصومانہ جواب دیتا ہے کہ بار الٰہا ہماری تو اصل تمنا یہ ہے کہ پوری عمر تیری عبادت میں صرف ہو۔ اس میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے کہ ملک کا تصور عبادت انفرادی و شخصی ہے۔ وہ بس نماز پڑھنے کو عبادت سمجھتا ہے۔ اسی کو فخر میں بھی پیش کیا تھا

ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ بس یادِ الٰہی میں مصروف۔ امیرالمومنین نے بھی تعریف کی ہے۔ کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے کچھ سجدے میں ہیں۔ تو یہ ان کی عبادت شخصی ہے انفرادی ہے اکیلی اکیلی عبادت ہے۔ اجتماعی عبادت کہ دوسرے کے کام آنا بھی عبادت ہے۔ یہ حدود و تصور ملک سے بھی خارج ہے۔ ورنہ اس سوال کا جواب سے جوڑ نہیں۔ وہ کہتا ہے تم میں سے کون ہے جو اپنی عمر کا فاضل حصہ دے دے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہماری تمنا تو یہ ہے کہ ساری عمر تیری عبادت میں صرف کریں۔ یہ جواب سوال سے مرتبط اسی بنا پر ہے۔ اس میں یہ مضمر ہے کہ ہم تو پوری زندگی تیری عبادت میں صرف کرتے ہیں اگر فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دیدیں تو اتنی سے محروم ہو جائیں۔ اب جس کی جتنی عمر ہے وہ تیری عبادت میں صرف کرے۔ اور اگر اپنی فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دیدیں تو اپنے حصہ کی عبادت اپنے ہاتھ سے کھوئیں یہ ہمارے بس کی بات نہیں جواب ہو گیا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے اب ارشاد ہوتا ہے کہ زمین کی طرف دیکھو۔ تبصرے میرے ہیں اصل واقعہ پورا ان دونوں کتابوں میں ہے زمین کی طرف دیکھو۔ میں کہتا ہوں کہ زمین کی طرف دیکھو تو وہی بہت دفعہ دیکھا ہوا انسان نظر آیا۔ مگر کبھی دیکھتے تھے اس وقت کھڑے ہوئے مگر اس وقت دیکھا تو لیٹے ہوئے۔ کبھی دیکھتے تھے جاگتے ہوئے آج دیکھا سوتے ہوئے دیکھ لیا۔ ارشاد قدرت ہوا۔ ھل لا کنتم مثل علی ابن ابی طالب فتدی فدی اخاہ بنفسہ۔ کیوں نہ ہوئے تم مثل علی کے جس نے اپنی جان اپنے بھائی پر فدا کر دی ہے۔ ملک سمجھا کہ یہ عبادت ایسی ہے کہ میری عبادتوں کے معیار سے اونچی ہے۔ یہ نوع عبادت میری تمام عبادتوں سے بالاتر ہے۔ تو میں نے کہا کہ یہ کم عقلی کی تھی کہ تسبیح و تقدیس کو فخریہ پیش کیا تھا۔ دوسرا رُخ دیکھئے کہ اس نے پیش کیا تھا انسان کی زندگی کا تاریک رُخ۔ کہ یہ انسان خونریزی کرتا ہے یعنی جانیں لیتا

ہے آج قدرت دکھا رہی ہے کہ تم نے جان کا لینا دیکھا جان کا دینا نہیں دیکھا معلوم ہو گیا اور واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ صرف اشارہ کر دینا کافی ہے کہ آج سے مستقل طور پر تصور ملک میں ترمیم ہو گئی یعنی ملک سمجھ گیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی۔ وہ اسی قابل ہوں کہ ان کے کام آیا جائے۔ ملک نے سمجھ لیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی عبادت ہے اور میری عبادتوں سے بالاتر ہے لہٰذا اب جو کہا جائے گا کہ درزی بن کر جاؤ تو چلا جائے گا۔ اب کوئی ایک ہی واقعہ تھوڑی ہے۔ درزی بن کر کہا تو چلا جائے گا۔ وضو کے لئے پانی لے کر چلا جائے گا۔ جب پانی پاس نہ ہو کسی معصومہ کی نیابت میں چکی پیسنے تک چلا جائے گا۔ اور لڑائی میں تلوار لے کر مدد کرنے چلا جائے گا۔ اب کبھی نہیں کہے گا کہ یہ سب کروں اور عبادت نہ کروں تو مستقل طور پر تصور ملک میں ترمیم ہو گئی۔ اب معلوم ہو گیا کہ عمل میں بھی انسان وہ کر سکتا ہے جو میں نہیں کر سکتا۔ اب ارشاد قدرت ہوا اچھا تو اب جاؤ اور اس انسان کی حفاظت کرو۔ ارے فقط ان کی حفاظت تھوڑی ہے۔ اس کی سنت یہ نہیں ہے کہ انبیاء و معصومین کو حربوں کی زد سے پرے ہٹایا جائے۔ نہیں۔ گویا وہ کہہ رہا ہے کہ ابھی میرے کچھ کام اس کی اس زندگی سے۔ میرے ابھی بہت کام ہیں جو ابھی مجھے اس سے لینے ہیں۔ لہٰذا جاؤ اور اس کی حفاظت کرو۔ اب وہ دونوں فرشتے آئے اللہ اترے۔ بس واقعہ بعد میں بیان کروں گا۔ بس ایک غلط فہمی کا دفعیہ۔ ان کو جو بھیجا جا رہا ہے تو کیا معاذ اللہ سزا کے طور پر بھیجا جا رہا ہے۔ میں سزا کا محل اس لئے نہیں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مقام معرفت میں ملک کچھ اور اونچا ہو چکا ہے۔ مقام علم میں اس کی بلندی ہو گئی تو سزا کا ہے کی دی جائے۔ یہ سزا نہیں ہے ایک بڑی حقیقت ہے جسے دو جملوں میں میں کہوں گا۔ اور آگے بڑھوں گا۔ میں کہوں گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ جو شے اِدھر سے اُدھر جاتی ہے اس کی معراج ہوتی ہے جب وہاں والوں کو

معراج ہوتی ہے تو یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اب ایک ملک سرہانے اور ایک پائین پا۔ آج یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ان کا پیر بھی اتنا ہی اونچا ہے جتنا سر اونچا ہے۔ ایک ملک سرہانے اور ایک پائین پا۔ اور اب زبان پر کیا ہے۔ کئی لفظ مجھے معلوم ہیں۔ بخ بخ لک یاد رکھئے لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا کہنے والے کو دیکھنا ہے بخ بخ لک۔ من مثلک یا بن ابی طالب فقد باہ بک اللّٰہُ ملائکۃ السماء مبارک ہو مبارک ہو اے ابوطالب کے فرزند کہ آپ کے ذریعہ سے اللہ فرشتہ ہائے آسمان پر فخر کر رہا ہے بس روایت یہاں ختم ہوئی۔ میں کہتا ہوں من مثلک دیکھئے کون ہے آپ کی مثل کلام کے حدود۔ حدود متکلم سے بدلتے ہیں۔ اگر انسان کوئی کہے کہ کون آپ کی مثل ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسانوں ہی میں کوئی آپ کی مثل نہیں مگر غیر نوع کا فرد یعنی ملک کہہ رہا ہے کہ کون آپ کی مثل۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق الٰہی کی کسی نوع میں۔ نہ انسانوں میں نہ جنات میں نہ فرشتوں میں کسی نوع میں ان کا مثل نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان سے بالاتر وہ ہے کہ جس پر فدا ہو کر یہ مرتبہ مل رہا ہے۔

اب ایک پہلو پر روشنی ڈالوں گا کہ اتنی بڑی تعریف کہ کسی نوع مخلوق میں آپ کا مثل نہیں۔ مگر اتنی بڑی تعریف میں۔ نہ ملک ان کا کوئی لقب کہتا ہے جو القاب ہمیں معلوم ہیں تو کیا وہ ملائکہ کو نہیں معلوم۔ نہ ان کا کوئی وصف کہتا ہے نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ بتاتا ہے۔ اسے نہ آپ کچھ اور ان کا نام ہی لے دیتے کہ ان کا نام علو کا پتہ دیتا ہے۔ بلندی تو ان کے نام میں مضمر ہے مگر ملک یہ کچھ نہیں کہتا وہ تو کہتا ہے۔ یا بن ابی طالب۔ کون آپ کا مثل ہے۔ اے ابوطالب کے بیٹے۔ قرآن میں کہا جا رہا ہے لا یسبقونہ بالقول۔

اور یہ قول ہی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتخاب بھی ملک کا طبع زاد نہیں ہے

وہ اُدھر سے ہی الغا ہے لفظوں کا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے تو یہ کیا بات۔ فصاحت و بلاغت کسی زبان کی ملک نہیں ہے چاہے آپ پنجابی ہوں چاہے ہندوستانی۔ زبان مادری ہو، بمقام مدح میں کوئی نسبت ایسی جو ذم کا پہلو رکھتی ہو یہ بلاغت کے خلاف ہے۔ تو اتنی اُونچی تعریف اور اس میں یہ کہنا کہ اے ابوطالب کے بیٹے۔ ماننا پڑے گا کہ ابوطالب کوئی ایسا بڑا باپ ہے جس کی طرف نسبت اس جلالت مدح کے خلاف نہیں ہے۔ صلوٰۃ۔

میری عادت کچھ کچھ یہ ہے کہ میں اپنے لئے مشکلیں پیدا کرتا ہوں میرے ذہن میں ابھی ایک خلش ہے وہ یہ کہ یہ ثابت ہوا کہ ہاں غلط نہیں مگر ضرورت کیا تھی ایک تو کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ غلط فہمی دُور کرنے کا یہی ذریعہ تھا۔ ایک طبقے کی غلط فہمی دور کی جائے مگر اس کے علاوہ۔ آخر ضرورت کیا تھی۔ تو جناب جو اس کا جواب مجھے تاریخ سے ملا۔ وہ شعب ابی طالب کا چار برس کا محاصرہ تھا اس میں ہر رات یہ خطرہ تھا کہ کہیں ہمیں شب خون نہ مارے اور چراغ عمر رسالت کو خاموش نہ کر دے۔ تو ابوطالب نے حفاظت رسول کا یہ انتظام کیا تھا کہ رسول کو ایک بستر پر نہیں رہنے دیتے تھے۔ کبھی طالب کو رسول کے بستر پر کبھی رسول کو طالب کے بستر پر۔ کبھی جعفر کو رسول کے بستر پر کبھی رسول کو جعفر کے بستر پر۔ کبھی عقیل کو رسول کے بستر پر کبھی رسول کو عقیل کے بستر پر۔ اور کبھی علی کو رسول کے بستر پر اور کبھی رسول کو علی کے بستر پر۔ آپ اس قربانی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ چاہے جونسا بیٹا میرا قتل ہو جائے۔ کسی ایک کو بھی تو مستثنےٰ نہیں کرتے۔ میرا چاہے جو بیٹا قتل ہو جائے مگر رسول کی زندگی محفوظ رہے۔ اب میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ ابوطالب کا بیٹا کہنے میں کیا راز ہے۔ یہ طریقہ قربانی یہ باپ کی ڈالی ہوئی عادت تھی۔ اس کے بعد یہ حق شناس ملک تھا جس نے اس محل پر ابوطالب کو یاد کرنا ضروری سمجھا۔ اور یہ ناحق شناس انسان تھے کہ جنہوں نے

اس کے بعد بھی ابو طالب کے ایمان میں شک کیا۔ اب جناب پورا تبصرہ ہو گیا مگر پھر میں نے اپنے لئے ایک مشکل پیدا کرلی ہے وہ یہ کہ میرا بیان بالکل بے قیمت اگر کوئی ایک لفظ قرآن کی مجھے شاہد نہ ملی ہو۔ اسی لئے تو میں نے کہاں کا کہاں سے ربط ملایا ہے۔ اور کہاں یہ بعثت خاتم الانبیا کے بعد یہ ہجرت کی رات تو یہ ربط کیا میں نے از خود ملا دیا تو یہ تو بہت بڑی جرأت کی بات ہے۔ اسمیں تو کوئی وزن نہیں ہے۔ جب تک کہ کوئی لفظ قرآن کی شاہد نہ ہو۔ وہ آیت جو اس کارنامہ علی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہوئی آئی۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغا مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد۔ اس آیت میں بھی اللہ نے نہ ان کا کوئی لقب کہا ہے نہ ان کا کوئی وصف کہا ہے نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ کہا ہے نہ ان کا نام لیا ہے بلکہ بس ان کے کردار کو پیش کر کے۔ سرنامہ خطاب یہ ہے۔ سرنامہ مدح یہ ہے ومن الناس۔ انسانوں میں دیکھو یہ ایک شخص ہے جو اپنی جان کو رضائے الٰہی کے لئے دیتا ہے۔ یہ اس سند میں انسان کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ یہی ضرورت تھی کہ آج علی نوع انسان کا نمائندہ بنے ہوئے نوع ملک پر اس کی بلندی کو ثابت کر رہے ہیں۔ اس لئے اس دستاویز میں انسان کہا گیا۔ ہاں اس کے بعد عام طریقہ قرآن کا یہ ہے کہ فرد کی مدح ہوتی ہے مگر جمع کے صیغہ میں یہاں تک کہ آیہ ولایت میں بھی سب جمع کے صیغے ہیں انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔ مدح فرد کی اور الفاظ جمع کے مگر یہاں خالق نے وحدت نمایاں کی ہے۔ ومن الناس انسانوں میں ایسے بھی ہیں من الناس من یشری دیکھو انسانوں میں یہ ایک ایسا ہے۔ اب اس منزل قربانی میں کوئی کہیں نہیں ہے۔ من الناس من یشری اہل علم جانتے ہیں من میں گنجائش واحد و جمع دونوں کی ہے۔ مگر نہیں فعل جو لائے گئے ہیں وہ سب واحد من الناس من یشری

انسانوں میں وہ ہے جو بیچ ڈالتا ہے۔ بیچ ڈالتے ہیں نہیں نفسہ ھو واحد کی ضمیر نفس بھی واحد انفسہم نہیں اپنے نفوس کو۔ حالانکہ مباہلے میں ایک نفس لایا جائے گا مگر انفسنا کہا گیا ہے۔ عام سنت الٰہی یہی ہے کہ واحد کی مدح جمع کے صیغے سے کرنا ہے۔ مگر یہاں وحدت نمایاں ہے کہ دیکھو کہ یہ بھی ایک ہے۔ جو اپنی جان کو بیچتا ہے بس مدح میں کہتا ہوں اب میں کیا کروں کہ اس کے بعد وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی قرآن کی آیت اُترتی ہوئی نہیں دکھا سکتا مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر دس محرم ۶۱ھ کو کوئی آیت اترتی تو یہ وحدت جمع کی شکل اختیار کرتی اور آج فرشتے دیکھتے کہ ہاں ایک جماعت ہے جو ایسا کچھ کرتی ہے کہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس وقت جمع کی شکل ہوتی کہ دیکھو ایسے بھی انسان ہوتے ہیں۔ کوئی یہاں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بہت حد سے بڑھی ہوئی بات ہے کہاں حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور کہاں یہ پورا مجمع۔ یہ پوری جمعیت۔ کہا جا رہا ہے کہ ان کے لئے کہا جاتا مگر میں کہتا ہوں۔ وہ پوری جمعیت جس میں جتنا فرق ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ عصر تک کے جہاد میں اصطلاحی طور پر معصوم۔ تو بس ایک ذات ہے عصر تک کے جہاد میں۔ معصوم اصطلاحی ایک ذات اس کے بعد حضور سب عرب ہی نہیں ان میں حبشی بھی ہیں۔ ترکی بھی ہیں۔ تو سب عرب بھی نہیں۔ ارے سب آزاد بھی نہیں ان میں غلام بھی ہیں۔ تو اپنی جگہ تو جو فرق ہے مجھے معلوم ہے اور زمین آسمان کا فرق ہے مگر جہاں تک کردار کربلا کا تعلق ہے مجھے کوئی اور فرق کیا مجھے اس کردار میں معصوم اور غیر معصوم کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ اور اگر کردار کی منزل میں کوئی فرق ہوتا تو حجت خدا سب کو مخاطب کر کے نہ کہتے کہ بابی انت وامی یا اصحاب الحسین طبتم وطابت الارض التی دفنتم فیہا۔

معصوم ابن معصوم۔ حجت خدا ابن حجت خدا وہ کہہ رہے ہیں میرے ماں باپ

تم پر قربان ہوں اے مجاہدین کربلا تم بھی پاک ہو گئے اور وہ زمین بھی پاک ہوئی جہاں تم دفن ہو گئے اور کاش میں تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔ بس جناب کل عرض کر چکا کہ ہمارے رونے پر طرح طرح کے سوال ہوتے ہیں ہماری عزا پر طرح طرح کے اعتراض ہوتے ہیں ایک سوال کل پیش کیا تھا۔ اب ایک اور سوال جو بہت ہوتا ہے۔ ہر قسم سے ہر ڈھب سے متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ رونا تو بزدلی ہے عورتوں کا کام ہے۔ مرد اور بہادر لوگ تھوڑی روتے ہیں۔ انہوں نے رو کر قوم کو بزدل بنا دیا۔ اتفاق سے ایک بات مجھے یاد آ گئی۔ ایک لفظ جو بہت چلی ہوئی ہے وہ ہے ملت گریہ کن اخباروں میں آیا کرتی ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے چلی ہے۔ اتفاق سے اس لفظ کو شروع شروع میں استعمال کرنے والے بھی ایک ایرانی تھے۔ جلال الدین۔ ان کا رسالہ حبل المتین نکلتا تھا۔ وہ اصلاحی طور پر کہتے ہیں کہ مجلسوں میں فقط گریہ کو نصب العین نہیں بنانا چاہیئے تو اس کے ذیل میں انہوں نے کہا تھا کہ ہماری قوم تو ملت گریہ کن ہے کبھی طنز سے کہا جاتا ہے ملت گریہ کن۔ یہ سب سے پہلے ان ایرانی جلال الدین ایڈیٹر حبل المتین نے لکھا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ کیا قدرت کی کارفرمائی ہے کہ ایک ایرانی فرد کا جواب ایرانی قوم نے اپنے عمل سے دیا ہے کہ دیکھو جو ملت گریہ کن ہے وہ یہ کرتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رونا تو بزدلی ہے۔ یہ کیا گریہ کا عمل۔ اتنی کوشش۔ یہ پورا ہر سال گویا گریہ کی فراوانی۔ تو میں کہتا ہوں کہ گریہ کا پس منظر اسی جملے میں ہے۔ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ واقعہ کربلا کو یاد کرو تو کہو یا لیتنی کنت معکم فافوز فوزاً عظیما۔ کاش میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتا۔ یہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ رونا بزدلی ہے اب میں اس سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا کہ سمجھ کر کہو کہ کسی معرکہ میں ہو کر رونا بزدلی ہے اور کسی معرکے میں شریک نہ ہونے پر

رونا مین شجاعت ہے۔ بہذا ہم اگر زیر روایت حضرت ابوالفضل العباس ہوتے تو نہ روتے۔ کربلا میں کون روتا ہوا دنیا سے گیا۔ حبیب ابن مظاہر روتے ہوئے گئے؟ مسلم ابن عوسجہ روتے ہوئے گئے۔ قاسم اس وقت تک رکے جب تک اجازت نہ ملی۔ جب اجازت مل گئی تو ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ گئے۔ عباس کیا روتے ہوئے گئے علی اکبر روتے ہوئے گئے ارے کربلا میں تو بے شیر بھی ہنس کر گیا۔ کربلا میں جو تھے وہ روتے ہوئے نہیں گئے دہرانا میری عادت نہیں ہے مگر مقصداً دہرا رہا ہوں کہ عباس نہیں روئے علی اکبر نہیں روئے۔ قاسم روتے ہوئے نہیں گئے۔ حسین بھی جب تک دوسرے جا رہے تھے نہیں روئے۔ جب خود میدان میں گئے تو نہیں روئے تو کربلا میں کون رویا لیکن زین العابدین عمر بھر روئے اب سمجھے رونے کا مطلب ماشاء اللہ۔ اجرکم علی اللہ مجلس ختم ہوگئی۔ اب ایک سوال اور اس کا جواب۔ ارے چودہ سو برس ہو گئے اور اب تک رو رہے ہو۔ میں کہتا ہوں جنہیں بروقت رونے کا حق تھا اگر انہیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید ہم آج تک نہ روتے۔

مجلس ہفتم

خلافتِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ
اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ۔

سورہ الحمد کے بعد پہلے ہی سورہ میں اور قرآن مجید کے بڑے اور وسیع تر سورہ میں پہلے ہی رکوع میں یہ آیت ہے کہ وہ موقع آیا جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کیا اس زمین میں ان کو مقرر کیا جائے گا جو اس میں فساد کریں اور خونریزی کریں حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں اور پاکیزگی کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں۔ ادھر سے ارشاد ہوا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ وہ موقع یاد رکھنے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے سابقہ واقعات صرف تفریح طبع کے لئے بیان نہیں کئے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں اس امت کے لئے کچھ بصیرتیں موجود ہیں اور ان کی کچھ اہمیت ہے۔ جو میں نے عرض کیا کہ یہ موقع یاد رکھنے گا۔ اب اس کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے یہ کہا۔ کیا کہا۔ اب آنے والا ابھی ہم بتا بھی نہیں سکتے کہ کتنی مدت کے بعد آئے گا۔ چاہے سو برس ہیں چاہے ہزار برس ہیں اس کا بیان قرآن مجید میں بھی نہیں ہے احادیث میں بھی نہیں ہے بہر حال بہت پہلے سے کہا جا رہا ہے کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اب چونکہ قرآن مجید

میں یہ ہے کہ جانشین۔ مگر کس سے تعلق ہے اس جانشینی کا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا عام مفسرین اس میں پریشان ہو گئے ہیں۔ اس میں کہ جانشین بنانے والا ہوں۔ تو کس کا جانشین۔ اب میں کہتا ہوں کہ دشواری کیا ہے قرآن تو سامنے ہے کافی ہے مگر ذرا سی بات کے سمجھانے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اب اُلجھے ہوتے ہیں کہ جانشین کس کا۔ تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت دور کی کوڑی لائے۔ اب وہی تاریخ وغیرہ سے روایات سے۔ ورنہ اس وقت انہوں نے کہاں دیکھا تھا۔ تو یہ کہا کہ آدمی یعنی نسل انسانی سے پہلے اس زمین پر جنات و شیاطین آباد تھے جن کو عربی میں جن و نسناس کہتے ہیں۔ آدمی ناس ہیں اور وہ نسناس۔ تو جنات و نسناس یعنی جنات و شیاطین۔ یہ قوم اس دنیا میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی بداعمالیوں سے وہ تباہ و برباد کئے گئے۔ تو اب خالق کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی جگہ۔ ان شیطانوں کی جگہ پر جنات کی جگہ پر ایک مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے بڑے علما غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے۔ میں کہتا ہوں کہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ ارے صاحب بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی اس کے بعد فرشتے کہہ رہے ہیں کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں یعنی کسی اور کی کیا ضرورت ہے ہمیں کو کیوں نہیں مقرر کیا جاتا۔ تو سبحان اللہ جنات و شیاطین کی جانشینی اور ملائکہ کا رشک کرنا۔ ملائکہ کو اس کی تمنا پیدا ہوئی کہ جنات و شیاطین کی جگہ پر ہم کو رکھ دیا جائے تو ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ فرشتے، جوار قدس میں بسنے والے۔ عالم بالا کے رہنے والے اور وہ اس کے قرب و جوار میں رہنے کی بجائے یہ طلب کریں کہ ہمیں شیطانوں کی جگہ اس دنیا میں بھیج دے یہ خلاف عقل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہر زبان کے محاورے سے ہو سکتا ہے۔ کوئی صاحب آپ میں سے دوپہر کے وقت کہیں گئے ہوئے تھے۔ آئے وہاں سے کسی دوست کے ہاں اور کہا کہ ارے بھئی بہت

پیاس لگی ہے تو وہ دوست پُوچھے گا کہ کس کو پیاس لگی ہے ارے صاحب کسی اور کو پیاس ہوتی تو اس کا نام لیا جاتا۔ جب اسکا نام نہیں لیا گیا تو سمجھ لیجئے جو کہہ رہا ہے اسی کو پیاس لگی ہے کوئی اور زیادہ بے تکلف دوست ہو اور کہے کہ بہت بھوک لگی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مجھ کو بھُوک لگی ہے اور مثلاً والد ماجد فرماتے تھے کیا کوئی پُوچھے گا کس کے والد ماجد۔ کسی اور کے والد ماجد کا ذکر ہوتا تو اس کا نام ہوتا۔ جب کسی اور کی طرف اضافت نہیں دی تو سمجھئے کہ جو کہہ رہا ہے وہ اپنے ہی والد ماجد کی بات کر رہا ہے بھائی صاحب سفر سے آ گئے ہیں کہیں گئے ہوئے تھے۔ کس کے بھائی صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی اور کا ذکر ہو تو متعلق کے لئے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب خود متکلم اپنی طرف اضافت دینا چاہے تو پھر کسی متعلق کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی کہے کہ پیاس لگی ہے کوئی نہیں پُوچھے گا کس کو کہے بھُوک لگی ہے کوئی نہیں پُوچھے گا کس کو۔ کہے کہ والد صاحب نے کہا تھا وہ نہیں پُوچھے گا کس کے۔ بھائی صاحب نے کہا ہے نہیں پُوچھے گا کس کے۔ اور اللہ فرماتا ہے کہ میں جانشین مقرر کرنے والا ہوں تو دنیا پُوچھتی ہے کس کا۔ ارے صاحب جب نہیں بتایا کہ کس کا تو سمجھ لیجئے کہ جو کہہ رہا ہے وہ اپنی ہی طرف اضافت دینا چاہتا ہے کہ میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ تو خدا اپنا جانشین کیوں بناتا ہے۔ سمجھ میں ہماری یہ آتا ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے مکان یا زمان خالی ہو مکان خالی ہو یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے۔ تو جانشین بنائے۔ یا زمانہ اس سے خالی ہو تو جانشین بنائے اور ذات الٰہی جو زوال و انتقال سے بری ہو تو اس کی طرف سے جانشین بنانے کے کیا معنی۔ اس کو میں دو رخوں سے سمجھاؤں گا۔ ایک رُخ تو بہت کھلا ہوا ہے جس میں زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے نہ علمیت کی اس میں کوئی ضرورت ہے ایک ذرا اس میں گہرائی ہے مگر انشاءاللہ

ہمارا مجمع بافہم ہے تو کوئی گہرائی محسوس نہیں ہوگی۔ تو پہلا حل یہ ہے کہ بے شک خالق کی طرف زمین و آسمان دونوں کی نسبت یکساں ہے بایں معنی کہ دونوں مخلوق ہیں اس کے۔ ربّ السّمٰوٰت والارض۔ وہ آسمان کا بھی پروردگار زمین کا بھی پروردگار۔ مگر پھر بھی بلندی کے رُخ کو جو اس سے تعلق محسوس ہوتا ہے وہ زمین کا نہیں ہے وہ تعلق زمین میں نہیں ہے۔ دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے جاتے ہیں جُھکائے نہیں جاتے۔ یہ کاہے کے لئے۔ حضرت موسیٰ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے۔ زمین کے کسی غار کے اندر نہیں جاتے تھے۔ قرآن کے محاورات دیکھ لیجئے۔ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے اس کو اُتارنا کہا گیا ہے۔ قرآن اس کی طرف سے آیا تو اس کے لئے کہا گیا انزلنا۔ ہم نے اُتارا۔ وحی اس کی طرف سے آئی ہے تو اس کے لئے کہا جائے گا کہ وحی اُتاری۔ ملک اس کی طرف سے آتا ہے تو اس کے لئے کہا جائے گا کہ ملک کو ہم نے اُتارا۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ سب تو ہر ایک کی سمجھ میں آجاتا ہے مگر قرآن میں ایک جگہ لوہے کو بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے اُتارا۔ اب عرب کی زندگی کے اعتبار سے وہ لوہار تو نہیں تھے شمشیر زن تھے تو وہاں فولادی چیز جو ہوتی تھی وہ تلوار ہوتی تھی۔ وہ کہہ رہا ہے ہم نے لوہا اُتارا جس میں لوگوں کے لئے خوف و دہشت ہے تو یہ خوف اور دہشت ہتھوڑے سے تھوڑی ہوتی ہے۔ آری سے تھوڑی ہوتی ہے کوئی ایسی چیز ایسا لوہا جس میں خوف و دہشت مضمر ہو تو اب دنیا ڈھونڈے کوئی تلوار جو ادھر سے اتری ہو۔ صلوٰۃ۔

تو جو ادھر سے چیزیں آتی ہیں ان میں کہا جاتا ہے اُترنا۔ اور جو چیزیں اِدھر سے جاتی ہیں ان کے لئے کہا جاتا ہے بلند ہونا۔ دُعا بندے کی چڑھتی ہے بلند ہوتی ہے۔ عمل صالح انسان کا اگر مقبول ہے تو اُوپر جاتا ہے بلند ہوتا ہے یہ ہمارا ہی محاورہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں ہے جو نیک عمل ہے وہ اسے اُونچا کرتا ہے نماز اگر مقبول ہے

تو بھی آیا ہے کہ آسمانوں پر جاتی ہے۔ تو جو اُدھر سے چیز آتی ہے اس کو اُترنا اور جو چیز اِدھر سے جاتی ہے اس کو چڑھنا۔ یہ آخر محاورہ کیوں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ عرش یعنی پایہ تخت کا تصور جس میں پیش کیا گیا ہے۔ تو یہ اس کا پایہ تخت ہے۔ اس کے لئے تصور یہ ہے کہ وہ عالم اعلیٰ کا بلند ترین نقطہ ہے۔ عرش زمین کے نیچے نہیں مانا جاتا۔ آسمانوں پر یہ تصور سے خارج بلندی ہے اُسے عرش مانا جاتا ہے اسے پایۂ تخت مانا جاتا ہے۔ ہاں مگر پایہ تخت کہنے سے میں یہ نہیں مانوں گا کہ وہ اس پر بیٹھتا بھی ہے۔ میں کہتا ہوں وہ پایہ تخت ہے اور اگر اس پر وہ بیٹھتا بھی ہے تو ہماری زمین پر تو اس کا گھر ہے تو کیا وہ اس گھر میں رہتا بھی ہے۔ مکہ معظمہ میں وہ مقدس گھر جس کا تمام دنیا جاکر طواف کرتی ہے اس کے لئے کیا تصور ہے بیت اللہ۔ تو وہ اللہ کا گھر ہے تو کیا اس گھر میں وہ سکونت فرماتا ہے۔ وہ اسمیں رہتا ہے اس کا کسی فرقہ کے مسلمانوں کو تصور نہیں ہے تو جب اس گھر میں رہنے کا تصور نہیں تو عرش کے لئے یہ تصور کیوں کہ وہ بیٹھتا ہے۔ اب ایک عقلی بات ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے جسے بیٹھنے کے لئے تخت کی ضرورت ہو اُسے رہنے کے لئے گھر کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور جب گھر ہے اس کا مگر رہتا نہیں تو۔ آدمی غور کرے۔ کہ تخت میں یہ تصور کیوں ہے کہ وہ اس پر بیٹھتا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ گھر بھی ایک نسبت ہے شرف اور عزت کے بڑھانے کے لئے اور وہ عرش کہنا بھی ایک نسبت ہے شرف و عزت کے بڑھانے کے لئے۔ مگر جیسی نسبت ہوتی ہے عملاً اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ بھی کیا جاتا ہے یعنی اس نسبت کو اپنے عمل سے نباہا جاتا ہے۔

صاحبان فہم، صاحبان عقل سب سمجھ سکتے ہیں کہ گھر کی نسبت شخص کی طرف نجی اور انفرادی ہوتی ہے۔ تخت و سلطنت کی نسبت بادشاہ کی طرف منصبی ہوتی ہے تو اسے کہہ رہا تھا اپنا گھر۔ اسے کہہ رہا تھا اپنا عرش۔ یہ ہے گھر تو جب گھریلو کام

لینا ہوا۔ کسی کا زچہ خانہ بنانا تو اسے منتخب کیا۔ اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا تو وہاں بلایا گیا۔ صلوٰۃ۔

تو اب یہ دو لفظ کہہ رہا ہوں اسے محفوظ رکھئے گا کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی کہ جس حیثیت سے عرش اس کا پایہ تخت ہے اُس حیثیت سے گویا زمین اُس سے خالی ہے تو یہی تو کہا جا رہا ہے کہ میں زمین میں جانشین مطلق نہیں کہا گیا۔ محض جانشین۔ زمین میں جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں تو اب اپنی لفظوں میں میں یوں کہوں گا کہ ملائکہ سے کہا گیا کہ سنو ملائکہ یہاں عالم بالا میں تو میں ہوں میرا عرش ہے لیکن عالم ادنیٰ یعنی زمین اس شرف سے محروم ہے لہٰذا میں ایک ایسے کو بنانا چاہتا ہوں جس کا دارالسلطنت زمین اسی طرح ہو جس طرح میرا دارالسلطنت عرش ہے اور ذرا سی لفظیں بدل کر یوں کہوں گا کہ ایسے کو مقرر کرنا چاہتا ہوں جسے زمین سے وہی نسبت ہو جو مجھے عرش سے ہے۔ اب یہ منزل اتنی پرکشش ہے کہ ملک کی نگاہ طلب پڑتی ہے کیونکہ صحبت میں رہے مگر منصب سے محروم رہے تو یہ بلندی نہیں ہے۔ ظاہری طور پر دور بھی ہو جائے مگر منصب کا حامل ہو کر رہے تو اس میں بلندی ہے۔ صلوٰۃ۔

یہاں ایک غلط فہمی دور کر دوں کہ عرش اس کا پایۂ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔ اسی طرح سے زمین اس کا پایہ تخت ہے مگر عالم بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے لہٰذا جہاں بھی جائے گا نمازیں پڑھاتا ہوا جائیگا۔ اقتدا کرتا ہوا نہیں جائے گا امامت کرتا ہوا جائے گا۔ تو یہ تھا ایک پہلو جانشینی کا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے جگہ یا زمانہ خالی ہو۔ یہ بنیادی تصور ہی غلط ہے ایک اور صورت ہے جانشین بنانے کی وہ یہ ہے کہ کام کرنے کا کسی کے ہو یعنی کسی طرح سے فریضہ اس کا ہو مگر کسی وجہ سے وہ خود اگر انجام نہ دے سکتا ہو اس کی مثال ایک میں یہ دے سکتا ہوں کہ کوئی معزز آدمی

کہیں جاتے تو اس کے اعزاز میں جلسہ ہوتا ہے۔ اس جلسے میں اس کے اعزاز میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ آئینی طور پر سپاس نامہ کا جواب دینا اسی مہمان کے ذمہ ہے جس کے اعزاز میں وہ جلسہ ہے۔ وہ سپاسنامہ پڑھا گیا ہے مگر اتفاق سے جس جگہ وہ پڑھا گیا ہے اور مجمع میں جو لوگ ہیں وہ اس کی زبان سے ناواقف ہیں یہ ان کی زبان سے ناواقف ہے۔ تو ناواقفیت بھی سدِّراہ ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری زبان سے واقف نہیں۔ میں ان کی زبان سے واقف نہیں کوئی سپاس نامہ کا جواب دینے اگر خود سے کھڑا ہو جاتے تو میرا فرض ادا نہیں ہو گا۔ غیر آئینی ہے۔ اس کے جواب سے میں سبکدوش نہیں ہوں گا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انہی میں سے کسی کو میں اپنا نائب بناؤں جو میری زبان سے بھی واقف ہو اور ان کی زبان سے بھی واقف ہو تاکہ وہ میرا جواب میری زبان میں مجھ سے سُنے اور ان کی زبان میں ان تک پہنچائے بس خالق کو خلیفہ بنانے کی اسی لئے ضرورت تھی۔ خلق خدا کی رہبری۔ سیدھے راستے پر پہنچانا اس کا کام ہے بحیثیت رب۔ اگر وہ فقط خالق ہوتا تو خالق کے معنی ہیں پیدا کرنے والا۔ تو پیدا کیا اور بس چھوڑ دیا۔ لیکن وہ فقط خالق نہیں۔ یہی فرق ہے عیسائیوں کے محاورہ میں اور ہمارے محاورے میں۔ وہ خدا کو کہتے ہیں اب یعنی باپ ہم خدا کو کہتے ہیں رب یعنی پالنے والا۔ یہ باپ کی لفظ جو ہے یہ سبب وجود کو بتاتی ہے۔ سبب بقا کو نہیں بتاتی۔ بہت سے بچے ہیں کہ باپ ان کے دنیا سے اُٹھ گئے تب وہ پروان چڑھے تو وجود میں باپ کا دخل ہے بقا میں نہیں ہے۔ لیکن رب۔ رب کے معنی ہیں پروان چڑھانے والا۔ یہ بقا کے ہر لمحے میں اس کا رشتہ ہے انہوں نے اب کہا ہے یہ رشتہ ماضی ہے اور ہم رب کہتے ہیں یہ رشتہ حال ہے یعنی ہر نفس ہمارا اس کی توجہ کا محتاج ہے اسکی نگاہ ہم سے ایک لمحے کے لئے ہٹے تو ہماری ہستی نیستی میں بدل جائے۔ یہ سب ہے رب میں مضمر۔ تو اگر فقط خالق ہوتا تو ہدایت اس پر فرض نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ

وہ رب ہے پروردگار ہے اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے ممکن درجہ کمال تک پہنچانا۔ لہٰذا اب صحیح اور غلط کا بتانا۔ اب اچھے اور بُرے کی تعلیم دینا اب صحیح راستے پر چلانا یہ سب فرائض تربیت میں سے ہے اور اب قرآن مجید کی ایک ایک لفظ وہ ہے کہ غور کیا جائے تو پردہ اٹھتا ہے کہ اس اعلان میں قال اللہ نہیں کہا گیا کہ اللہ نے یہ کیا بلکہ قال ربك تمہارے رب نے یہ کہا اس کے یہ معنی ہیں کہ جو اعلان ہے وہ تربیت کے ماتحت ہے۔ تربیت اس کا کام لہٰذا ہدایت اس کا کام قرآن مجید میں ہے۔

ہر چیز کو اس نے پیدا کیا پھر ہدایت کی۔ مگر انسان کے علاوہ جس جس چیز کی ہدایت ہے وہ خلقی طور پر ارادہ قاہرہ سے ہے اس کا کام ہے اسے منزلِ ارتقا تک پہنچانا۔ یعنی ایک قطرہ اس کی ہدایت سے گہر کی منزل تک پہنچتا ہے۔ ایک بیج اس کی ہدایت سے ثمر تک پہنچتا ہے۔ تو ہر چیز اپنے کمال کی منزل تک بہ ارادہ الٰہی پہنچتی ہے۔ چیز کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہے لیکن انسان کو اس طرح منزلِ کمال تک نہیں پہنچانا ہے ورنہ کوئی دنیا میں کافر ہی کیوں ہوتا۔ اگر وہ اپنے ارادہ قاہرہ سے ہر ایک کو مومن بنانا چاہتا۔ تو کافر دنیا میں رہتے ہی کیوں۔

اگر پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے ہیں سب مومن ہی ہوتے معلوم ہوتا ہے کہ قوت قاہرہ سے اس کو منزل کمال تک پہنچانا یہ منظور نہیں ہے۔ اسے منزل تک پہنچانا تھا۔ اسے منزلِ بتا کر چلنے کی دعوت دینا ہے اس کے لئے یہ تھا کہ وہ اسے صحیح راستے پر چلائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوا کہ صحیح راستہ بتائے اور اس سے کہے کہ ادھر چلو۔ وہ آگے آگے چل کر کیسے بتائے کہ میرے پیچھے آؤ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جسم رکھنے والے۔ جسمانیات سے جو الگ نہیں ہیں۔ یعنی اسی خلقت میں سے کوئی ایسا ہو کہ جس میں ایسی صفائے جوہر ہو کہ اس سے

فیض لے سکے۔ اور جسمانی طور پر ان کا ہم جنس ہو کر ان کو پہنچا سکے۔ ایسی دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جسے وہاں کہا گیا تھا کہ دونوں کی زبان جانتا ہو۔ تو ایسے دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جو گناہوں سے بری ہونے کی وجہ سے خود اس کا فیض حاصل کرنے کا مستحق ہو اور خلق خدا کو صحیح راستہ بتانے کے لئے ان کی ضروریات میں شریک ہو۔ تاکہ ان پر حجت تمام کر سکے۔ اگر اُسے بھوک نہ لگتی ہو اور وہ کہے کہ روزہ رکھو تو خلق خدا کہے گی کہ جناب آپ کو بھوک کا مزہ ہی نہیں معلوم۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا کوئی آسان ہے آپ کیا جانیں کہ پیاس کیا چیز ہوتی ہے تو دن بھر پیاسا رہنا کہیں ہو سکتا ہے جو حکم وہ دے۔ دنیا کہے۔ جناب ان تمام خواہشات سے آپ بری۔ آپ مثال عمل کہاں بن سکتے ہیں۔ تو خلق خدا پر حجت تمام نہ ہوتی۔ لہٰذا ایک ایسا ہونا چاہیئے اور میں ایک لفظ پر اس کو ختم کرتا ہوں۔ دنیا کہتی ہے کہ کہا گیا کہ تمہاری ہی طرح بشر ہوں۔ تو ہم ہی جیسے ہیں۔ بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے جیسا جاہل ہوں۔ یہ کہا تھا کہ تمہاری طرح بشر ہوں یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری طرح خطا کار ہوں۔ تو بشریت پر ایمان لانا تو میں جزو دین سمجھتا ہوں۔ بشریت کا انکار میں کفر سمجھتا ہوں مگر بس دیکھنا یہ کہ کیسا بشر۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بشر ایسے ہیں۔ دنیا ملک کہنا ان کی تعریف سمجھتی ہے میں ملک کہنا ان کی توہین سمجھتا ہوں۔ یہ ملک اور انسان کی فضیلت کا جز غالباً اسی سلسلہ بیان میں کل آپ کے سامنے عرض ہو گا۔ تو حضور والا ایسا بشر ہو کہ جو خالق سے اس کا فیض حاصل کر سکے اور ہم تک اس کے فیض کو اپنی زبان میں جو ہماری بھی زبان ہے پہنچا سکے۔ تو اسے وہ اپنا جانشین بنالے اپنا نائب بنالے کیونکہ نائب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا کام اُس کا کام ہو جائے۔ اب یہ جو ہدایت کرے گا وہ اس کی ہدایت نہیں ہو گی بلکہ وہ اس کی طرف کی ہدایت ہو گی جس

نے نائب بنایا ہے تو اب چاہیے اس کو ہدایت کرنے والا کہیئے چاہیے اُس کو ہدایت کرنے والا کہیئے۔ اس لئے اس کو ہم کہیں گے ہادی اور قرآن کہے گا انما انت منذر ولکل قوم ھاد۔ کہ اے رسول آپ منذر ہیں نبی اور رسول بھی ہیں لیکن انذار یعنی رسالت کا دروازہ بند ہوا ہے۔ ہدایت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہر نسل میں ہر طبقے کے لئے ہادی ہے یعنی رسالت ختم ہوئی ہے ہدایت ختم نہیں ہوئی ہے۔ نام ول سے حقیقت تھوڑی بدلتی ہے میں کہتا ہوں کبھی ہدایت بنام رسالت ہوتی ہے کبھی ہدایت بنام امامت ہوتی ہے لیکن ہدایت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اور بس گذشتہ بیان کی روشنی میں ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ جناب والا جب میں نے عرض کیا کہ ہدایت تقاضائے ربوبیت ہے تو بس ایک جملہ کافی ہے یعنی جب تک اس کی ربوبیت ہے تب تک ہدایت ہے اب یہ اتنا بلند منصب ہے کہ ملائکہ نے کہا کہ اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء۔ کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو فساد کریں۔ اور خونریزی کریں۔ بس بس۔ غیر متوازن الفاظ کبھی کبھی ناسمجھی سے استعمال کرلئے جاتے ہیں۔ شاید آپ نے سُنا ہو یا کسی نے کہا ہو کہ ملائکہ نے اعتراض کیا۔ یاد رکھیے ملائکہ جو ہیں وہ عصمت فطری کی منزل پر فائز ہیں اور قرآن کہہ رہا ہے کہ لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون۔ وہ اللہ پر بات کرنے میں سبقت ہی نہیں کرتے وہ وہی کرتے ہیں جو اس کا حکم ہوتا ہے تو اب فرشتوں کے لئے یہ کہنا کہ انہوں نے اعتراض کیا، تو میں ہرگز نہیں کہوں گا کہ اعتراض کیا میں بس یہ کہوں گا کہ متعجبانہ سوال کیا اور اب یہ ذرا سی علمی بات ہے کہ کوئی اطلاع دی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال ہے۔ کوئی بات پوچھی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال نہیں۔ فرشتہ خود کچھ تھوڑی کہہ رہا ہے وہ تو ایک بات پوچھ رہا ہے۔ تو پوچھنے میں جھوٹ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اور پھر ملک نے کام کیا کیا ہے۔ ملک نے کام

یہ کیا کہ نوعِ انسان کی زندگی کا ایک تاریک رُخ لیا۔ جو بلا شبہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسان فساد نہیں کرتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسان خونریزی نہیں کرتا۔ تو ایک تاریک رُخ لیا انسان کا جو اس کی نظر میں بہت تاریک تھا اور فساد تو بلاشبہ تاریک ہے ہی اور خونریزی بھی جو بطور فساد ہو اس کے تاریک ہونے میں کیا شبہ ہے۔ تو اس رُخ کو لیا جو بیشک ہے اور اپنی زندگی کا روشن پہلو لیا جو حقیقتاً ہے لیکن انسان کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ ملک تسبیح نہیں کرتا تقدیس نہیں کرتا۔ جو اپنی صفت تسبیح و تحلیل کی بتائی وہ حقیقتاً ہے جو عام انسانوں کی صفت بتائی فساد اور خونریزی وہ بھی ہے۔ ہر جز صحیح۔ بس کام یہ کیا کہ دونوں کو ملا کر پوچھ لیا۔ اپنی زندگی کا روشن رُخ۔ ان کی زندگی کا تاریک رُخ۔ ان دونوں کو ملا کر پوچھ لیا کہ کیا انہیں مقرر کیا جائے گا۔ ہمیں نہیں۔ نتیجہ پھر ملک نے نہیں نکالا کہ پھر ہم زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ یہ نتیجہ ہوتا جھوٹ۔ یہ نتیجہ ہوتا غلط۔ یہ نتیجہ ملک نے نہیں نکالا۔ اسے سادہ لوح انسانوں پر چھوڑا کہ وہ یہ ہی نتیجہ نکالیں گے۔ مگر یہ پوچھا ہی کیوں۔ میں نے کہا کہ۔ یہ سوال ہی کیوں کیا۔ تو یاد رکھیے کہ سوال کرنے کا حق تو بہر حال انہیں یوں تھا کہ وہ بارگاہ قدس کے طالب علم ہیں اور طالب علم کی سمجھ میں جو بات نہ آئے اسے اُستاد سے پوچھنے کا حق ہے۔ متعلم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اجازت لازمی طور پر حاصل ہے ورنہ فریضۂ تعلیم ادا ہی نہیں ہوگا۔ معلم ہونے کا رشتہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ طالب علم کو حق دے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے مجھ سے پوچھنا۔ اور یہاں وہ پوچھنا کسی مقصدِ الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک اگر وہ یہ نہ پوچھتے تو ایک مقصدِ الٰہی پورا ہونے سے رہ جاتا۔ وہ مقصدِ الٰہی کیا ہے۔ ایک تو جو میں پہلے کام لے چکا ان کے اس سوال سے وہ یہ ہے کہ مقصد کی جلالت نمایاں ہوئی کہ یہ منصب ایسا بلند ہے کہ ملک کی نگاہ طلب بھی پڑتی ہے۔ اب خلقِ خدا کے لئے انتباہ ہے کہ اسے کبھی ارزاں نہ بنا لینا۔

اتنا اُونچا ہے یہ منصب۔ اور وہ بھی اسی نام سے جسے تم نے ارزاں بنایا۔ یہاں اعلان جو کیا گیا وہ اسی نام سے۔ کہ اسے ارزاں نہ بنا لینا۔ یہ ایک مقصد ہے جو میں پہلے یہ کام لے چکا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملک نے یہ سوال کیا اور خالق نے وہ جواب دیا جو بعد میں آئے گا۔ یہ تمام دُنیا کو دکھانا ہے کہ دیکھو اس منصب کا اختیار الیسا یری ذات سے خاص ہے کہ جس میں ملک کے معصوم مشورہ کو بھی دخل نہیں ہے چہ جائیکہ خطاکاروں کا اجماع یا شوریٰ۔ صلوٰۃ۔

بس اب آیت پوری پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بعد کے اجزا سے متعلق جو باتیں ہیں وہ کل عرض ہوں گی کہ خالق نے جواب دیا کہ اِنّی اعلم مالا تعلمون۔ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس پر تبصرہ کل ہوگا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اصول نیابت شروع یہاں سے یہ ہوا۔ نائب ابھی میں نے کہا کہ وہ وہ کام کرے جو اس کا کام ہو جس کے کام کو وہ اپنا کام کہہ سکے۔ اور جس کے کام کو دنیا اس کا کام کہہ سکے وہ نائب ہے تو انبیآ اللہ کے نائب ہیں مرسلین اللہ کے نائب ہیں۔ ہمارے نزدیک آئمہ حق اللہ کے نائب ہیں۔ آدم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ نوح اپنے دَور میں خلیفۃ اللہ تھے۔ ابراہیم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ موسیٰ وعیسےٰ اپنے اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے اور ہمارے پیغمبر بلا قید وقت خلیفۃ اللہ تھے۔ صلوٰۃ۔

بہرحال عملی حیثیت سے اپنے دور میں جب اس دار دنیا میں تشریف رکھتے تھے تو جو جو ہدایتیں فرماتے تھے۔ وہ بحیثیت خلیفۃ اللہ کے تھیں اور جب دنیا سے تشریف لے گئے تو جو ان کی جگہ پر ہدایت خلق کے منصب پر ہو وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اس طرح ایک بڑی مشکل جو اکثریت کو پیش آئی وہ ہمارے ساتھ پیش نہیں آئی۔ یعنی اکثریت کو یہ مشکل پیش آئی۔ متفقہ بات ہے کہ جب پیغمبر خدا دنیا سے اٹھے اور دنیا نے اپنا نظام بنام خلافت چلایا۔ تو اب پہلی فرد۔ تو انہوں نے کہنا شروع

کیا خلیفۂ رسول اللہ۔ بیت کھلی ہوئی بات ہے غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر دنیا سے گئے ہیں۔ ہم ان کا جانشین بنا رہے ہیں۔ تو خلیفۂ رسول اللہ۔ تو اب جو آتا ہے وہ کہتا ہے السلام علیک یا خلیفۂ رسول اللہ۔ سلام ہو آپ پر اے خلیفۂ نبی۔ سلام ہو آپ پر اے رسول اللہ کے خلیفہ۔ اب اس وقت وہ بعد کی مشکل ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔ کوئی دقت نہ ہوئی عمر گزر گئی۔ مختصر تو ہوتی ہے عمر۔ وہ اتنے دن تک کہتے رہے خلیفۂ رسول اللہ۔ اب نمبر بڑھا نمبر جو بڑھا۔ تو خود صاحب اقتدار جو موجود تھے۔ اب ان کے ذہن میں دشواری پیدا ہوئی۔ خود ان کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوئی کہ صاحب اب میں کیا کہا جاؤں۔ اب وہ بیچ میں ایک کڑی آگئی۔ تو اب علم معانی و بیان کی ہمارے ہاں ایک اصطلاح ہے تتابع اضافات۔ یعنی پے در پے اضافت۔ تو اب رسول اللہ کا خلیفہ۔ تاکہ رسول تک پہنچا یا جائے۔ بغیر اس کے تو تقدس نہیں پیدا ہو گا۔ تو رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ خیر صاحب تھوڑی سی تو زحمت ہوئی ہے۔ یونہی سہی۔ اب آگے بڑھے تو دو اضافتیں آئیں۔ رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب ذہن میں ہے کہ یہ تو سلسلہ رہے گا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا کی کسے خبر تھی کہ وہ آکر اس سلسلے کو ختم کر دے گا۔ تو سلسلہ تو یہ تھا کہ رہے۔ تو صاحب یہ بڑی زحمت بے جا ہے۔ تو کیونکر حل ہو اس کا۔ مجمع کیا گیا۔ مجلس شوریٰ قائم ہوئی اور اسمیں پیش کیا گیا کہا گیا کہ یہ بڑی مشکل ہے۔ تمہاری سمجھ میں اب تک نہ آئی۔ لیکن بحمد اللہ میری سمجھ میں یہ مشکل آئی کہ اب کیا ہو۔ تم بتاؤ اس کا حل کیا ہو۔ یعنی مشکل سمجھ میں آگئی ہے حل سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ حل مشکل کے لئے مدد کی ضرورت ہے تو بتاؤ کہ کیا ہو۔ نکتہ رسی سے کام لے کر انہیں نہیں بلوایا گیا تھا کہ جس کا کام ہی مشکلکشائی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ احساس تھا کہ وہ جو بنیادی طور پر۔ بنیادِ مشکل سے الگ ہے۔ اس سے متفق نہیں ہیں۔ بہرحال

موجود لوگوں میں سے کوئی فلاں جھگڑا تھا۔ سمجھ دار آدمی ذہین۔ تو اس نے یہ کہا کہ صاحب اس جھگڑے ہی کو چھوڑ دیجئے اور سے ہم مومنین ہیں آپ ہمارے امیر ہیں۔ لہٰذا یہ خلیفہ کا جھگڑا ہی ختم کیجیے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بعد میں ختم کیا۔ انہوں نے اسی وقت ختم کر دیا کہ صاحب یہ جھگڑا نہیں۔ تو سُن لیا آپ نے کہ ہم مومنین اور آپ ہمارے امیر کہا کیا عمدہ رائے تم نے تجویز کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے ہی قدم میں رسول سے تو رشتہ منقطع ہو گیا۔ اب جمہور سے رشتہ رہ گیا۔ تو جناب اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور نسل در نسل چلتا رہا اور ہر دور میں چلتا رہا۔ جب تک کہ وہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اور جناب ہمارے لئے یہ مشکل نہ پہلے تھی نہ بعد میں ہوئی۔ ہمارے نزدیک بیچ میں کسی مخلوق کا قدم آتا ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک رسول اللہ بھی خلیفۃ اللہ علی مرتضےٰ بھی خلیفۃ اللہ حسن مجتبےٰ بھی خلیفۃ اللہ حسین بھی خلیفۃ اللہ۔ پورا سلسلہ ہے خلفائے خدا کا۔ سب نائب خدا ہیں۔ نائب خدا بھی ہیں اور نائب رسول بھی ہیں۔ نائب کا نائب بھی نائب ہی ہوتا ہے لہٰذا اس کے خلاف بات نہیں ہے۔ تو وہ اصول کہ جو اس کا کام ہو وہ اُس کا کام ہو۔ تو یہ نیابت کا تقاضا۔ اور جو اس کے ساتھ عمل ہو وہ اس کے ساتھ عمل۔ یہی نیابت کا تقاضا ہے۔ اب میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھتا ہوں۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یعنی پہلی اضافت ان کی طرف اطاعت کی پھر دہی اسکی طرف اضافت۔ کیا مطلب۔ چونکہ نائب ہیں لہٰذا جو ان کی اطاعت وہ اس کی اطاعت

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ بیعت ہے ان کے ہاتھ پر مگر وہ کہہ رہا ہے کہ میری بیعت ہے یہ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر ورنہ وہ جسم و جسمانیات سے بری اس کے ہاتھ کہاں سے آئے اسی دن کے لئے تو

کیا خلیفۃ رسول اللہ۔ بیت کھلی ہوئی بات ہے غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر دنیا سے گئے ہیں۔ ہم ان کا جانشین بنا رہے ہیں۔ تو خلیفۃ رسول اللہ۔ تو اب جو آتا ہے وہ کہتا ہے السلام علیک یا خلیفۃ رسول اللہ۔ سلام ہو آپ پر اے خلیفہ نبی۔ سلام ہو آپ پر اے رسول اللہ کے خلیفہ۔ اب اس وقت وہ بعد کی مشکل ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔ کوئی دقت نہ ہوئی عمر گزر گئی۔ مقرر تو ہوتی ہے عمر۔ وہ کتنے دن تک کہتے رہے خلیفۃ رسول اللہ۔ اب نمبر بڑھا۔ نمبر جو بڑھا۔ تو خود صاحب اقتدار جو موجود تھے۔ اب ان کے ذہن میں دشواری پیدا ہوئی۔ خود ان کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوئی کہ صاحب اب میں کیا کہا جاؤں۔ اب وہ بیچ میں ایک کڑی آگئی۔ تو اب علم معانی و بیان کی ہمارے ہاں ایک اصطلاح ہے تتابع اضافات۔ یعنی پے در پے اضافت۔ تو اب رسول اللہ کا خلیفہ۔ تا کہ رسول تک پہنچایا جائے۔ بغیر اس کے تو تقدس نہیں پیدا ہوگا۔ تو رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ خیر صاحب تھوڑی سی تو زحمت ہوئی ہے۔ یونہی سہی۔ اب آگے بڑھے تو دو اضافتیں آئیں۔ رسول اللہ کے خلیفہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب ذہن میں ہے کہ یہ تو سلسلہ رہے گا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا کی کسے خبر تھی کہ وہ آکر اس سلسلے کو ختم کر دے گا۔ تو سلسلہ تو یہ تھا کہ رہے۔ تو صاحب یہ بڑی زحمت ہے جا ہے۔ تو کیونکر حل ہو اس کا۔ مجمع کیا گیا۔ مجلس شوریٰ قائم ہوئی اور اس میں پیش کیا گیا کہا گیا کہ یہ بڑی مشکل ہے۔ تمہاری سمجھ میں اب تک نہ آئی۔ لیکن بحمد اللہ میری سمجھ میں یہ مشکل آئی کہ اب کیا ہو۔ تم بتاؤ اس کا حل کیا ہو۔ یعنی مشکل سمجھ میں آگئی ہے حل سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ حل مشکل کے لئے مدد کی ضرورت ہے تو بتاؤ کہ کیا ہو۔ نکتہ رسی سے کام لے کر اُسے نہیں بلوایا گیا تھا کہ جس کا کام ہی مشکلکشائی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ احساس تھا کہ وہ جو بنیادی طور پر۔ بنیاد مشکل سے الگ ہے۔ اس سے متفق نہیں ہیں۔ بہر حال

موجود لوگوں میں سے کوئی فلاں جھگڑتا تھا۔ سمجھ دار آدمی ذہین۔ تو اس نے یہ کہا کہ صاحب اس جھگڑے ہی کو چھوڑ دیجئے اور سے ہم مومنین ہیں آپ ہمارے امیر ہیں۔ لہٰذا یہ خلیفہ کا جھگڑا ہی ختم کیجئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بعد میں ختم کیا۔ انہوں نے اسی وقت ختم کر دیا کہ صاحب یہ جھگڑا نہیں۔ تو سُن لیا آپ نے کہ ہم مومنین اور آپ ہمارے امیر کہا کیا عمدہ رائے تم نے تجویز کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے ہی قدم میں رسول سے تو رشتہ منقطع ہو گیا۔ اب جمہور سے رشتہ رہ گیا۔ تو جناب اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور نسل در نسل چلتا رہا اور ہر دَور میں چلتا رہا۔ جب تک کہ وہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اور جناب ہمارے لئے یہ مشکل نہ پہلے تھی نہ بعد میں ہوئی۔ ہمارے نزدیک بیچ میں کسی مخلوق کا قدم آتا ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک رسول اللہ بھی خلیفۃ اللہ علی مرتضےٰ بھی خلیفۃ اللہ حسن مجتبےٰ بھی خلیفۃ اللہ حسین بھی خلیفۃ اللہ۔ پُورا سلسلہ ہے خلفائے خدا کا۔ سب نائب خدا ہیں۔ نائب خدا بھی ہیں اور نائب رسول بھی ہیں۔ نائب کا نائب بھی نائب ہی ہوتا ہے لہٰذا اس کے خلاف بات نہیں ہے۔ تو وہ اصُول کہ جو اس کا کام ہو وہ اُس کا کام ہو۔ تو یہ نیابت کا تقاضا۔ اور جو اس کے ساتھ عمل ہو وہ اس کے ساتھ عمل۔ یہی نیابت کا تقاضا ہے۔ اب میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھتا ہوں۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یعنی پہلی اضافت ان کی طرف اطاعت کی پھر وہی اسکی طرف اضافت۔ کیا مطلب۔ چونکہ نائب ہیں لہٰذا جو ان کی اطاعت وہ اس کی اطاعت ان الذین یبایعونک اذ یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ بیعت ہے ان کے ہاتھ پر مگر وہ کہہ رہا ہے کہ میری بیعت ہے یہ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر ورنہ وہ جسم و جسمانیات سے بری اس کے ہاتھ کہاں سے آئے اسی دن کے لئے تو

نائب بنایا ہے۔ تو جو اس کے ساتھ برتاؤ وہ اس کے ساتھ برتاؤ۔ جو ان کی نافرمانی کرے اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ نیابت کا تقاضا یہاں نظر آرہا ہے۔ جناب والا بس۔ یہ اصول سمجھ لیجیے کہ جو اس کے ساتھ ہے وہ اس کے ساتھ اور جو اس کا کام وہ اس کا کام۔ اب جہاں جہاں یہ بات نظر آئے سمجھ لیجیے کہ یہ نیابت کی دوسری نظیر ہے یعنی نائب ہونے کا ثبوت ان لفظوں سے ہوتا ہے۔ اب دیکھیے متفق علیہ حدیث صحاح ستہ کی ہے کہ رسول نے کہہ دیا یا علی حربک حربی سلمک سلمی۔ یا علی تمہاری جنگ میری جنگ۔ اس دوسری لفظ کا ترجمہ ذرا مشکل سے ہوتا ہے لوگ ترجمہ کرتے ہیں تمہاری صلح مگر صلح کی لفظ سے ذہن میں آتا ہے لڑنے کے بعد صلح کرنا تو اس کے معنی ہیں کہ پہلے لڑے۔ شاعر نے کہا ہے کہ لطف مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ اس سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوگا جو رسول نے کہا ہے۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑ کر آدمی پھر صلح کرے۔ بلکہ حرب کے مقابلے میں جو چیز ہوتی ہے تم سے جنگ مجھ سے جنگ۔ اور اب میں اردو زبان میں کہنے کی کوشش کروں کہ تم سے ملاپ رکھنا۔ ملاپ کرنا نہیں۔ تم سے ملاپ رکھنا مجھ سے ملاپ رکھنا ہے اور بعض لفظیں ہیں جو ہمارے محاورہ میں نہیں تھیں مگر اخباروں سے یاد آتی ہیں وہ ادائے مطلب میں مجھے یہاں مدد پہنچائیں گی۔ تو جناب یہ ہمارا محاورہ نہیں تھا مگر اخباروں میں بہت دیکھا ہے۔ وہ میرے مطلب کی بات ہے وہ کیا۔ کہ ان سے جنگ مجھ سے جنگ اور تم سے ناجنگی مجھ سے ناجنگی۔ یہ حرب اور سلم دونوں مصدر ہیں۔ اردو میں مصدر کے آخر میں نا ہوتا ہے۔ حرب کے معنی لڑنا اور سلم کے معنی نہ لڑنا۔ حرب اور سلم دونوں عربی زبان میں مصدر ہیں۔ ہر زبان میں مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے کبھی مفعول کی طرف۔ کوئی دوست آپ کے لیے تھے کہ بچہ پر غصہ آیا تو اسے بے دردی سے مار رہے ہیں۔ آپ

ملاقات کر گئے۔ وہ بچے کو ایسی شدت سے مار رہے تھے کہ آپ ٹھہرے نہیں آگے گئے واپس دوسرے دن انہوں نے کہا ارے بھئی آپ آئے اور ٹھہرے نہیں تو ان کے جواب میں آپ کہیئے گا کہ تمہاری مار سے مجھے ایسی اذیت ہوئی ایسی تکلیف ہوئی تمہاری مار سے کر مجھ سے دیکھا نہ گیا میں چلا گیا۔ کیا مطلب۔ یہ اضافت فاعل کی طرف ہے۔ تمہارا مار سے۔ یعنی تم جو مار رہے تھے اپنے بچے کو۔ یہ ہوئی اضافت فاعل کی طرف۔ اب خدانخواستہ کوئی آپ کے شناسا۔ انہیں راستے میں کسی نے زدوکوب کر دیا۔ آپ کو خبر پہنچی۔ آپ سے ملاقات ہوئی۔ تو آپ نے بطور ہمدردی کہا کہ بھئی تمہاری مار سن کر مجھے بہت تکلف ہوئی اب تمہاری مار کے کیا معنی ہوئے یعنی تم پر جو مار پڑی۔ تو یہ اضافت مفعول کی طرف ہوئی۔ وہاں اضافت فاعل کی طرف تھی یہاں تمہاری مار جو لفظ ہے اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے اب رسول فرمارہے ہیں یا علی حربک حربی۔ حدیث ہے متفق علیہ۔ دونوں معنی ہیں۔ دنیا کو جو پسند ہوں۔ دونوں مفہوم پیش کئے دیتا ہوں۔ اگر اضافت فاعل کی طرف ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ یا علی تمہارا جنگ کرنا میرا جنگ کرنا ہے۔ تو اب جس جس سے بھی علی نے جنگ کی ہو اُسے سمجھیئے کہ رسول اللہ نے جنگ کی اگر اضافت مفعول کی طرف ہو تو معنی ہو گئے کہ تم سے جنگ کرنا مجھ سے جنگ کرنا ہے تو اب تاریخ میں دیکھ لیجیئے۔ جس جس نے ان سے جنگ کی ہو۔ اب نہ رشتے دیکھیئے گا نہ صنف دیکھیئے گا۔ اب ایک خاتون معظمہ۔ وہ بھی متفق علیہ حدیث ہے کہ فرمایا فاطمہ بضعۃ منی۔ فاطمہ میرا ایک جز ہے من اذاھا فقد اذانی جس نے اسے تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی ومن اغضبھا فقد اغضبنی اور جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا۔ میں نے ابھی کہا کہ یہ ترکیب کہ جو اس کے ساتھ ہو وہ میرے ساتھ ہوا۔ یہ نیابت کا پتہ دیتا ہے۔ اب چاہے اس قسم نیابت

کا مجھے نام نہ معلوم ہو۔ نام ہی سے فرق نہیں پڑتا۔ کبھی وہ نیابت بصورت نبوت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورت رسالت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورت امامت ہوتی ہے۔ اب اس نیابت کا خواہ مجھے نام معلوم نہ ہو۔ مگر ان لفظوں کی رو سے ماننا پڑے گا کہ یہ بھی نائب رسول ہیں اور بچوں کے لئے کہا کہ من احبّھما فقد احبّنی ومن اغضبھما فقد اغضبنی۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان کو غضبناک کیا اس نے مجھ کو غضبناک کیا۔ جو نیابت کے تقاضے ہیں سب نظر آ رہے ہیں یا نہیں۔ یہ سب احادیث پیغمبر خدا ہیں اور اس سے پہلے قرآن مجید کی آیتیں تھیں جو رسول کی نیابت کے بارے میں میں نے پیش کیں۔ اور اب بہت جانی پہچانی شخصیت۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جنکی کتاب ردّ شیعہ میں تحفہ اثنا عشریہ۔ اپنے طبقہ کے لئے مایہ ناز کتاب ہے انکے مصنف۔ تو جناب ان کی کتاب ہے سرّالشہادتین۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمارے رسول کو وہ سب فضیلتیں عطا کیں جو تمام انبیاء کو ملیں بلکہ اس سے بالاتر لیکن ایک صفت انبیاء کو ملی تھی جو براہِ راست ہمیں ان کے ہاں نظر نہیں آتی۔ وہ ہے شہادت۔ لہٰذا خالق کو یہ منظور ہوا کہ صفتِ شہادت ان کے فضائل میں رہ بھی نہ جائے اور براہِ راست ان پر کسی دشمن کا وار کام بھی نہ کرے اس کے لئے اللہ نے ان کو دو نواسے عطا فرمائے اور شہادت کی دو قسمیں ہیں ایک شہادت سرّی اور ایک شہادت جہری۔ مخفی شہادت زہر سے ہوتی ہے۔ اور علانیہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔ دونوں شہادتیں دونوں نواسوں پر تقسیم ہو گئیں۔ حسنؑ کے حصے میں شہادت سرّی آئی اور حسینؑ کے حصے میں شہادت جہری آئی۔ یعنی کھلم کھلا شہادت۔ اور ان کے ذریعہ سے اللہ نے صفتِ شہادت کو فضائل رسول میں شامل کر دیا۔ اس کا نتیجہ۔ انہوں نے فرمایا اگر وہ میرے

سامنے ہوتے تو میں بڑے احترام سے عرض کرتا۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں بڑے احترام سے عرض کرتا کہ یہاں تک تو آپ نے فرما دیا جو میں سوال کروں اس کا جواب دیجیے کہ جب ان کی شہادت اُن کی شہادت تو جو اِن کا قاتل ہے وہ اُن کا قاتل اب جناب نہ ہچکچایئے گا جتنے زور سے آپ نے وہ بات کہی اتنے ہی زور سے میری بات کا جواب دے۔ دیکھیے اور سوا ایک جواب کے دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو منطقی طور پر قبول کرنا پڑے گا کہ جو اِن کا قاتل وہ اُن کا قاتل۔ یعنی رسول کا قاتل۔ اب یہ جملہ ان کا ابھی تک ہے مگر کھول کر دونوں ٹکڑے کہہ دیجیے کہ جو حسن کا قاتل وہ رسول کا قاتل اور جو حسین کا قاتل وہ بھی رسول کا قاتل۔ اب کوئی بحث نہ کیجیے گا کہ قاتل حسین کو یہ یہ کہا جاتے یا نہیں۔ بس آپ جو جو رسول کے قاتل کو کہہ سکتے ہیں وہ کہیے۔ ایک اور سوال کا جواب ہو جاتے ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کی منطقی باتیں سوچ سوچ کر ہماری عزاداری پر کہی جاتی ہیں۔ یعنی ہاتھ ہم اپنے سینوں پر مارتے ہیں دل دکھو سروں کے دہلتے ہیں۔ روتے ہم ہیں صدمہ دوسروں کو ہوتا ہے۔ طرح طرح کے منطقی سوال سامنے آتے ہیں کہ وفات رسول پر اتنا غم و ماتم نہیں ہوتا۔ جتنا امام حسین کی شہادت پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کو رسول سے بڑھاتے ہو۔ تو اب چڑھتا ہوا جواب تو یہ ہے کہ میں یہ کہوں کہ اچھا صاحب نواسے کو ہم نے حصہ میں لے لیا ہے رسول کو آپ اپنے حصہ میں لے لیجیے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس میں ہم اگر آپ کے ساتھ شریک ہوں گے آپ اس میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ جناب شاہ عبدالعزیز کے مطابق سال میں دو تاریخیں ہیں ایک وفات رسول کی ایک شہادت رسول کی۔ وہ ربیع الاوّل کی کسی تاریخ کو ہے اور یہ جو دس محرم کو ہے یہ شہادتِ رسول کی تاریخ ہے۔ اب آپ بتایئے کہ وفات کی یادگار قائم

کریں یا شہادت کی اور اب مصائب میں میں کہتا ہوں کہ اسے ہم سے کیوں پوچھتے ہیں آسمان سے پوچھیے کہ وفات رسولؐ پر خون کیوں نہیں برسا حسینؑ کی شہادت پر کیوں خون برسا۔ اسے سید علامہ کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کی مطالب السئول میں دیکھ لیجیے۔ علامہ ابن حجر مکی کی صواعق محرقہ میں دیکھ لیجیے خواہ سبط ابن جوزی کی تذکرہ خواص الائمہ میں دیکھ لیجیے۔ کہ دس محرم کے بعد چالیس دن تک جو کپڑا پھیلایا جاتا تھا زیر آسمان اس پر خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔ اہل عزا دیکھیں کہ عاشورے ہی کی تاریخ اُدھر سے مقرر کی ہوئی نہیں ہے بلکہ چہلم کی تاریخ بھی اُدھر کی مقرر کی ہوئی ہے۔ یعنی اس نے بیس صفر تک کائنات کو سوگوار رکھا ہے۔ چہلم کے دن تک بیس صفر تک خون برس رہا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ پیغمبر خدا کے غم میں سیدہ عالم رو رہی تھیں علی رو رہے تھے حسنین رو رہے تھے اسے صحابہ میں سے بھی جن جن کو رونے کی فرصت تھی وہ رو رہے تھے سب ہی سیاستداں تھوڑی تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں کہا کہ بعض صحابہ گریبان پھاڑ پھاڑ کر جنگلوں میں نکل گئے اور مدینہ میں کہرام برپا تھا یہ تاریخ سے ثابت ہے تو یقیناً یہ سب رو رہے تھے مگر حسینؑ کے غم میں تو رسول اللہ رو رہے ہیں اور پھر دیکھئے کہ جناب ام سلمہ نے خواب دیکھا اور یہ بھی متفق روایت ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان کی یہ مجال نہیں کہ میری صورت میں آئے یہ صحیح مسلم و بخاری کی متفق حدیث ہے۔ اب دیکھئے صحیح ترمذی میں کہ جناب ام سلمہ۔ اب کوئی اور یہ خواب دیکھتا تو کوئی یہ بحث پیدا کر سکتا تھا کہ وہ رسول کی صورت کو کیا جانے لیکن جناب ام سلمہ کے بارے میں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ رسول نے ایک خاک دی تھی کہ اسے رکھ چھوڑو۔ یہ بھی صحیح ترمذی میں ہے کہ جب یہ خون ہو جائے تو سمجھنا میرا فرزند حسین شہید ہو گیا۔ خاک جب حسینؑ کے سفر کے بعد دیکھتی تھیں تو دل کو ڈھارس ہو جاتی تھی کہ حسینؑ زندہ ہیں

اس وقت گھر والوں کو کون بتاتا کہ مسافر حسین پر کیا بیت رہی ہے تو جب دل الجھتا تھا تو ام سلمہ اس خاک کو دیکھ لیتی تھیں لیکن جب محرم کا چاند ہو گیا تو دل کی الجھن اتنی بڑھ گئی کہ خاک کو دیکھ کر وقتی تسلی تو ہوتی ہے مگر جب دم الجھتا ہے تو مکمل طور پر دل کو قرار نہیں آتا۔ اب روز خاک پر نظر ڈالنے لگیں۔ اب جو عشرہ کا دن آیا تو خاک کو اصلی حالت پر دیکھ رہی ہیں۔ تب بھی دل نہیں ٹھہرتا ورنہ بار بار آکر کیوں دیکھتیں ارباب عزا۔ دوپہر تک دیکھا خاک اصلی حالت پر ہے۔ پھر دل کو قرار نہیں۔ راز سمجھ میں نہیں آتا۔ خاک کی رنگت نہیں بدلی۔ خاصیت بدل گئی۔ رنگت وہی ہے لیکن اب دل کو تسلی نہیں ہوتی اُسے دیکھ کر۔ ارے میں کہتا ہوں پہلے جب بھی دیکھا تو خاک ہی تو بتا رہی ہے کہ حسین زندہ ہیں۔ صادق رسول کا قول ہے خاک اصلی حالت پر ہے لیکن کیا عباس بھی زندہ ہیں کیا علی اصغر بھی زندہ ہیں کیا قاسم بھی زندہ ہیں کیا فاطمہ صغریٰ کا وہ ننھا مسافر بھائی بھی زندہ ہے۔ کیونکہ حسین زندہ ہیں۔ لہٰذا خاک اصلی حالت پر ہے۔ دن بھر کی تگ و دو سے اور پریشانی سے اتنی تھک گئیں کہ اپنے حجرے میں آکر لیٹ گئیں۔ سونے میں عصر کا ہنگام آیا۔ اب یہ پھر صحیح ترمذی کی روایت ہے۔ عصر کا ہنگام آیا تو رسول اللہ سامنے سر برہنہ نظر آئے۔ سر و ریش پر خاک پڑی ہوئی بال بکھرے ہوئے۔ پوچھتی ہیں یا رسول اللہ یہ کیا عالم ہے۔ فرماتے ہیں تمہیں نہیں خبر میرا فرزند حسین قتل ہو گیا۔ فرماتے ہیں میں صبح سے اسوقت تک کربلا میں تھا۔ یہ میرے سر و ریش پر خاک کربلا ہے یہ حسین اور انصار حسین کا خون ہے جو دن بھر میں جمع کرتا رہا ہوں۔ اہل عزا فرماتے ہیں دن بھر میں کربلا میں رہا ہوں تو علی اکبر کے سینے پر برچھی لگی رسول اللہ دیکھ رہے تھے عباس کے شانے کٹے رسول اللہ دیکھ رہے تھے۔ اور ننھا مسافر کربلا کا حسین کے ہاتھوں پر نشانہ تیر ستم ہوا رسول اللہ کی آنکھوں کے سامنے۔ اور وہ جسے کاندھے پر چڑھاتے تھے جسے سینے پر سلاتے تھے اسکو تہہ خنجر دیکھا۔

مجلس ہشتم

فلسفۂ جہاد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا۔

قرآن مجید میں مستقل سورۃ ہے جس کا نام سورۃ فتح ہے اور اسی آیت کی مناسبت سے جو آغاز سورۃ ہے یہ سورۃ انا فتحنا کے نام سے بھی مشہور و معروف ہے اور بسم اللہ کے بعد یہ اس کی پہلی آیت کا پہلا جزو ہے ارشاد ہو رہا ہے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ سے کہ یقیناً ہم نے تم کو ایک بہت ہی کھلی ہوئی اور نمایاں فتح عطا کی ہے۔ فتح اور شکست یہ آپ کی اُردو زبان میں بھی مستعمل ہے اور اس کا اس سے زیادہ آسان اُردو ترجمہ بھی معلوم ہے جیت اور ہار۔ جب ہم فتح کی لفظ سنیں تو اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں فوراً جنگ آئے گی اور جب خالق نے کہا کہ ہم نے آپ کو بہت کھلی ہوئی فتح عنایت کی تو فوراً ذہن میں یہ آئے گا کہ کوئی بہت بڑی جنگ تھی جس میں بہت نمایاں فتح حاصل ہوئی اگر کتابوں پر نظر نہ ہو اور انسان قرآن کا مطالعہ نہ کئے ہوئے ہو اور یہ آیت سنے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی تو یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ بہت بڑی جنگ تھی۔ جس کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی۔ جس کامیابی کو خالق نے عظیم کامیابی کہا اب ہم مطالعہ شروع کر دیں گے غزوات رسول کا کہ حضرت نے کون کونسی

جنگیں لڑیں اور ان چھوٹی جنگوں کو جن میں حضرت کسی کو سردار بنا کر بھیج دیتے
تھے انہیں نظر انداز کر دیں گے کیونکہ وہ ایسی اہم نہیں تھیں جبھی تو آپ خود تشریف
نہیں لے گئے۔ انہیں اصطلاحاً سریہ کہتے ہیں۔ جہاں کسی دوسرے کو سردار بنا کر بھیج
دیتے تھے۔ غزوات وہی ہیں جن میں حضرت خود تشریف لے گئے۔ بس ایک
جنگ ہے جو اصطلاح کے مطابق سریہ ہی جانے چاہیئے مگر نہ معلوم کیوں محاورہ
بن گیا کہ اُسے غزوہ موتہ کہنے لگے۔ اب اس پر نظر ڈالیں گے اور جب آیت
کے مفہوم کو صرف اپنی عقل سے چاہیں گے کہ آخر وہ کونسی جنگ ہو سکتی ہے کہ
جس میں کامیابی کو خدا نے نمایاں کامیابی اور فتح مبین کہا ہو۔ تو ہمارا ذہن بہت
سے پہلوؤں کو محسوس کرتا ہے کہ کن پہلوؤں سے وہ فتح ہو تو فتح مبین ہو گی۔
پہلی صورت یہ ہے کہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے فتح کی کوئی صورت ہی نہ
ہو۔ ساز و سامان ہی اتنا نہ ہو کہ جنگ سر ہو سکے اور پھر اس کے باوجود نتیجے
میں فتح ہو تو بالکل برمحل ہو گا اگر وہاں خالق ارشاد فرمائے کہ ہم نے آپ کو فتح
مبین عطا کی یعنی اسباب تو ایسے نہ تھے۔ اب اس معیار پر دیکھیں تو جنگ بدر
سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سب سے پہلی اور اہم لڑائی اسلام کی جس کو جنگِ
بدر کہتے ہیں اسی بدر کی جو صورتِ حال ہے اس کو پیش کر کے میں اس دنیا کو
دعوت دیتا ہوں جو کہتی ہے کہ اسلام کو تلوار سے پھیلایا گیا اور رسول کی لڑائیوں
کو معاذ اللہ یہ سمجھتی ہے کہ یہ ان کی طرف سے جارحیت کا نتیجہ تھیں۔ میں
کہا کرتا ہوں کہ تمام لڑائیوں کا سنگ بنیاد جنگِ بدر ہے تو اب جنگ بدر
کی صورتِ حال پر غور کیجئے۔ انصاف کے ساتھ۔ پھر آپ کی عقل یہ کہے کہ
یہاں رسول نے خود اقدام کیا ہو گا تو میں یہ سمجھوں گا کہ ابتدا انہوں نے کی ہے
لیکن اب جنگِ بدر کی صورتِ حال جو ہے وہ متفق علیہ تاریخ میں یہ نظر آتی ہے

کہ اُدھر ایک ہزار کے قریب لشکر اور ساز و سامان جنگ سے بالکل آراستہ اور پیراستہ اور اِدھر اُن کے مقابلے میں کل جماعت تین سو تیرہ آدمی اور ان تین سو تیرہ میں صرف تیرہ تلواریں اور صرف دو عدد گھوڑے۔ تو میں صاحب عقل دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ جس کے پاس سامانِ جنگ یہ ہو کیا وہ خود سے چڑھائی کرے گا۔ آپ اُسے رسول نہ مانئے صرف ایک صاحب عقل انسان سمجھ کر کہیے کہ یہ ساز و سامان جنگ ہو تو کیا وہ ابتدائے جنگ کرے گا۔ یہ صورت حال تو خود بتاتی ہے کہ جنگ کر نہیں رہا ہے بلکہ جنگ کرنا پڑ گئی ہے اور اب نتیجہ کو نہ دیکھیے گا کہ کیا ہوا۔ اس صورتِ حال کو دیکھیے کہ جس کے پاس یہ جماعت ہو اور ایسے ساز و سامان کے ساتھ ہو جس کو کہنا چاہیئے کہ کچھ بھی سامان نہیں۔ اور وہ نکل کھڑا ہو مقابلے کے لئے تو وہ مارنے نکلا ہے یا مرنے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مقصد قربانی پیش کرنے کا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے باوجود اگر فتح ہوئی تو کیا وہ جنگ اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ خالق کہے کہ ان فتحنا لك فتحاً مبيناً۔ ہم نے آپ کو یہ عظیم فتح عنایت کی۔ اب تاریخ کو دیکھیے تو وہ بتائے گی کہ جتنی مکمل شکست بدر میں ہوئی ہے۔ اُس مخالف گروہ کو۔ ایسی شکست کسی جنگ میں نہیں ہوئی۔ یعنی جتنے بڑے سردار تھے جتنے سرغنہ تھے جتنے بڑے بڑے سورما تھے سب اسی جنگ میں تہہ تیغ ہوئے۔ اب قرآن کہہ رہا ہے کہ فرشتے مدد کے لئے آئے تھے۔ خیر فرشتے آئے تھے تو کس نے فتح دی۔ میں کہتا ہوں کہ فرشتے تو بہرحال ضرور آئے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ کمزور دل والوں کی تسلی کے لئے آئے کہ گھبرانا نہیں اگر کبھی ضرورت پڑے گی تو ہم فرشتے بھی بھیج دیا کریں گے۔ یہ تمہاری بشارت کے لئے تمہیں خوشخبری دینے کے لئے فرشتے آئے ہیں مگر دنیا والے خوش ہو گئے

کہ صفت میں فتح مل گئی۔ اور جو حقیقی شجاع تھا۔ میں کہتا ہوں وہ تو افسردہ ہو گیا کہ میرے ہوتے ہوئے فرشتے آ گئے۔ میں موجود تھا اور پھر فرشتے آ گئے۔ حالانکہ اس کی دلجوئی کا خالق نے بڑا اہتمام کیا کہ فرشتے بھی آئے تو اسی کی صورت میں آئے۔ جو کوئی بھی مجروح تھا اس سے پوچھا جاتا تھا تو اسی کا نام لیتا تھا چاہے عداوت ان سے بڑھ جائے لیکن ان کی غیرت شجاعت کو بار محسوس نہ ہو۔ اور ماشاءاللہ صاحبان فہم ہیں اس جملے کو سمجھیں گے جواب عرض کرنا ہے کہ صفت شجاعت کو اس ذات سے ایسی خصوصیت ہو گئی تھی کہ ملک لباس مجاز بھی پہنتا تھا تو شجاعت کے لئے اس سے بہتر صورت اور کوئی نہ ملتی تھی۔ صلوٰۃ۔

بہرحال اب جب فرشتے آئے تو اور زیادہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ سے کہے کہ یہ کھلی ہوئی فتح ہم نے خلاف امید عطا کی۔ یہ ایک سبب ہو سکتا ہے فتح کے نمایاں ہونے کا۔ ایک اور معیار ہو سکتا ہے فتح کے عظیم ہونے کا کہ شکست ہو چکی ہو اور پھر سے ختم ہو جائے۔ ارے ایسی شکست کہ صفحۂ میدان میں کوئی تھا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب کوئی نہیں تھا تو نام لینے کی کیا ضرورت ہے کہ کون کون نہیں تھا۔ شخصیتیں تو گم ہو جاتی ہیں جمہور کے کردار میں۔ تو اس لئے مجھے نام لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کون کون نہیں تھا بس یہ ہے کہ صفحۂ میدان سادہ تھا اور رسول کے پاس کوئی نہ تھا۔ جو تھے وہ شہید ہو گئے اور باقی میدان سے غائب ہو گئے۔ اب ایک کی تلوار ہے اور فتح ہوئی اور وہ ایک شخص وہی تھا جس کے دل پر اس روز میل آیا تھا تو خالق نے کہا کہ آج کچھ بھی ہو جائے۔ آج ملک نہیں آئیں گے اور اسی ایک نے دکھلا دیا کہ کوئی نہ ہے مگر میں جنگ سر کر کے دکھلا دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری شجاعت جمہور کا سہارا نہیں لیتی۔ نہ میری شجاعت جمہور کے سہارے سے ہے نہ امامت جمہور کی

وجہ سے ہے۔ تو اب جناب اسی صورت حال کے باوجود ہر جنگ کو اگر تفصیل سے عرض کروں تو وقت کے اندر مجلس ختم نہ ہو اسی لئے بس ہر جنگ کو چند جملوں میں یہاں دیکھئے۔ کیا آئی انا فتحنا لک فتحاً مبیناً۔ کی آواز۔ اگر اس محل پر آئی ہو تو ہمارے لئے بالکل ذہن نشین ہے۔ ہماری سمجھ میں بالکل آتا ہے کہ خالق گویا ارشاد کر رہا ہے مسلمانوں پر تازیانہ لگاتے ہوئے کہ تم نے شکست میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ ہم تھے جس نے تم کو یہ کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ لہٰذا اب کسی کے ہاتھ سے ہو۔ تو وہ ہمارا ہی تو ہاتھ ہے تو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ آیت اتری۔ اس کے بعد جنگ خندق ہے۔ جنگ خندق میں وہ ایک سورما جس سے خود اپنی جماعت کے نمایاں افراد مجمع کو دھلا رہے تھے کہ اس سے بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے یہ تو اونٹ کے بچے کو سپر بنا لیتا ہے بڑی اہمیت ہے کہ اونٹ کے بچے کو سپر بنایا۔ میں کہتا ہوں کہ جو حقیقی شجاع ہے وہ اس کا عملاً جواب دے گا کہ ارے تمہیں اونٹ کے بچے سے بڑی اہمیت محسوس ہوئی تو سبھی در خیبر کو سپر نہ بنا دوں۔ صلوٰۃ۔

جب اس سورما کے مقابل میں ادھر کا مرد میدان گیا تو پہلے تو رسول نے بھی جانے والے کی اہمیت کو نمایاں کیا اور اس کے مد مقابل کی بھی اہمیت کو نمایاں کیا۔ برز الایمان کلہ الی الکفر کلہ۔ اس میں گویا ادھر والے ہی کو بہت بڑا امتیاز عطا نہیں کیا بلکہ ادھر والے کو بھی دنیائے کفر میں امتیاز عطا کیا ہے۔ کہ پورا ایمان جا رہا ہے پورے کفر کے مقابلے میں۔ یعنی اس ایک کو شکست ہو گئی تو پورے کفر کو ہمیشہ کے لئے شکست ہو گئی اور اس ایک نے فتح حاصل کی تو پورے ایمان کو ہمیشہ کے لئے فتح ہو گئی۔ اس سے بعد کے ارشاد رسول کا مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ اگر یہ فتح نہ ہوتی تو قیامت تک کی عبادتیں کہاں

ہوتیں۔ یہی تو فتح ہونے کے بعد رسول نے فرمایا۔ ضربة علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلین۔ قیامت تک جتنی عبادتیں ہوں گی ان سب سے افضل آج کی یہ ایک ضربت ہے۔ صلوٰۃ۔

تو اب جب کفر کا اتنا طاقتور نمائندہ۔ اس نے شکست کھائی تو اب اس جنگ کے نتیجے کو اللہ ارشاد فرمائے انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ ہم نے آپ کو نمایاں فتح عنایت کی۔ جس سے ہمیشہ کے لئے کفر شکست کھا گیا چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد مشرکین قریش کی کمر ٹوٹ گئی۔ جنگ احزاب کے بعد انہوں نے معرکہ آرائی کی ہمت نہیں کی۔ پھر اور لڑائیاں جو ہوئی ہیں وہ خیبر ہے۔ وہ یہود کے مقابلے میں ہے۔

وہ جو اب تک جنگ کر رہے تھے وہ سب ہمیشہ کے لئے شکست کھا گئے تو اب اسے اللہ کہے تو بالکل صحیح۔ سمجھ میں آنے والی بات۔ اب اس کے بعد جنگ خیبر۔ اب حضور خیبر میں بھی جب مسلسل شکستیں ہو رہی ہوں اور پھر فتح ہو تو وہ فتح مبین ہے یا نہیں اور رسول کی وہ حدیث جو متفق علیہ ہے صحیحین میں بھی موجود ہے۔ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے تو پیغمبر نے اس کے کردار کے نتیجے کو فتح کہا بھی ہے وہ حدیث لاعطین الرایة غدا اس کے آخر میں کیا فرمایا ہے یفتح اللہ علی یدیہ۔ ایسے کو علم دوں گا وہ نہیں پلٹے گا، جب تک کہ اس کے ہاتھوں پر فتح نہ ہو جائے۔ دیکھئے کتنا مطابق ہے آخری جز۔ انا فتحنا کے ساتھ۔ حتیٰ یفتح اللہ۔ یہاں تک کہ اللہ فتح دیدے اس کے ہاتھ پر۔ بس وہ پوری حدیث تو میں نے چھوڑ دی ہے اس لئے کہ تبصرہ کرنا نہ پڑے۔ یہ جملہ تو ضرورتاً پیش کرنا تھا کیونکہ فتح کی لفظ آئی ہے۔ تو یہاں پیغمبر خدا کی بارگاہ میں عرض کروں گا کہ حضور آپ نے کرار غیر فرار فرما دیا۔ یہ

صفت ہے۔ آپ کا مشاہدہ ہے۔ دنیا کا مشاہدہ ہے اور حضور پھر اس میں یحب اللّٰہ ورسولہ۔ وہ اللہ ورسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ ورسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ فرما دیا تو ظاہر ہے کہ آپ ترجمان ہیں اللہ کے آپ کو اس کی محبت کا حال بھی معلوم ہے۔ اسی کے دیئے ہوئے علم سے لیکن یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ وہ نہیں پلٹے گا۔ تو پلٹنا نہ پلٹنا فعل غیر ہے۔ یہ تو آدمی کا اختیار ہے کہ پلٹے نہ پلٹے۔ تو یہ دوسرے کے فعل کی ذمہ داری آپ کیوں لے رہے ہیں فرماتے ہیں وہ نہیں پلٹے گا جب تک خدا اس کے ہاتھ پر فتح عنایت نہ کر دے تو آپ دوسرے کے عمل کی ذمہ داری خود لے رہے ہیں تو رسول فرمائیں گے کہ آدمی کسی دوسرے کے عمل کی ذمہ داری نہیں لے سکتا لیکن آدمی کیا اپنے نفس کے عمل کی ذمہ داری بھی نہیں لے سکتا۔ صلوٰۃ۔

اسی طرح حنین میں بھی شکست کے بعد فتح ہوئی۔ بڑی لڑائی خیبر کے بعد حُنین کی ہے۔ خیبر کے بعد اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ تو یہ جتنے واقعے ہیں اس میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ہم کہہ دیں کہ آیت یہاں نازل ہوتی ہے تو عقل قبول کر لے گی۔ اور ذہن اسے قبول کر لے گا۔ حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب جو واقف ہیں وہ اور جو ناواقف ہیں وہ انہیں یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ یہ سورہ نہ بدر کے بعد نازل ہوا ہے نہ احد کے بعد نازل ہوا ہے نہ خندق کے بعد نازل ہوا ہے نہ یہ جنگ خیبر کے بعد نازل ہوا ہے نہ جنگ حنین کے بعد نازل ہوا ہے۔ یہ میں ایسے مجمعوں میں بھی پیش کرتا ہوں جہاں غیر مسلم افراد کثرت سے ہوتے ہیں۔ حضور یہ سورہ صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوا ہے جو ... جنگ ہوئی ہی نہیں تھی۔ جہاں پیغمبر خدا ایسے شرائط کے ساتھ صلح کر کے

واپس چلے گئے کہ ساتھ والے پرجوش مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ گھبرا گھبرا کر اتنے شدید سوال ہو رہے تھے جو صحیح بخاری کے صفحات پر درج ہیں کہ کیا آپ نبی نہیں ہیں کیا ہم مومن نہیں ہیں پھر ہم یہ ذلت کیوں برداشت کریں۔ اتنی ناراضگی تھی مسلمانوں کو۔ یہ دیئے ہوئے شرائط ہیں۔ بس اب یہاں پوری تاریخ میرے سامنے ہے۔ ایک بات تو ضرور کہوں گا یہاں کہ جنگ ہوتی تو لڑتا کوئی اور مگر اب صلح ہو رہی ہے تو صلح کے میدان میں بھی قدم نہیں رُکتے۔ صلوٰۃ۔

اور جو ہر جنگ کا فاتح رہا ہے اس کو کوئی بے چینی نہیں ہے جس ہاتھ میں علم تھا اسی ہاتھ میں آج قلم ہے۔ نہ جب ہاتھ میں علم ہوتا تھا تو ہاتھ کو جنبش ہوتی تھی۔ نہ آج قلم ہاتھ میں ہے تو ہاتھ میں لرزہ ہے یعنی ہر میدان میں ثابت قدم۔ اب صلح ہو گئی سرکار والا اس وقت لکھے جا رہے تھے شرائط۔ تو بعد میں رسول سے کتنی باتیں ہوئیں تو اس وقت آپس میں کتنی باتیں ہوئی ہوں گی۔ کتنی نکتہ چینیاں آپس میں ہو رہی ہوں گی دیکھو اسے بھی مان لیا اسے بھی مان لیا۔ کوئی ایک کو بحر کو ٹھوکے دے رہا ہے اور پیغمبر ہیں کہ ان کی طرف سے آنکھ بند کئے ہوئے نہ ان کی باتوں کو سنتے ہیں نہ ان کے اشارہ چشم و ابرو کو دیکھتے ہیں نہ ان کے چہروں کی بدلتی ہوئی رنگتوں کو دیکھتے ہیں آپ شرائط لکھوا رہے ہیں اور لکھنے والا ہے کہ لکھے جا رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میدان میں اس وقت صرف دو ہیں۔ صلوٰۃ۔

یعنی ان سب کا رنگ کچھ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں نہ ان کی باتیں سن رہے ہیں نہ ان کی طرف توجہ دے رہے ہیں نہ ان کو کچھ سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ یہاں بہت مجمع ہے۔ مگر یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کچھ نہیں۔ بس ایک جملہ اور وہ یہ ہے کہ رائے عامہ کی جیسی توہین حدیبیہ میں ہوئی ہے ایسی تاریخ میں کبھی

اصلا کہیں نہیں ہوتی ۔ صلوٰۃ ۔

اور اب رسول اللہ صلحنامہ کو مکمل کر کے دستخط کر چکے ۔ اس کی باضابطہ تکمیل کر چکے ۔ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہیں ۔ اب وہ شرعی حیثیت سے اسکی پابندیوں کو ختم کرنے کے لئے جو صورت شرع میں ہے وہ اختیار فرما رہے ہیں کہ کچھ بال سر کے کاٹے جائیں ۔ یا یہ کہ افضل تو یہی ہے کہ پورے سر کو ۔ وہ جو منیٰ میں ہوا کرتا ہے ۔ صاف کریں گے ۔ ہمارے ہاں کے نوجوان کتنی ہی محبت سے بال رکھتے ہوں ۔ کتنے ہی اہتمام کے ساتھ ان کی آرائش ہوتی ہو مگر حج کریں گے تو وہاں جا کر فارغ البال ہونا پڑے گا ۔ تو حضور آپ اب فرماتے ہیں مجمع سے مخاطب ہو کر کہ ۔ بس سر کے بال منڈواؤ ۔ یعنی احرام کو ختم کرو ۔ اور حضرت کے حکم پر مجمع میں سے کوئی نہیں اٹھ رہا ہے ۔ پھر فرماتے ہیں ۔ پھر فرماتے ہیں اور کئی دفعہ فرمانے کے بعد ۔ جی ہاں ۔ مایوس ہو گئے ۔ حضرت وہاں سے تشریف لے گئے ۔ اور آپ نے ان کی پرواہ نہیں کی ۔ اور تشریف لے جا کر خود اپنے بالوں کو دور فرمایا ۔ تو جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو واپس چلے ہی جا رہے ہیں ہم بغیر ان کے کہاں ٹھہرے رہیں گے ۔ تو اب بددلی سے جا کر تھوڑے تھوڑے بال ۔ اس کو تقصیر کہتے ہیں فقہ کی اصطلاح میں ۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تھوڑے تھوڑے بال منڈوائے ۔ دل تو چاہ نہیں رہا تھا اس لئے تھوڑے تھوڑے بال قینچی سے کٹوا لئے پابندی ختم کر دی تو اب یہ متفق علیہ کتابوں میں بات ہے ۔ کہ دوسرا دن ہوا ظاہر ہے کہ سب کو حضرت کی خدمت ہی میں تو رہنا تھا ۔ لہٰذا وہ غم و غصہ بھی پرانا ہو گیا ۔ اب سب آ کر رسول کی خدمت میں بیٹھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

اللہ رحمت نازل کرے ان لوگوں پر جنہوں نے اپنے سر منڈوائے ایک

طرف سے آواز آئی والمقصرین۔ یارسول اللہ اور جنہوں نے۔ اب کیا کیا جائے کہ اس کے لئے فقہ میں لفظ یہی ہے۔ کہ جو تقصیر کرنے والے ثابت ہوئے وہ تقصیر اور معنی میں ہے مگر ہے یہی لفظ۔ تو جنہوں نے تقصیر کی انہیں بھی فرما دیجیے۔ اب بڑے صاحب الرائے جتنے بھی ہیں سب کچھ ہیں مگر رسول کو وسیلہ جانتے ہیں کہ بغیر ان کی دعا کے کچھ نہیں ہوگا۔ تو کہتے ہیں کہ والمقصرین کہ جنہوں نے تقصیر کی انہیں بھی فرما دیجیے۔ رسول نے دوبارہ پھر فرمایا اتنا ہی کہ۔ . . جنہوں نے سر منڈوایا ان کے شاملِ حال اللہ کی رحمت ہو۔ پھر دوسری طرف سے آواز آئی والمقصرین۔ یعنی کیا خوب ہے معطوف الیہ۔ رسول کے کلام میں معطوف یہ لوگ بڑھا رہے ہیں۔ حضور یہ بھی کہ۔ والمقصرین۔ کہ جنہوں نے تقصیر کی۔ حضور نے پھر اتنا ہی فرمایا کہ جنہوں نے رضا سے اپنے بال کٹوا دیئے۔ اب پھر آواز آئی تو حضور نے بغیر دُعائے رحمت کے دہرائے ہوئے۔ دہرا دیا کہ والمقصرین۔ اچھا تمہاری خاطر یہ بھی سہی۔ کہ جو تقصیر کرنے والے ہیں وہ۔ والمقصرین اور وہ جنہوں نے تقصیر سے کام لیا۔ تو اب یہ عالم کہ مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ ہمارے لئے عزت ہے یا ذلت ہے۔ اب خالق یہ سورہ نازل فرماتا ہے کہ ان فتحنا لک فتحاً مبیناً۔ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی تو پیغمبر نے ناراض مجمع کے نمائندہ خاص کو بلا کر جو ویسی ہی گفتگو کر رہے تھے انہیں بلا کر فرمایا کہ دیکھو یہ سورہ نازل ہوا ہے انا فتحنا لک فتحاً مبیناً۔ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ تو اب بولتے ہیں کہ اچھا یوں بھی فتح ہوتی ہے۔ یعنی اب بھی دل کو یہ بات لگ نہیں رہی۔ اچھا یوں بھی فتح ہوتی ہے۔ رسول فرماتے ہیں میں کیا کروں اللہ یہ کہہ رہا ہے۔ دیکھئے اسلام لانا کتنا مہنگا پڑا ہے۔ کہ اب کیا کریں۔ اللہ کہہ رہا ہے۔ تو اب یہ ہے کہ جس کے لئے غیر مسلم مجمع میں ہیں خلاصہ

پیش کرتا ہوں کہ اب اس سے دنیا کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ اسلام جنگ کے میدان میں فتح کو فتح مبین نہیں کہتا۔ امن کے میدان میں فتح کو فتح مبین کہتا ہے۔ بہرحال اب دنیا کو اس سے ایک نتیجہ پر پہنچنا چاہیے کہ فتح ایک ہی طرح کی نہیں ہوتی۔ فتح یہی نہیں ہوتی کہ دشمن کی فوج کو منتشر کر دیا جائے۔ دشمن کو مادی حیثیت سے دبا دیا جائے۔ یہی فتح بس فتح نہیں۔ اگر قرآن کو مانتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ فتح کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر نانا نے صلح فرمائی مشرکین کے ساتھ اور اُسے قرآن مجید نے کہا کہ یہ فتح مبین ہم نے عطا کی۔ تو اگر نواسہ ظاہری مسلمانوں کے مقابلے میں صلح کرے تو دنیا کو اسے شکست کہنے کا حق نہیں ہے۔ اُسے فتح کہنے کا ہمیں حق ہے۔ دنیا کو شکست کہنے کا حق نہیں ہے اور اگر ہم کہیں کہ کربلا میں حسینؑ نے بھی فتح حاصل کی تو دنیا کو اس پر مضطرب یا پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ یوں بھی فتح ہوسکتی ہے۔ دیکھیے فتح کے معنی کسی لغت میں مار ڈالنے کے نہیں ہیں اور شکست کے معنی مارے جانے کے نہیں ہیں۔ فتح کا فارسی ترجمہ کامیابی کے معنی مقصد حاصل کرنا اور ناکامی کے معنی مقصد حاصل نہ کرسکنا۔ اب میں کہتا ہوں کہ ذرا ہر صاحب عقل غور کرے کہ اگر امام حسینؑ اور یزید میں جنگ یہ ہوتی کہ وہ قتل کرنا چاہتا تھا اور یہ قتل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ اپنے کو قتل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ یہ مقابلہ ہوتا۔ تو میں بالکل متفق ہو جاؤں گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا کہ اس نے شہید کر دیا۔ اور یہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے کہ شہید ہو گئے۔ مگر یزید میں اور ان میں کب یہ جنگ تھی کہ وہ قتل کرے گا اور آپ قتل سے بچنا چاہیں گے۔ یزید اور آپ کے درمیان جنگ اس بات پر تھی کہ وہ بیعت لینا چاہتا تھا اور آپ بیعت سے انکار کر رہے تھے۔ میں کہتا ہوں اب فتح و شکست کا معیار کیا ہوا اگر یزید بیعت لے سکے تو فاتح۔ اور اگر بیعت

نہ لے سکے تو شکست خوردہ۔ ناکام اب دوست اور دشمن ہر ایک کی تاریخ پڑھ لیجیے۔ چاہے کتنا ہی تعصب سے کام لیا ہو۔ کامیاب ہوا۔ کیا یہ انکار بیعت میں ناکام ہوئے۔ حضور اگر وہ کربلا میں بیعت لینے میں کامیاب ہو جاتا تو مصائب کربلا ہی میں ختم ہو جاتے اور بس یہ باب مصائب ہے میں کہتا ہوں کہ دنیا میں فتح کا جو معیار لوگوں کے سامنے ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ادھر بربادی کا پورا مرقع تھا اور اسی لئے انہیں احساس فتح تھا۔ اگر احساس فتح نہ ہوتا تو تکبیر کے نعرے کیوں بلند کرتے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں بھی محبوب ہے تکبیر مگر مسلمانوں نے تکبیر کو اتنا ذلیل کیا ہے تاریخ میں کہ اس کے بعد اکثر مجھے تکبیر کہتے شرم آتی ہے تو یہ تکبیر کے نعرے اپنی فتح پر تھے۔ اگر فتح کا احساس نہ ہوتا تو شادیانے کیوں بجائے جاتے اگر فتح کا احساس نہ ہوتا تو بازاروں کی آئینہ بندی کیوں ہوتی۔ اگر فتح کا احساس نہ ہوتا دنیا کو دعوتِ عام کیوں دی جاتی۔ بعد شہادت امام حسین بی بیوں کو براہِ راست مدینہ کیوں نہ بھیجا گیا صرف اپنے اعلان فتح کی خاطر۔ سروں کو قلم کر کے نیزوں پہ کیوں بلند کیا گیا صرف اپنے اعلان فتح کی خاطر۔ گویا اہل حرم کا قافلہ نہ تھا ان کے خیال ناقص میں ان کی فتح کا جلوس تھا۔ مگر میں با فہم مجمع کو مخاطب کروں گا کہ یہ جلوس جسے وہ اپنی فتح کا جلوس سمجھ کر اٹھا رہے تھے اور جسے اپنی فتح کے مظاہرہ کے لئے نیزوں پر سر بلند کئے ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ نتیجۃً ثابت ہوا کہ یہ لاشعوری طور پر ان کے ہاتھوں حسین کی فتح کا جلوس تھا اور جب یہ جلوس بازاروں سے گزر رہا تھا۔ مجھے یہاں کربلا میں صفین کی تصویر مجسم طور پر نظر آتی ہے وہاں بھی چھوٹے بڑے بہت سے قرآن تھے جو نیزوں پر بلند کئے گئے تھے اور آگے آگے ایک قرآن اعظم تھا جو دمشق کی مسجد سے لایا گیا تھا اور یقیناً سیاسی آلہ کار بنانے کے لئے لایا گیا تھا ورنہ فطری طور پر اس کو وہاں سے

ہٹانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس وقت بھی تصور یہ تھا کہ جتنا وزن جسامت قرآن کا زیادہ ہو اتنی ہی اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوگی۔ تو جناب والا بہت سے آدمیوں نے اٹھا کر اُسے صفین میں بلند کیا تھا۔ تو مجھے تو وہی مرقع کربلا میں یعنی کربلا سے چل کر کوفہ کے راستے میں اور کوفہ سے شام کے راستے میں نظر آتا ہے کہ نیزوں پر بہت سے چھوٹے بڑے قرآن ہیں اور آگے آگے ایک نیزہ طویل پر قرآن اعظم ہے جس کو وہ بلند کئے ہوئے جا رہے ہیں۔ بس اب جس راستہ سے گزرتا ہے کوٹھے تماشائیوں سے بھرے ہوئے بازاروں میں چاروں طرف دیکھنے کے لئے لوگ موجود۔ غیر معمولی اجتماع مگر سر حسینؑ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں۔ نوک نیزہ سے اس پورے مجمع سے۔ جو کربلا سے کوفے تک اور کوفے سے دمشق تک اور آباد سے آباد بازاروں میں پُر رونق سے پُر رونق زیادہ سڑکوں پر تھا۔ تو سر حسین اس مجمع کو مخاطب کر کے کہتا تھا کہ تماشہ دیکھو اور تم تماشہ دیکھنے کے لئے یہی بلائے گئے ہو مگر گواہ رہنا کہ میں نے بیعت نہیں کی ہے۔ اگر میں نے بیعت کی ہوتی تو یہ میرا سر نیزہ پر کیوں ہوتا۔ یہ میرے دل کے ٹکڑے نیزوں پر کیوں ہوتے یہ میری بہنیں یہ میری بیویاں یہ میرے اہل حرم۔ اس طرح ان کی کیوں تشہیر ہوتی۔ یہ میرا بیمار بیٹا یہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں کیوں پہنتا۔ یہ پیروں میں بیڑیاں کیوں پہنتا۔ یہ اس کے گلے میں طوق کیوں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لاشعوری طور پر وہ اپنی شکست کا اعلان کر رہے تھے۔ ارباب عزا۔ پھر جوان کا اصل مقصد تھا یعنی احیائے شریعت اسے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے ایک بڑے سخت موقع پر اُسے ظاہر فرما دیا۔ حضور دمشق کا بازار اور دمشق کونسا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ کہاں آپ پر سب سے زیادہ مصیبت پڑی۔ تو تین مرتبہ فرمایا

الشام الشام الشام ایک تو گرانی آہن۔ طوق کی گرانی سے سر نہیں اُٹھتا اور اس کے بعد پھر ایک اور جملہ۔ میں کہتا ہوں سر اُٹھا کر کیا دیکھتے۔ بس سر نہیں اٹھاتے تھے۔ بس دمشق کا بازار تھا۔ یہ واقعہ مصنفین اہلِ سنت نے لکھا ہے کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی نے مطالب السئول میں لکھا ہے۔ اور ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں بھی۔ تو بازار دمشق ہیں۔ جہاں خود بعد میں فرمایا ہے کہ میں اسطرح کھینچا جا رہا تھا جسطرح غلام کھینچا جاتا ہے۔ اسی دمشق کے بازار میں۔ اور وہ جنگ جمل والا طلحہ اس کا لڑکا۔ محمد ابن طلحہ۔ اس نے ناقہ کی مہار پکڑ کر روکا اور یہ سوال کیا کہ یا ابن الحسین۔ اے حسین کے بیٹے فتح کس کی ہوئی اسے کسی کی تاب ہے کہ اس سوال کا جواب دے سکے فوراً چیخ مار کر رونے لگتا۔ مگر مقصد اتنا بلند تھا ان کا۔ اور اُسے نمایاں کرنا ان کا فریضہ تھا کہ وہ سر جو نہیں اُٹھ رہا تھا وہ اتنے قیامت خیز سوال پر اُٹھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو جب اذان کی آواز آئے تو سمجھ لینا کہ فتح کس کی ہوئی۔

مجلسِ نہم

صادقین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرے پیش رو پروفیسر شکور حسین صاحب یادؔ نے جو کلام سُنایا اس میں پہلے شعر میں سچ ہی سچ تھا اور میری آیت جسے میں سرنامہ کلام قرار دے رہا ہوں وہ بھی سچ ہی سے متعلق ہے ارشاد ہو رہا ہے کہ اے صاحبانِ ایمان اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ بہت سی لفظیں ایسی ہیں جو ہماری زبان پر آکر اپنی بلندی کو کھو دیتی ہیں اس لئے کہ ہم لفظیں اپنی زبان سے بولتے ہیں، مگر ذہن میں ان کے معنی پر نظر نہیں رکھتے۔ بہت سی لفظیں ایسی ہیں جو ہماری زبانوں پر بہت چڑھی ہوئی ہیں۔ اس کی مثال میں پیش کر سکتا ہوں۔ دو تین لفظیں۔ آپ سے کسی نے مجلس کا وعدہ لیا یا کسی دعوت کا وعدہ لیا آپ نے کہہ دیا کہ حتی الامکان ضرور آؤں گا۔ کیا معنی۔ یعنی جہاں تک ممکن ہے ضرور آؤں گا۔ مگر وقت گزر گیا اور آپ تشریف نہیں لے گئے۔ انہوں نے بعد میں۔ جب ملاقات ہوئی۔ پوچھا۔ کہ آپ اس دن آئے نہیں آپ نے کہا بھئی کیا بتاؤں ایک دوست آگئے تھے ان سے باتوں میں ایسا لگا کہ موقع آنے کا نہیں ہوا۔ اب غور کیجئے کہ کیا ان دوست کے آنے کے بعد ممکن نہ رہا تھا۔ کہا تو یہ تھا کہ جہاں تک

ممکن ہوگا۔ تو ان دوست کے آنے سے ناممکن تو نہیں ہوگیا تھا۔ اور ایسے ہی ہونے کو حتی الامکان کہا تھا اور نہیں آئے۔ انہوں نے کہا بھئی کیا بات تھی کہ نہیں آئے۔ آپ نے کہا کہ بھئی سر میں درد ایسا ہونے لگا کہ پھر طبیعت نہیں چاہی آنے کو۔ پھر وہی بات۔ کیا سر کے درد سے ممکن نہیں رہا تھا۔ اب جیسا معیار زندگی ہو فرض کیجیے کہ بڑے آدمی ہیں ماشاءاللہ آپ کے ہاں اتنے معیار کے بڑے آدمی تو بہت ہیں۔ کہ وہ جب نہیں آتے۔ آپ نے کہا کیوں نہیں آتے۔ انہوں نے کہا کیا بتاؤں ڈرائیور چلا گیا تھا۔ تو ڈرائیور نہیں رہا تو ممکن نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حتی الامکان کہا تھا لیکن حتی الامکان کے معنی ذہن میں نہیں تھے۔ لفظیں زبان پر تھیں۔ دوسری مثال کوئی شعر پسند آیا۔ کہا بے مثل شعر ہے۔ کوئی تقریر پسند آئی تو کہا بے مثل تقریر ہے۔ جتنی دفعہ زندگی میں بے مثل آپ نے کہا ہے اُسے ذرا شمار کیجیے، اُسے ایک نوٹ بک پر لکھتے جائیے کہ کن کن چیزوں کو آپ نے بے مثل کہا ہے۔ وہ کتنی ہوں گی مگر یاد رکھیے کہ جو بے مثل ہو وہ ایک کے سوا نہیں ہوسکتا۔ تو لفظ بے مثل زبان پر ہے لیکن اس کے معنی ہیں ہی نہیں ذہن میں۔ کسی دفعہ سردی ذرا زیادہ ہوئی آپ نے کہا لاہور میں بے حد سردی ہے اب اس کے بعد چلے گئے کوہ مری پر۔ آپ نے کہا وہاں بے حد سردی تھی۔ آپ نے کہا کیا کشمیر میں اتنی سردی تھی جتنی روس میں ہوتی ہے۔ وہ جس نے فاتحوں کو شکست دی تھی۔ آپ نے کہا اس کا کیا ذکر وہاں تو بے حد سردی ہوتی ہے۔ آپ نے پہلے تو اپنے ہاں کی سردی کو بے حد کہا تھا۔ وہاں اس سے زیادہ تھی آپ نے اُسے بے حد کہا۔ یاد رکھیے کہ جب تک حد نہ ہو اُس سے زیادہ ہو نہیں سکتی۔ تو بے حد کہتے ہیں لیکن معنی بے حد کے ذہن میں کہاں ہیں بس ویسے ہی یہ کہ کسی آدمی نے دو تین دفعہ کوئی اطلاع دی وہ صحیح نکلی۔ آپ نے

کہا سچا آدمی ہے لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ وعدہ کرتا ہے۔ وہ بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ تو یہ اطلاع کے دو تین دفعہ ٹھیک نکلنے سے آپ کو صادق الخبر کہنے کا حق تھا صادق القول کہنے کا حق نہیں تھا۔ کیونکہ قول میں وعدہ بھی داخل ہے۔ فرض کیجیئے وعدہ کو بھی دیکھ لیا لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے کردار میں ظاہر اور باطن یکساں ہیں یا نہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو عبادت میں نیت نہ کرتا ہو قربۃ الی اللہ یعنی اللہ سے قریب ہونے کے لیئے۔ بغیر اس کے نماز ہوگی۔ نہیں۔ روزہ ہوگا۔ نہیں۔ تو ہر ایک یہ نیت کرتا ہے۔ وضو کرتا ہے قربۃ الی اللہ، نماز پڑھتا ہوں قربۃ الی اللہ۔ لیکن کیا واقعی ہر ایک کی نماز قربۃ الی اللہ ہے۔ میں اپنے جیسے آدمیوں کے لیئے تو ایک معیار بتا سکتا ہوں۔ کہ یہ دیکھے کہ جیسی نماز مجمع میں ہوتی ہے ویسی ہی تنہائی میں ہوتی ہے یا کچھ فرق پڑ جاتا ہے اگر میں نے تنہائی میں نماز پڑھی تو بس بقدر ضرورت قراءت کی۔ اور اگر مجمع میں پڑھی تو زیادہ اہتمام اور احتیاط کے ساتھ پڑھی۔ اگر تنہائی ہوئی تو بس جو شرع کے احکام ہیں ان کے مطابق نماز پڑھ لی۔ لیکن مجمع میں ہوئی تو خضوع و خشوع کچھ زیادہ نظر آنے لگا بس پتہ چل گیا کہ پوری نماز تو قربۃ الی اللہ نہیں ہے۔ کچھ حق کے لیئے ہے کچھ خلق کے لیئے ہے۔ تو جب ظاہر و باطن ایک جیسے نہیں تو فعل میں سچائی کہاں رہی۔ اب مشکل یہ ہے کہ باطن جو ہے وہ ہمارے حدود مشاہدہ سے باہر ہے۔ ظاہر کو باطن سے مطابق کیونکر کریں۔ ظاہر آنکھوں کے سامنے باطن نظر سے اوجھل اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم عمل کی سچائی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اسے کچھ قرائن سے محسوس کیا کہ آدمی بے لوث ظاہر اور باطن میں یکساں رہتا ہے۔ لیکن اس کے تصورات، خیالات، اعتقادات ہم کیا جانیں کہ ذہن میں اس کے کیا کیا غلط باتیں ہیں۔ تو آدمی میں تو قول بھی ہے عمل بھی ہے اعتقاد بھی ہے۔

جب اس سب کو ہم جانچ نہیں سکتے تو ہم کسی آدمی کو صادق کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو اس وقت ہے جب ہم کسی کو صادق کہیں۔ اور اگر عالم الغیب کسی کو صادق کہے تو ماننا پڑے گا کہ اپنے علم الغیب کے آئینے میں اس نے اس کے قول و عمل و اعتقاد یعنی گفتار و کردار و پندار۔ سب کو جانچ کر سب کو سامنے رکھ کر یہ سند دی ہے کہ یہ صادق ہے۔ یعنی نہ اس کے اقوال میں کوئی قول ہے مرضی خدا کے خلاف۔ واقعہ سے الگ۔ نہ اس کے عمل میں کوئی کام ہے کہ جو واقعیت سے جدا ہو نہ اس کے تصورات و خیالات میں کوئی چیز ہے جو نقطۂ حقیقت سے الگ ہو۔ جب ایسا ہو تو وہ اُسے کہے گا صادق۔ وہ اُسے اس وقت کہے گا صادق۔ اب اگر ایک کو وہ کہے صادق تو وہ ایک ایسا ہو گا اور اگر کسی ایک جماعت کو وہ کہے گا صادقین۔ تو وہ پوری جماعت چاہے وہ پانچ ہوں چاہے بارہ ہوں چودہ ہوں۔ اور مجھے اس منزل میں اس سے زیادہ عدد یاد نہیں ہے۔ صلوٰۃ۔ تو وہ جتنے بھی ہوں وہ سب ایسے ہوں گے کہ نہ ان کے قول میں کوئی کلام غلط نہ ان کے کردار کی دنیا میں کوئی عمل غلط نہ ان کے تصور اور خیال میں کوئی ان کا خیال غلط۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ، اب میں نے انتہائی عدد تو چودہ کہا تھا اسی کو سمجھئے۔ کہ وہ انسان چودہ ہوں گے مگر ہر قول اور عمل اور کردار ان کا اللہ کی طرف سے سچائی کی سند پائے ہوئے۔ اب ایک پہلو پر صاحبان فہم غور کریں کہ اگر دو آدمیوں میں اختلاف ہو۔ ایک کچھ کہتا ہو ایک کچھ۔ ایک کی کچھ رائے ہو ایک کی کچھ۔ تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں صحیح ہوں۔ اور یہ چودہ وہ ہیں جنہیں اللہ صادقین کہہ رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ ان میں اختلاف قول ہوتا ہے نہ اختلافِ عمل ہوتا ہے۔ شکل عمل کا اختلاف ہوتا ہے۔ حقیقت عمل کا اختلاف نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کی رائے اور خیال میں اختلاف ہوتا ہے۔ اب ایسے میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخصیتیں چودہ

ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آنکھیں چودہ کی ہیں مگر نظر ایک ہے ہاتھ چودہ کے ہیں۔ مگر کام ایک ہے قدم چودہ کے ہیں مگر اقدام ایک ہے دل چودہ کا ہے مگر ارادہ ایک ہے۔ صلوٰۃ۔ اسی لئے جب پیغمبر خدا اپنی ذات کو شامل کر کے ان چودہ کا تعارف کرائیں گے تو حالانکہ نام سب کے الگ الگ ہیں۔ اگر الگ الگ نہ ہوتے تو چودہ کیسے ہوتے۔ تو نام الگ الگ ہیں اور جناب کنیتیں الگ الگ ہیں۔ جس صفت کے اظہار کا جس کو موقع ملنے والا تھا اس کے لحاظ سے لقب بھی الگ الگ ہیں۔ کسی کو علم کے اندرونی رازدں کے اظہار کا زیادہ موقع ملا تو اس کا لقب باقر ہو گیا۔ کسی کی سچائی کا غیر دل کو بھی تجربہ ہوا تو اس کا لقب صادق ہو گیا۔ کسی کو غصہ کو ضبط ہی عمر بھر کرنا پڑا تو اس کا لقب کاظم ہو گیا۔ اس طرح سے نام بھی الگ الگ۔ کنیتیں بھی اکثر الگ الگ لقب بھی الگ الگ مگر کردار کا وہ سانچہ جس کو صادق کہتے ہیں اس کے لحاظ سے جب رسول خدا تعارف کرائیں گے تو فرمائیں گے۔ اولنا محمد داوسطنا محمد وآخرنا محمد وکلنا محمد۔ صلوٰۃ۔

مگر میں نے عرض کیا کہ ایک صادق کو ہم نہیں پہچان سکتے تو ایک جماعت صادقین کی۔ انہیں ہم کیونکر پہچان سکتے ہیں۔ یہ تو کہیں اور سے مجھے معلوم ہو گیا ہے جو میں نے ناموں کی طرف بھی اشارے کر دیئے۔ میں نے نسبتوں کی طرف بھی اشارے کر دیئے القاب کی طرف بھی اشارے کر دیئے مگر ہماری نگاہ میں دم کہاں تھا کہ ہم چودہ کو یا اس پوری جماعت کو جتنے بھی ہوں پہچان سکیں۔ تو جس نے کہا کہ صادقین کے ساتھ رہو۔ سچوں کے ساتھ رہو۔ اسی کو بتانا بھی چاہیئے تھا کہ صادقین کون ہیں۔ کیونکہ کہہ رہا ہے ہم سے کہ صادقین کے ساتھ رہو۔ اپنی جگہ تعریف کرتا وہ اور بات تھی۔ مگر ہمیں حکم دے رہا ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو۔ صادقین کو ہم پہچان نہیں سکتے وہ بتاتا نہیں تو اس کے بعد تو آیت

تلاوت کے لئے رہ جائے گی۔ عمل تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وہاں پیغام عمل دیا جا رہا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو تو اب خدا کو لازم ہے بنظر حکمت کہ جب حکم دیا ہے تو بتائے بھی کہ صادقین کون ہیں۔ رسول پر بربنائے فرض رسالت ضروری ہے کہ جب یہ آیت پہنچا رہے ہیں تو یہ بھی بتا دیں کہ صادقین کون ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ پیغمبر خدا کے سامنے جو مسلمان تھے وہ معاذ اللہ کیا ذہن نہیں رکھتے تھے یعنی جس بات کو ہم سمجھ سکیں اتنا وہ نہیں سمجھ سکتے تھے تو صاحب وہ پورا مجمع صحابہ اور تمام اس وقت کے مسلمان اور اس وقت کی مدینہ کی مردم شماری کے معنی ہیں صحابہ اس دور میں چاہے میں سب مسلمان کہوں چاہے سب صحابہ کیوں ایک ہی معنی ہیں۔ تو جناب وہ تمام کے تمام مسلمان وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کہا ہم سے جا رہا ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو تو بتلانا بھی چاہیئے کہ وہ سچے کون ہیں اور اگر نہیں پوچھا۔ اور کوئی کہے کہ پوچھا۔ تو بار ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ وہ مجھے بتائے کہ کب پوچھا۔ اگر نہیں پوچھا تو سمجھیئے کہ بتایا تھا۔ یہ دنیا نے بعد میں بھلا دیا کہ کون تھے سچے۔ فطری طور سے بھلانا تو ہو بھی نہیں سکتا۔ مصلحتاً بھلایا ہو گا۔ ورنہ لازماً بتانا چاہیئے کون ہیں۔ اب اگر کچھ مجھے معلوم ہو اور میں بتاؤں کہ کب بتایا۔ تو یا تو اُسے دنیا مان لے یا وہ کوئی اور موقعہ پیش کرے کہ اس وقت بتایا۔ تو اب حضور والا میرے نزدیک بتانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ بہت ہی صاف صاف۔ جس کو کند ذہن لوگ بھی سمجھ لیں۔ جس کو دھندلی نگاہ والے بھی سمجھ لیں۔ جس کو جو نہ سمجھنا چاہیں وہ بھی سمجھ لیں وہ سیدھا طریقہ تو یہ ہے کہ کہیں لا کر ان افراد کو دکھا دیا جائے کہ یہ ہیں صادقین۔ ارے کم سے کم اس وقت جتنے ہیں موجود ان کو دکھا دیا جائے۔ پھر مر جانے والا بعد والے کا تعارف کراتا رہے گا سلسلہ قائم رہے گا۔ تو یہ ایک طریقہ ہے صادقین کے سمجھانے کا۔

دوسرا طریقہ ذرا ذہنی کاوش کا ہے۔ اور معاملہ اگر اہم ہے تو اگر کاوش کی ضرورت ہو تو ہر ایک کو کاوش سے گھبرانا بھی نہیں چاہیئے۔ وہ اس طرح کہ ان کے سب اقوال کو ملا کر نتیجہ نکالا جائے کہ صادقین کون ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ کہ صورتیں لا کر دکھائی جائیں کہ یہ ہیں صادقین۔ تو وہ منزل آئی جہاں صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ صادقین کون ہیں۔ وہ ہے ۹ھ میں مباہلہ کا میدان۔ اور میدان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ایک مخالف گروہ سے جنگ تھی۔ وہ جنگ تلواروں سے نہ تھی۔ روحانی جنگ تھی۔ اور وہ کس کے مقابلے میں۔ جو اپنی روحانیت کے بڑے عویدار ہیں۔ اور جو تلوار پر معترض ہیں۔ اور سیاست کی ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے ہی پیغمبر اسلام کی تصویر کھینچی ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن۔ یعنی تلوار کے ذریعہ سے قرآن پھیلانا اس جز کو شاید عرض کر چکا ہوں۔ کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہی اس تصویر کو کھینچ رہے ہیں جن سے پیغمبر کی کوئی جنگ نہیں اب میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو تلوار ہی سے پیغام حق پہنچانا تھا تو تمہارے مقابلے میں تلوار کیوں نہ کھینچی۔ یعنی نصاریٰ کی جماعت عیسائیوں کی جماعت۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے مقابلے میں تلوار کیوں نہ کھینچی۔ میں اس میں تمہاری معقولیت کی داد دوں گا۔ تنگ نظر نہیں ہوں۔ مخالف کی بھی کوئی بات اچھی ہو تو اُسے ضرور کہنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ تمہاری معقولیت تھی۔ کہ تم فوج نہیں لائے۔ تم سمجھے کہ دین کا معاملہ ہے تو جو میدان دین کے شہسوار ہوں انہیں لایا جائے۔ تارک الدنیا راہب۔ علمار مذہب کے۔ وہ جناب ستر آدمی۔ یعنی تمام ملک سے جو چوٹی کے لوگ تھے۔ سب کو اکٹھا کر لیا اور انہیں لے آئے۔ وہ واقعہ تو ابھی عرض کروں گا لیکن جہاں جو بات شروع کی تھی اسے ختم کر دوں کہ تم فوج نہیں لائے تو تم سے جنگ نہیں ہوئی۔ تو اب تو میں نے تمہاری معقولیت کی داد دی۔ تم بھی میرے ساتھ انصاف

کرو کہ اب تمہیں قائل ہونا چاہیئے کہ تلوار ان کے مقابلے میں اٹھتی ہے جو تلوار لے کر آئیں اور جو تلوار لے کر نہ آئیں ان کے مقابلے میں تلوار نہیں اٹھتی۔ صلوٰۃ۔

تو بہر حال یہ یمن میں مرکز تھا نصاریٰ کا۔ ابرہہ بھی تو وہیں سے آیا تھا کعبہ کو ڈھانے۔ وہ بھی عیسائی جماعت ہی تھی۔ تو ان تک یہ خبریں پہنچیں کہ پیغام آیا ہے۔ اور معلوم ہوا کہ لوگ برابر پروانوں کی طرح گر رہے ہیں اور قبول کر رہے ہیں اس پیغام کو۔ تو انہوں نے ان لوگوں کو بھیجا۔ تحقیق مذہب کی خاطر۔ کہ تم جا کر معلوم کرو کہ ان کا پیغام کیا ہے۔ اور ماشاء اللہ قانون دان حضرات بھی کثرت کے ساتھ مجمع میں ہوں گے۔ کہ یہ سب لوگ صرف تحقیق کے لئے نہیں آئے تھے۔ بلکہ نمائندہ جماعت تھی صاحب اختیار۔ اگر صرف تحقیق کے لئے آتے تو جا کر صرف رپورٹ دے دینی چاہیئے تھے۔ ان کو کوئی معاہدہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ مگر صورت واقعہ صاف ظاہر ہے۔ کہ وہ معاہدہ کر کے واپس گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل بااختیار نمائندے تھے۔ کہ جیسا موقع ہو۔ جیسا تم سمجھنا ویسا عمل کرنے کا تم کو اختیار رہے۔ اور اس وقت کی تمام عیسائی دنیا۔ گویا اس کی پابند ہوگی۔ تو جناب وہ آئے۔ پیغمبر خدا مجمع صحابہ میں تشریف فرما۔ یہ لوگ سنتے یہ رہے تھے کہ اقتدار ہے ملک عرب میں۔ تصور یہ تھا کہ ایک حکمران کے پاس جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان بے چاروں کا کیا قصور۔ آج تک مسلمانوں کی اکثریت نہیں سمجھی کہ رسول تھے یا حکمران تھے۔ اب جب مسلمان رسول اور بادشاہ میں فرق نہیں کر سکے تو ان بے چاروں کا کیا قصور کہ ایک تاجدار حجاز کے پاس جا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا نعرہ بھی محاورہ ہے تاجدار مدینہ۔ یعنی تاج سے محبت اتنی ہوگئی ہے کہ رسول کی تعریف بھی تاج کے بغیر نہیں ہوتی۔ تو وہاں آئے تو۔ بادشاہوں کے دربار کے لائق جو لباس ہو۔ ویسے حریر و دیبا کے لباس بنوائے اور سونے کے پٹکے

کمر دل پرکھنے کے لیئے۔ یہ سب لباس پہن کر رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے پیغمبر کا رُخ اس طرف تھا وہ جدھر تھے وہ ابھی سامنے تھے کہ آپ نے رُخ موڑ لیا۔ پہلے سمجھے ہوں گے کہ اتفاق کی بات ہے۔ تو اِدھر گئے تو حضرت نے رُخ ادھر کر لیا۔ اب جب غلط فہمی کا کوئی امکان نہ رہا۔ تو واپس ہوئے۔ آپس میں باتیں کہتے ہوئے کہ ہم نے تو ان کے اخلاق کی بڑی تعریف سُنی تھی۔ ہمیں تو یہ امید کبھی نہ تھی کہ اس طرح کا سلوک ہمارے ساتھ ہو گا۔ غور کیجئے ذرا کہ وہ خبریں اتنی تواتر کے ساتھ ہیں کہ خود اپنا مشاہدہ اس کے مقابلے میں نہیں ٹک رہا تھا۔ ورنہ بس رائے قائم کر لیتے کہ خبریں غلط تھیں۔ جا کر کہہ دیتے کہ ارے اور کیا بحث کریں۔ یہی بات غلط نکلی ان کے تو اخلاق ایسے ہیں۔ مگر وہ خبریں اتنی طاقتور تھیں کہ مشاہدہ جم نہیں رہا تھا ان کے سامنے۔ لہٰذا ذہن میں تھا کہ کوئی معمہ ہے کوئی سبب ہے۔ اور اگر سبب ہے تو کس سے پوچھیں۔ جو ان کے پاس زیادہ آتے جاتے رہتے ہیں بیٹھے رہتے ہیں ان سے پوچھیں۔ تو اتفاق سے ایک بزرگوار سامنے نظر آگئے ان سے پوچھا کہ جناب سُنا تھا کہ آپ کے رسول کے اخلاق اتنے بلند ہیں۔ کہا اسمیں شک ہی کیا ہے۔ بے شک ان کے اخلاق ایسے بلند ہیں۔ انہوں نے کہا جناب ہم پر تو یہ گذری۔ انہوں نے کہا بھئی اخلاق تو ویسے ہی ہیں۔ تم پر کیا گذری اسے میں کیا بتاؤں یعنی دائرہ حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ بھی اس مجمع میں ساتھ ساتھ۔ اب دوسرے بزرگوار مل گئے۔ انہوں نے کہا ان سے پوچھو۔ یہ بہت ذہین ہیں نکتہ رس ہیں۔ اسی ردیف اور قافیے میں ان سے گفتگو ہوئی۔ اخلاق کیسے بے نظیر۔ کیا کہنا وہ میں ہی ایسے صاحبِ اخلاق۔ انہوں نے کہا جناب ہم نے تو یہ دیکھا۔ انہوں نے کہا اخلاق تو ان کے ویسے ہی ہیں۔ اب یہ تمہارا مقدر۔ تمہارا نصیب۔ اب میں اسے کیا کہہ سکتا

ہوں۔ اب میں کیا بتاؤں۔ کیا ہوا تمہارے ساتھ۔ اب اتنے آدمی ہیں۔ اتنے آدمیوں کے اجماع کو غلط بھی تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ تم سب جھوٹے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ غرض جہاں بات تھی وہیں رہی۔ اب جستجو کرنے والی جماعت کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ آخر میں وہ مل گیا جس کے لئے۔ جیسے قدرت کی طرف سے فیصلہ یہ تھا کہ دنیا ٹھوکریں کھا کر آیا کرے۔ اب وہی جو ذرا مرکز تحقیق بنائے گئے تھے انہوں نے کہا ان سے پوچھو یہ بچپن سے ان کے ساتھ رہے ہیں۔ اب دیکھئے بچپن کا وزن یہاں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ تو بتا دیں گے ان سے پوچھو۔ انہوں نے شروع میں وہی بات کی۔ انہوں نے کہا ایسے اخلاق۔ انہوں نے کہا بے شک ایسے ہی اخلاق ہیں۔ اب دوسری طرف اس سے متضاد جو مشاہدہ تھا ان کا۔ کہ ہمارے ساتھ تو یہ ہوا۔ تو آپ نے سر سے پیر تک دیکھا لباس وغیرہ کو۔ آپ نے فرمایا یہی کپڑے پہن کر گئے تھے۔ انہوں نے بڑے زور میں کہا جی ہاں یہی تو مطلب یہ کہ ہم نے آداب دربار کے خلاف تھوڑی کیا ہے۔ یہی کپڑے پہن کر تو گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم تو تارک الدنیا لوگ ہو۔ اب میں باصلاحیت لوگوں کو فلسفہ عمل رسول کی طرف متوجہ کروں۔ کہ یاد رکھئے کہ یہ اگر قیصر و کسریٰ کے نمائندے ہوتے اور ان کا لباس ہمیشہ کا یہ لباس ہوتا تو اسی لباس میں مظاہرۂ اخلاق ہوتا۔ لیکن ان کا تو اصل میں یہ لباس نہیں تھا۔ یہ تو اس دربار کے تقاضوں کو غلط طور پر محسوس کر کے انہوں نے یہاں کے لئے یہ لباس تیار کرایا تھا۔ تو اگر اس لباس میں مظاہرۂ اخلاق ہوتا تو ان کی غلط فہمی دور نہ ہوتی۔ یہ پتہ نہ چلتا کہ یہاں لباس کی عزت ہوتی ہے یا انسان کی عزت ہے یاد رکھئے کہ اخلاق بے اخلاقی بن جاتے ہیں۔ جب فرائض سے ٹکرا جائیں۔ تو جب انہوں نے یہ کہا کہ۔ جی یہی لباس تو آپ نے فرمایا کہ۔ تم تو تارک الدنیا ہو۔ تم تو زاہد ہو۔ تم تو گرجوں میں بستے ہو

تم تو جنگلوں میں جاکر زندگی گزارتے ہو۔ یہ تم نے کیا سوانگ بنایا ہے۔ ارے جو اپنا اصلی لباس ہے وہ پہنو۔ پھر جاؤ تو دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اوّل تو میں کہتا ہوں کہ بات اتنی دل کو لگتی ہوئی تھی کہ ان کے ذہن نے قبول کر لیا ہوگا کہ یہی بات ہو سکتی ہے۔ اور پھر اگر نہ سمجھے ہوں تو گویا دل میں یہ آسکتا ہے کہ انہوں نے ایک نسخہ تو بتایا۔ اب اسے آزما کر دیکھو کر کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ گئے اور وہ سب اُتار کر پھینکا۔ اور اب وہی ٹاٹ کے کپڑے پہن کر دوسرے دن پھر خدمت میں حاضر ہوگئے۔ تو اب جو آئے تو ابھی ذرا دُور ہی تھے کہ رسول تعظیم کو کھڑے ہو گئے اور اپنے پاس بٹھایا۔ اب یہی سمجھ لیجئے کہ پاس بٹھانے سے مظاہرہ اخلاق ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ایمان متعدی ہو کر چلا جاتے۔ آپ صاحبان کیوں آئے ہیں کیا مقصد ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم کو وہاں کی جماعتِ نصاریٰ نے بھیجا ہے تاکہ آپ کے دین کے متعلق ہم معلومات کریں۔ پورہ سورہ آلِ عمران اسی سلسلے میں اُترا ہے اور اب حقائقِ دین جو بیان کئے جا رہے ہیں ان کے دل سے ذہن میں داخل ہو رہے ہیں اور حلق سے اتر رہے ہیں۔ بالکل قرینِ قیاس۔ ان کا ذہن قبول کر رہا ہے۔ آخر میں بات یہ آگئی۔ یہ سب تو ٹھیک ہے حضرت عیسےٰ کے بارے میں آپ کیا تصور رکھتے ہیں۔ شروع میں عیسائیت میں تمام حلال و حرام پوری شریعت تمام احکام تھے۔ لیکن ایک صاحب پال تھے۔ انہوں نے عیسائیت کا دار و مدار عظمت عیسےٰ کے انتہائی تصور پر مبنی کر دیا۔ اب حلال رہا نہ حرام رہا۔ بس حضرت عیسےٰ کو جتنا بڑھاؤ گے اتنے سچے عیسائی ہو گے۔ یہ پال نے بنیاد بنائی صرف عظمتِ عیسےٰ کے تصور کی۔ اب جو جتنے اُونچے درجہ تک انہیں پہنچائے اتنا ہی اُونچا وہ عیسائی ہے۔ لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ جناب عیسےٰ۔ اِدھر سے تعریف ہوئی۔ آیتیں اُتریں کہ وہ بلند مرتبہ رسول تھے۔ ان کے معجزات تھے اور

معجزات کا تذکرہ کیا گیا۔ وہ سب انہوں نے سُنا مگر اس سب کے بعد بھی انہوں نے کہا ہاں نبی تھے رسول تھے۔ یہ بتایئے صاف صاف کہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی تھا کہ خدا کا بیٹا کہنے سے تو مجبور ہیں اسے تو صحیح نہیں مانتے۔ بس انہوں نے کہا یہ بتایئے اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو کس کے بیٹے ہیں۔ اب بائبل بھی دیکھئے۔ ہو سکتا ہے مجمع میں کچھ افراد ہوں۔ ہمارے ہاں مناظرہ کا جو انداز ہے۔ صرف لاجواب کرنے کا۔ تو اگر لاجواب کرنے کا انداز ہوتا رسول کا تو کچھ اور جواب دیتے۔ عیسائیوں نے یوسف نجار کے سلسلے سے بائبل میں نسب حضرت آدم تک پہنچایا ہے۔ مگر علمبرداران حق اور صحیح رہنمایان حق کا یہ عمل نہیں ہے کہ غلط بات کو غلط بات سے توڑو۔ جو نقطہ حقیقت ہے اسے پیش کرو۔ تو میں لاجواب کر سکتا تھا۔ میں کہتا ہوں مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ بائبل میں باپ کا نام موجود ہے تو دریافت کیا کر رہے ہو۔ کل وہاں انہوں نے سوال کیا اور ان کا یہ سوال یوں بھی غلط تھا کہ ان کے ہاں بائبل میں نام موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ عقلی طور سے آپ سے کہتا ہوں۔ ذرا غور کیجئے۔ معاذاللہ۔ حضرت عیسیٰ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا کفر ہے۔ ظاہر ہے کہ میں حضرت عیسےٰ کو اولوالعزم پیغمبر مانتا ہوں تو ان کی شان میں گستاخی کا تصور کہاں ہو سکتا ہے مگر ان کے اس سوال کی نامعقولیت میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو بتایئے کس کے بیٹے ہیں۔ یعنی جس کے باپ کا پتہ نہ ہو اُسے خدا کا بیٹا سمجھ لیں۔ تو غرض یہ کہ نامعقول سوال تھا۔ مگر یہاں تو ان تک حقیقتیں پہنچانا تھیں۔ لہٰذا قرآن کی آیت اتری۔

ان مثل عیسےٰ عند اللہ کمثل آدم خلقه من تراب فقال له کن فیکون۔

عیسےٰ کی مثال مثل آدم کے ہے ان کو مٹی سے پیدا کیا اور حکم الٰہی ہوا ہو جا وہ ہو گئے۔ یعنی یہ تو خدا کی قدرت ہے۔ اس نے آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا۔

یہاں ایک فریق تو ہے ماں موجود ہے۔ باپ نہیں ہے۔ اس کو تم خدا کا بیٹا کہتے ہو اب یہ لفظیں پھر میری ہیں تو پھر آدم کے ہاں تو نہ ماں ہے نہ باپ۔ تو ان کو دُہرا بیٹا کہو۔ مگر انہیں بے چارے کو کوئی خدا کا بیٹا نہیں کہتا تو یہ اللہ کی قدرت ہے جسے جس طرح چاہتا ہے خلق فرماتا ہے۔ تو اس سے وہ خدا کے بیٹے تھوڑی ہو جائیں گے۔ اب دنیا سے استدلال میں ان کے پاس بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر مانتے اب بھی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ماننے والے کو خدا اور رسول بھی نہیں منوا سکتے۔ خدا کو جبر نہیں کرنا کہ زبردستی دل کو بدل دے۔ اب وہ نہیں مانتا تو کیا کیا جائے۔ وہ کچھ نہ کچھ کہے جاتے ہیں۔ قرآن نے کیا کہا۔ تیور بدلے بالکل۔ اندازِ آیت دیکھئے۔ خالق کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل۔ اگر اتنے دلائل کے بعد بھی کٹ حجتی کئے جاتے ہیں۔ تو کہیے۔ اب تیور یہ بتاتے ہیں کہ آجاؤ میدان میں۔ اب ہم نہیں یا تم نہیں۔ ہے تو یہی کہ یا ہم نہیں یا تم نہیں۔ مگر تلوار سے نہیں۔ فقل۔ اب کہیے کہ آؤ۔ ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین ہم اپنے بیٹوں کو لائیں تم اپنے بیٹوں کو لاؤ۔ ہم اپنی بیٹیوں کو لائیں تم اپنی بیٹیوں کو لاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو لائیں تم اپنے نفوس کو لاؤ اور پھر اللہ سے لو لگائیں۔ اب اسے میں بعد میں عرض کروں گا۔ میں کہوں گا اتنے علمی دلائل کے بعد پھر بھی نہ مانے تو۔ یہ علمی دلائل کیا ہیں۔ قرآن کی آیتیں ہیں۔ اس کے بعد بھی نہ مانے تو۔ پھر ان کو لائیے۔ میں کہتا ہوں اب اگر مگر کا سوال نہیں۔ قرآن اور تاریخ کی حقیقت ہے کہ جب قرآن کافی نہیں ہوتا تو یہ لائے جاتے ہیں صلوٰۃ۔

اب آیئے ندع ابناءنا ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو۔ ابناءکم۔ تم بلاؤ اپنے بیٹوں کو۔

بلائیں یعنی ہم اور تم بلائیں۔ یعنی ہم ان کو بلائیں تم ان کو بلاؤ۔ یہ اختصار کے ساتھ یوں کہا ہے۔ ونساءنا ونساءکم۔ اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو۔ یعنی ہم میں دونوں فریق داخل ہیں تو ہم انہیں بلائیں اور تم انہیں بلاؤ۔ وانفسنا وانفسکم۔ ہم اپنے نفوس کو تم اپنے نفوس کو۔ ثم نبتھل۔ ابتہال کے معنی ہیں اللہ سے رجوع کرنا جب مقابلے کا مفہوم ہو تو۔ اسی سے لفظ مباہلہ ہوئی ہے۔ ابتہال کے معنی ہیں رجوع الی اللہ۔ اور مباہلے کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مقابلے میں رجوع الی اللہ میں مقابلہ۔ مناظرہ جیسے نظر میں مقابلہ۔ مباحثہ بحث میں مقابلہ ویسے ہی مشاعرہ۔ شعر میں مقابلہ۔ مباہلہ رجوع الی اللہ میں مقابلہ۔ اللہ کی طرف لو لگانے میں اب ایک پہلو کی طرف متوجہ کروں گا کہ یہاں ہر جگہ دو طرفہ بات تھی۔ ہم اپنے بیٹوں کو تم اپنے بیٹوں کو۔ ہم اپنی عورتوں کو تم اپنی عورتوں کو۔ ہم اپنے نفوس کو تم اپنے نفوس کو۔ دونوں طرف۔ اب تاریخ بتاتی ہے۔ صورت واقعہ بھی بتاتی ہے۔ کہ وہ لوگ تو تحقیق مذہب کو آئے تھے۔ وہ عورتوں اور بچوں کو کہاں لائے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ توازن کلام کے لئے جیسے اپنے بیٹے تمہارے بیٹے۔ مگر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کاغذ پر حروف کے آنے سے اصل معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہا جائے تو پس منظر سامنے ہوتا ہے۔ لب ولہجہ سامنے آتا ہے۔ تو حاضر الوقت اصحاب کا فہم جتنا معتبر ہے۔ اتنا بعد والوں کا۔ یا جو اس موقع پر موجود نہ ہوں۔ ان کی سمجھ اتنی معتبر نہیں ہے۔ اب دیکھئے کہ جو میں کہہ رہا ہوں۔ کہ یہ توازن کلام ہے۔ پورا یہاں سے وہاں تک۔ لیکن اگر واقعی مقصود یہ ہوتا کہ وہ بھی لائیں اپنی عورتوں کو۔ وہ بھی لائیں اپنے بچوں کو۔ تو دوسرے دن جب وہ گئے۔ وہی جو آئے ہوئے تھے۔ وہی دوسرے دن مباہلے کے لئے آ گئے۔ تو ادھر سے آپ کی اعتراض ہونا چاہیے تھا کہ ہم نے تو کہا تھا کہ اپنے بچوں کو عورتوں کو اور نفوس کو لے کر آنا۔ تم تو وہی

آ گئے جو کل تھے۔ اچھا پھر وہ سمجھدار تھے۔ اگر وہ یہ سمجھتے تو۔ ان کو مہلت مانگنا چاہیئے تھی۔ کہ اچھا پھر دو ہفتوں کی ہم کو مہلت دیجئے۔ کہ ہم جا کر اپنی عورتوں، بچوں اور نفوس کو بھی لائیں مگر دونوں باتوں سے صفحہ تاریخ خالی ہے۔ نہ انہوں نے مہلت مانگی نہ انہوں نے دوسرے دن اعتراض کیا۔ تو یہ کیا معمہ ہے۔ میری سمجھ میں یہ آ رہا ہے کہ یہ توازنِ کلام حقیقت میں نظریہ روحانیتِ مسیحی پر ایک ضرب تھی۔ وہ تھے عیسائی علماء اور راہب۔ تارک الدنیا۔ ان کا تصور یہ ہے کہ بیوی بچے روحانیت کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے شادی بھی نہیں کی ہوگی۔ یہی ان کے ہاں معیار روحانیت ہے۔ ان کی اولاد نہیں ہے۔ تو وہ عورتوں اور بچوں کو کہاں سے لاتے۔ تو جو میں سمجھا ہوں۔ وہ بھی سمجھ گئے۔ کہ یہ تو ہمارے نظریہ روحانیت پر ایک ضرب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسے تم سفر روحانیت میں مُضر سمجھتے ہو وہ ہمارے لئے سفرِ روحانیت کا جز ہے کہ ہمارا سفرِ روحانیت بغیر اس کے مکمل نہیں ہوتا۔ اور وہی فقہ اسلامی کہہ رہی ہے کہ غیر شادی شدہ کی نماز میں اتنی فضیلت نہیں ہے کہ جتنی شادی شدہ کی نماز میں فضیلت ہے۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تو ہم پر ایک چوٹ ہو گئی۔ اور بس جیسے وہ تلملا کر رہ گئے۔ مگر ان کے ساتھ وہ تھے ہی کب جو انہیں جا کر لاتے۔ لہٰذا نہ انہوں نے مہلت مانگی نہ لے کر آئے اور چلے آئے دوسرے دن۔ ادھر سے بھی کوئی مقصود تو نہیں تھا کہ وہ لائیں۔ مگر انہوں نے کہا تھا تو اِن کو تو نبھانا ہے۔ اب انہیں تو لے جانا ہے۔ یہ سفرِ روحانیت کا جز ہے بشرطیکہ اس لائق ہو۔ بدر میں یہ لوگ نہیں لائے گئے تھے۔ اُحد میں نہیں لائے گئے تھے۔ خندق اور خیبر میں نہیں لائے گئے تھے۔ وہ سپاہی بالکل بدلے ہوتے ہیں۔ بس ایک سپاہی بالکل نہیں بدلا وہ ان جہادوں میں بھی ہوتا تھا۔ اس جہاد میں بھی ہے۔ ان جہادوں میں ہوتا تھا شاہ لافتیٰ!

ہو کر۔ اس جہاد میں ہے امام الاولیا ہو کر۔ صلوٰۃ۔

ان لڑائیوں میں یہ افراد نہیں لائے گئے تھے یعنی عورتیں اور بچے۔ اور اس جہاد میں یہ لازمی جز تھے۔ یہاں انفسنا کی لفظ بعد میں ہے پہلے ابنا سنا و نسا رنا کی لفظ ہے معلوم ہوا کہ یہ اس سفر میں بنیادی اجزا ہیں۔ بغیر ان کے یہ سفر مکمل نہیں ہو سکتا۔ تو وہ تو نصاریٰ تھے۔ وہ کیا سمجھتے۔ وہ اپنے اوپر ضرب سمجھ گئے اور ان کے عمل سے سمجھے کہ ہاں ان کے ہاں یہ روحانیت کے سفر کے لازمی اجزا ہیں۔ مگر بہت سے بڑے بڑے۔ بالکل بڑے بڑے جلیل المرتبہ لوگ ہیں جو نہیں سمجھے اس کو جب حسین سے کہہ رہے ہیں کہ آپ جا رہے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جا رہے ہیں اور آج تک دُنیا ان کے مشوروں کو بہت وقعت سے پیش کرتی ہے کہ دیکھئے فلاں بزرگوار نے یہ کہا تھا۔ اور انہوں نے عمل نہ کیا۔ فلاں بزرگوار نے یہ کہا تھا اور انہوں نے عمل نہ کیا۔ معاذ اللہ بڑے ضدی تھے۔ میں کہتا ہوں فرائض میں جو لازمی تقاضے ہوں ان میں دوسروں کے مشوروں پہ عمل نہ کرنا بڑے بڑے صاحبانِ رائے کی رائے پر عمل نہ کرنا یہ اگر ضد ہی ہوتا تو خود رسول تھے کہ حدیبیہ میں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اصحاب الرائے کی بے چینی دیکھ رہے تھے اور پھر بھی جو طے کر لیا تھا وہی کر کے رہے۔ دنیا کہہ رہی ہے کہ آپ جاتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جاتے ہیں۔ اب امام حسین اس وقت فلسفہ کہاں تک سمجھاتے اس لئے کبھی کہہ دیا کہ میں نے رسول کو خواب میں دیکھا ہے ان کے ساتھ اور ظاہر ہے کہ جو صحیح بات ہوگی وہ رسول نے بھی فرمائی ہوگی۔ کبھی کہا کہ ان کو کس کے سپرد کر جاؤں لیکن اب میں کہتا ہوں اس کے بعد کے بدنظمی ہیں۔ ان کے سامنے مقصد حسین نہیں تھا۔ اگر ان کے سامنے مقصد حسین ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ انہیں کیوں لئے جاتے ہیں۔ رسول بعد امجد خمسہ ذخیرہ

نہیں لے گئے اور مباہلے میں لے گئے۔ حکمِ خدا سے لے گئے۔ اس سے ہماری سمجھ میں آ گیا کہ حق کی راہ میں بھی جو مادی فتح حاصل کرنا ہو یعنی فوج کو شکست دینا۔ اس میں عورتوں اور بچوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں کسی ذہنیت کو قتل کرنا ہو وہاں عورتوں اور بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ یہ سفر عورتوں اور بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تو بدر و اُحد و خندق و خیبر وغیرہ میں نہیں لائے۔ کربلا کے جہاد میں اگر مادی فتح حاصل کرنا ہوتی تو عباس کی ضرورت تھی زینب کی ضرورت نہ تھی۔ علی اکبر کی ضرورت تھی علی اصغر کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن مولا کے عمل سے سمجھئے کہ کربلا کے میدان میں ویسی جنگ نہیں لڑنی تھی۔ مختصر کر کے عرض کروں کہ حسین کو یزید کو شکست نہیں دینی تھی۔ یزیدیت کو شکست دینی تھی۔ تختِ سلطنت یزید کا نہیں الٹنا تھا ذہنیت یزیدی کو اُلٹنا تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی جنگ کی تیاری کی۔ کون کہتا ہے کہ جنگ کی تیاری نہیں کی۔ مگر جیسی جنگ لڑنا تھی اس کے لئے ویسی ہی تیاری کی۔ ذہنیت اسلامی اس وقت کیسی ہو گئی تھی۔ اُسے تاریخ میں دیکھئے کہ کیا عالم ہو گیا تھا۔ کیوں یہ تھا۔ اسلام کے خلاف کوئی کام غیر مسلم محاذ سے ہو تو ہم جلدی چونکیں گے۔ اور جب کسی اسلامی طاقت کی طرف سے ہو تو پھر مسلمان محسوس نہیں کریں گے۔ چونکہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا اور بنام اسلام ایک فرمانروا کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ تو مسلمان بیدار نہیں ہو رہے تھے۔ حسین کا مقصد یہ تھا کہ کربلا میں یہ دکھلا دوں کہ اس اسلام کی نقاب کے پیچھے کیسے آدمی چھپے ہوئے ہیں۔ یہ اسلام کا برقع جو ہے اُسے ان کے گرد سے ہٹا کر دنیا کو دکھا دوں۔ اس لئے وہ کسوٹیاں لیں جو اسلام اور انسانیت کے پرکھنے کی ہیں۔ حسین کے بہتر عوام نہیں تھے ان میں حفاظ قرآن تھے ان میں تہجد گزار تھے۔ حبیب ابن مظاہر تھے جن کے لئے روایت ہے کہ ایک سجدہ میں ختم

قرآن کرتے تھے ان میں جناب بریر ہمدانی تھے جو سید القرآر کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ قرآر کے معنی اس وقت تھے حافظ قرآن۔ سید القرار یعنی حافظانِ قرآن کے سردار۔ یہ ان کا لقب تھا کوفے کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غلام ترکی جو تھا وہ حافظِ قرآن تھا۔ کوئی محدث تھا کوئی حافظِ قرآن تھا۔ کئی صحابہ رسول تھے۔ انس بن حارث صحابی رسول تھے۔ مسلم ابن عوسجہ کے بارے میں بھی روایت ہے کہ صحابی رسول تھے۔ توان کو اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ جب یہ میدان میں آجائیں گے تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ اسلام پر کیا وقت پڑ گیا ہے کہ ایسے ایسے لوگ تلواریں لے کر میدان میں آگئے ہیں۔ اور پھر خاندان رسول کا پورا سرمایہ۔ تاریخ روا رکھی ہیں کہہ دیتی ہے کہ اٹھارہ بنی ہاشم۔ ورنہ بنی ہاشم کہاں تھے سب ابوطالب کی اولاد تھے۔ دکھلادوں کیسے انسان ہیں۔ دکھلا دوں کیسے مسلمان ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانوں کی طبیعت بھی مختلف ہوتی ہے کسی کو جوان پر رحم آتا ہے کسی کو بچے پر رحم آتا ہے۔ کسی کا دل عورت پر کڑھ جاتا ہے ترس آجاتا ہے۔ حسین اپنے ساتھ انسانیت کے پرکھنے کا ہر ذریعہ لائے تھے۔ اور قدم قدم پر۔ انہوں نے تاریخ کی دنیا کو۔ ان کے اسلام کی جانچ کرکے۔ قیامت تک کے مسلمانوں کو دکھلا دیا ہے کہ دیکھو۔ یہ کیسے مسلمان ہیں۔ ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ ابو ثمامہ آتے ہیں کہتے ہیں۔ تمنا ہے کہ مولا یہ نماز آپ کے ساتھ باجماعت ادا ہو جائے۔ میں نے نوجوانوں کے اس اقدام کی کراچی میں تعریف کی ہے جنہوں نے نماز باجماعت کی روایت کو مجلس عزا میں رائج کیا ہے۔ کچھ لوگ جو قدیم تصورات رکھتے ہیں ان میں سے ایک نے مجھ سے کراچی میں کہا کہ حسین بڑے یا نماز۔ فوراً ذہن میں میرے یہ تصور آیا کہ یہ اس کے ذہن کی بات نہیں ہے۔ بہت سی باتیں منبر سے غلط طور

پہنچی ہیں۔ تو خیر انہوں نے جب یہ سوال کیا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ حسین تو نہیں ہیں آپ کا جلوس ہے اور نماز تو وہ ہے جس کے لئے حسین کا جہاد ملتوی ہو سکتا ہے تو آپ کا جلوس اگر اتنی دیر کے لئے رُک جائے تو یہ حقیقی یاد حسین ہو گی۔ تو اب آپ دیکھئے کہ حسین کے جہاد کی فضیلت کتنی بھی ہو مگر نماز وہ چیز ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ان سے کہو کہ اتنی دیر تک کے لئے جنگ روک لیں کہ ہم نماز ادا کر لیں۔ میں کہتا ہوں کہ مجھ ایسا جاہل جانتا ہے کہ شریعت اسلام میں ہر وقت پر ایک ترتیب نماز ہے۔ نماز کے ادا کرنے کے لئے التوائے جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگ مغلوبہ میں بھی نماز ہو سکتی ہے کبھی اشاروں سے ہو سکتی ہے کبھی دوسری صورتوں سے بھی۔ میں کہتا ہوں کہ کیا معاذ اللہ حسین اس فقہی مسئلے سے واقف نہیں تھے مگر یاد رکھئے کہ اگر یہود سے مقابلہ ہوتا تو التوائے جنگ کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر نصاریٰ سے مقابلہ ہوتا منکرین خدا سے مقابلہ ہوتا۔ التوائے جنگ کی درخواست نہ کی جاتی، کیونکہ بدنصیبی سے نام نہاد مسلمانوں سے مقابلہ تھا۔ اس لئے یہ التوائے جنگ کی درخواست نہ تھی یہ ان کے ضمیر اسلامی کو چیلنج کرد نیا کو دکھلانا تھا کہ دیکھو لیے مسلمان ہیں کہ نماز کے لئے جنگ نہیں روکتے۔ بس دو ایک مثالیں اور۔ کسی کے جاتے وقت اللہ کو گواہ نہیں کیا مگر جب علی اکبر جا رہے تھے ایک کتاب ہے دلائل خیرات۔ جو دلائل الخیرات شریعت کہلاتی ہے اس میں کچھ وظائف ہیں اور اس میں تصویر نعل شریف ہے۔ حضرت کے پاؤں میں پہننے کی نعل۔ نعل مبارک کی تصویر ہے اور اس کے نیچے یہ لکھا ہے کہ جس گھر میں یہ رہے اس میں خیر و برکت رہے گی مسلمان اس کتاب کو شریعت کہتے ہیں اور ذوق و شوق سے اس صفحہ کی زیارت کرتے ہیں جس میں تصویر نعل شریف ہے۔ آج چودہ سو برس کے بعد یہ کیفیت ہے

اور وہ نام نہاد مسلمانوں کا مجمع تھا جس کے سامنے۔ کون جا رہا ہے۔ حسین نے یہ نہیں کہا کہ میرا بیٹا جا رہا ہے۔ یہ کہا اللھم اشھد علی ھولاء القوم فقد برز الیھم غلام اشبہ الناس خلقا وخلقا ومنطقا برسولک اذا اشتقنا الی نبیک نظرنا الی وجھہ پروردگار گواہ رہنا کہ وہ جا رہا ہے جو صورت اور سیرت گفتار اور رفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے۔ خداوندا جب ہم تیرے رسول کے مشتاق زیارت ہوتے تھے تو اپنے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے یعنی اس نام نہاد اسلامی مجمع کے تمام افراد کو سُنا دیا کہ یہ شبیہ رسول ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رسول کے نام لیوا رسول کی اس شبیہ کی کیا قدر کرتے ہیں اور اہل عزا کسی کے ایک زخم آیا ہوگا، لیکن جب سناں کا وار لگ چکا تو گھوڑا علی اکبر کو لے کر فوج کے اندر چلا گیا اب روایت میں ہے کہ جدھر سے گزرے ایک تلوار کا وار ہو گیا۔ فقطعوہ بسیوفھم إربا اربًا ارے رسول کی تصویر کو اپنی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ پتہ چل گیا کیسے مسلمان ہیں۔ اب یہاں بھی چونکہ دو لفظیں کہی تھیں۔ اسلام اور انسانیت تو اب ختم کروں گا کہ اسلام کو آزما کر دکھلا دیا۔ اور قیامت تک کی مسلم اور غیر مسلم دنیا کو دکھلا دیا کہ یہ لوگ کیسے ہیں۔ اب ہاتھوں پر وہ بے شیر ہے جو ہر مذہب کی زبان میں معصوم ہے۔ علی اکبر تک وہ کہہ سکتے تھے کہ تلوار لے کر آئے تھے نہ لڑتے تو کیا کرتے مگر اب علی اصغر کو لا کر مولا نے یہ حجت تمام کر دی ارے یہ تو کوئی تلوار لیکر نہیں آئے یہ تو صرف زبان پر اپنی اس کو تلوار سمجھو یا جو سمجھو۔ انکے پاس تو تلوار نہیں ہے۔ بس اہل عزا کیا ہوا۔ وہ آپکو معلوم ہے۔ حسین کے ہاتھوں پر بے شیر اور وہ تیر۔ اس تیر نے انکی رگ گردن کو نہیں توڑا بلکہ ظالموں کے چہروں پر جو پڑی ہوئی تھی اس انسانیت کی نقاب کا یہ آخری تار تھا جو ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اور بس اس جملے پر ختم کرونگا حالانکہ اسمیں نہ تیر ہے نہ تلوار۔ میں کہتا ہوں کہ مولا نے گویا قیامت تک کی دنیائے انسانیت کو مخاطب کرکے سوال کر لیا کہ تم تباہ والیوں کی بیعت کر لیتا۔

مجلس دہم

امامت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۔

پہلے ہی پارے کے آخری حصہ میں اور موجودہ ترتیب کے لحاظ سے سورہ الحمد کے بعد پہلے ہی سورہ میں یعنی سورہ بقرہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ۔ وہ موقع آیا جب ابراہیم کا ان کے رب نے امتحان لیا کچھ باتوں کے ساتھ۔ تو انہوں نے ان کو بالکل پورا پورا حل کر دیا۔ تو ارشاد ہوا کہ میں تمہیں تمام انسانوں کا امام قرار دیتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ۔ اور میری اولاد میں سے۔ تو ارشاد ہوا کہ میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا بس یہ تو ترجمہ ہو گیا۔ اب ہے لفظ جو۔ بہت سی لفظیں جو استعمال ہوتی ہیں ان کے کسی قانونی اصطلاح میں کوئی خاص معنی ہوتے ہیں۔ اور لغت میں اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایسے ہی ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ لغت کے معنی محفوظ بھی رہتے ہیں مگر پھر اصطلاح میں اسمیں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ کچھ قیدیں لگ جاتی ہیں۔ خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے مگر وہ اصل معنی جو ہیں وہ محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً یہاں بھی غالباً دیکھی ہے۔ ہمارے ہاں تو عدالت کی کرسی میں ایک عہدہ ہوتا ہے منصف کا اور ایک عہدہ ہوتا ہے جج کا۔ منصف سے جج کا درجہ اونچا

ہوتا ہے منصف کا درجہ نیچے ہے اور جج کا درجہ اُوپر - یہ تو اصطلاح میں ہے لیکن لغت میں جج کے معنی ہیں منصف - تو منصف وہی ہے جو جج ہے - لغت کے اعتبار سے جج کو منصف کہنا درست ہے اور منصف کو جج کہنا درست ہے - مگر عدالت کی زبان میں اگر کبھی سرکاری کاغذ میں آپ جج صاحب کو مخاطب کیجیے منصف کہہ کر - تو وہ شاید توہین کا دعویٰ کر دیں - اور منصف کو جج کہہ کر خطاب کیجیے - تو خیر وہ تو اپنی جگہ چاہے آپ خوش ہوں مگر غلط تو سمجھیں گے - تو اصطلاحی مفہوم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں اور لغوی مفہوم کے تقاضے اور ہوتے ہیں - امام کی لفظ جب ہم لغت میں دیکھتے ہیں تو اس کے معنی پیشوا کے ہیں - جو کسی راہ میں کچھ افراد کا مقتدیٰ ہو - وہ امام کہا جائے گا لغت میں - لغت کے معنی امام کے یہ ہیں - اور قرآن مجید میں بھی اس معنیٰ میں استعمال موجود ہے - یہاں تک کہ ہم جس کے - معاذ اللہ معاذ اللہ کہہ کر اس کے اصطلاحی معنی کو اگر سامنے رکھیں - تو معاذ اللہ کہیں گے اور قرآن ان کے لئے بھی لفظ امام صرف کر رہا ہے - جو دوزخ کی طرف لے جائیں گے وجعلناھم آئمة یدعون الی النار -

ایسے بھی امام ہیں جو دوزخ کی طرف لے جائیں گے - یعنی جو گروہ ان کے پیچھے ہے تو جدھر وہ جا رہے ہیں ان کا مقتدیٰ اسی کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے - اسی کے پیچھے وہ جا رہے ہیں - تو وہ ان کا امام ہے - اور ایک سلسلہ ہے آیتِ قرآنی کا - کہ وہ ہے تو تعریف -

قرآن مجید نے مدح کے انداز میں پیش کیا ہے مگر وہ بھی تعریفیں اس طرح کی ہیں کہ کوئی ذہن یا ذوقِ سلیم اس کو قبول نہیں کر سکتا - کہ وہ معصومین کی تعریف ہے وہ سورہ فرقان کی آیتیں ہیں - انیسویں پارہ میں وعباد الرحمٰن یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلٰما -

اللہ کے وہ بندے قابلِ تعریف ہیں جو زمین پر آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہیں کہ کسی کو ایذا ہمارے قدم سے نہ پہنچے۔ یعنی متکبرانہ چال بھی نہ ہو۔ اور جاہل لوگ بھی جب ان سے اپنے انداز میں یعنی سخت کلامی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو ان کے جواب میں سلام کر لیتے ہیں۔ یعنی سخت کلامی کا بھی جواب سخت کلامی سے نہیں دیتے۔ خیر یہاں تک کوئی کہہ دے کہ ہو سکتا ہے کہ معصومین کی مدح میں کہا گیا ہو مگر اب اسی میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جو ذہن کسی طرح قبول نہیں کرتا۔ والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون۔

وہ بندے اس کے ایسے ہیں کہ جو اللہ کے سوا کسی کو اس کا شریک نہیں کرتے اور کسی بے گناہ نفس کو قتل نہیں کرتے اور جنسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ تو اب یہ تعریف کیا معصومین کی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سچے مسلمان جو اللہ کی نگاہ میں ہوں۔ انہی کی تعریف ہے کہ۔ ایسے کردار ان کے ہیں کہ منہیات سے بچتے ہیں۔ اور وہ ان کے اوصاف ہیں کہ تواضع رکھتے ہیں۔ اب اسی سلسلے میں یہ آتا ہے کہ والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما۔

وہ یہ کہتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں ان کی تمنا یہ ہے۔ خدا سے یہ التجا کرتے ہیں کہ پروردگار ہماری جو بیویاں ہیں۔ یعنی شریکِ زندگی۔ اور ہماری جو نسل ہے۔ اس میں ایسے افراد قرار دے جو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوں۔ اور ہمیں پرہیزگاروں کے لئے امام بنا۔ اب یہ گویا سچے مسلمانوں کے کردار میں یہ کہا جا رہا ہے کہ واجعلنا للمتقین اماما۔

یہ دعا کیا عمدہ کی کرتے ہیں جو پیشِ خدا چند افراد کے لئے مقرر ہے۔ نہیں۔ یعنی ہمیں کردار کی اس بلندی پر پہنچا کر لوگ ہمیں دیکھ کر مثال بنائیں اور ہمارے پیچھے

پیچھے چل کر متقی اور پرہیزگار بنیں۔ چنانچہ میں بھی کبھی کبھی قنوت میں یہ دعا پڑھ لیتا ہوں
قرآن نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرنے کی مدح کی ہے۔ چنانچہ میں قنوت کے لئے اسے
بھی ایک بہترین دعا سمجھتا ہوں۔ تو اب یہ لغوی معنی سے ہے کہ ہم ایسے نقطۂ عمل پر
ہوں کہ بہت سے لوگ ہمارے پیچھے چل کر متقی بنیں۔ بہت سے لوگ ہماری
پیروی کر کے ہم کو اپنا امام یعنی نمونۂ عمل بنا کے وہ ہمارے نقشِ قدم پر چلیں۔ بارگاہِ
الٰہی میں اس کی دعا ہر سچے مومن کو کرنی چاہیئے۔ تو یہ امام کی لفظ جو ہے وہ لغت کے
معنی کے لحاظ سے ہے اور جس طرح وہ آپ کے قانون کی لفظیں ہیں کیا وہ بھی لغوی
مفہوم میں۔ لغت کے مفہوم میں صرف نہیں ہوتیں۔ اب تو بحمد اللہ پاکستان بننے
کے بعد یہاں مناظروں کا رواج نہیں رہا۔ لیکن آپ میں سے بعض حضرات اس دور
کے آدمی ہوں گے۔ جب زور شور سے یہاں مناظرے ہوتے تھے۔ تو مناظروں میں جج
مقرر نہیں ہوتے تھے ؟ تو وہ کیا سب ویسے جج ہوتے تھے۔ جو عدالت میں جا کر
کرسی پر بیٹھ جائیں وہ صاحب تو لغت کے معنی کے لحاظ سے جج کہے جاتے تھے
اب کوئی اعتراض کرے کہ جناب جج تو وہ ہوتے ہیں جو کرسی پر ہوں تو یہ وہاں جا
کر بیٹھیں جہاں اصل جج ہیں۔ صاحب قانون کی بات اور ہوتی ہے لغت کی بات
اور ہوتی ہے۔ تو قانون کے لحاظ سے جو درجہ مقرر ہے تو اس میں ایک درجہ
والے لفظ کا استعمال دوسرے درجہ والے کے لئے غلط ہو جائے گا جیسے میں نے
کہا منصف کو جج کہنا اور جج کو منصف کہنا۔ تو یہ تو میں نے تمہیداً۔ ضمناً۔ گویا ایک
بات بیان کر دی۔ کیونکہ بعض وقت لغوی معنی میں کوئی لفظ بولی جاتی ہے تو اس
سے لوگوں کو غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب جو عرض کرنا ہے وہ یہ کہ اصطلاحی
حیثیت سے ہم جب قرآن مجید اور احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اللہ کی
جانب سے تین عہدوں کے نام معلوم ہیں۔ سب سے پہلا عہدہ نبوت بلفظ

یں نبی کے معنی خبر دینے والا۔ اور اب وہ عام معنی ہے مخبر۔ اس مفہوم میں قیدیں بڑھ گئیں کہ اُدھر کی خبریں۔ غیب کی خبریں۔ جنت و نار کی خبریں دینے والا۔ اُدھر سے جو آئے تو وہ نبی۔ تو یہ عہدہ ہمارے سامنے شروع ہوا حضرت آدم سے۔ ہمارے سامنے شروع ہوا۔ عالم باطن کی بات کا ذکر نہیں۔ جہاں سے ہم فہرست انبیاء مرتب کریں گے وہاں سے پہلے نبی حضرت آدم۔ اب یہ سلسلہ آگے بڑھ کر پہنچا۔ حضرت نوح تک تو حضرت نوح تک جتنے تھے بیچ میں۔ زمین حجت خدا سے خالی تو نہیں رہتی۔ درمیان میں اک سلسلہ تھا جس کے پورے نام ہمیں اکثر کو معلوم نہیں ہیں۔ اور معلوم بھی ہوں تو یاد کہاں ہوں گے۔ تو وہ ہزاروں برس کی مدت میں نہ جانے کتنے تھے۔ وہ ماورائے تاریخ اتنے تھے کہ اس کی مدت بھی نہیں معلوم۔ تو وہ جناب بیچ میں جتنے ہوتے رہے بس وہ نبی تھے اس کے آگے کچھ نہیں۔ ابھی تک گویا قانونا لمی میں یہ عہدہ قائم ہوا تھا۔ اب اس کے بعد حضرت نوح تشریف لائے تو یہ سب سے پہلے رسول ہوئے۔ نبوت شروع ہوئی تھی حضرت آدم سے اور اب رسالت شروع ہوئی حضرت نوح سے۔ ان کی عمر چونکہ تمام انبیاء و مرسلین میں سب سے زیادہ ہوئی ہے اس لئے ان کو شیخ المرسلین کہتے ہیں۔ لقب ہے ان کا۔ وہ بربنائے افضلیت نہیں۔ بربنائے طول عمر ہے اور وہ بھی طول عمر رہی آنکھوں کے سامنے۔ ورنہ حضرت حضرت عیسے کی عمر ان سے بڑھ چکی ہے پھر بھی شیخ المرسلین وہی ہیں۔ تو نبی کے لغوی معنی خبر دینے والا اور رسول کے معنی پیغامبر۔ پیغام پہنچانے والا۔ اب وہی جو میں نے کہا کہ منصف جج اور سرنج منصف۔ تو وہ نبی تھے بے چارے تو کیا وہ پیغام پہنچاتے ہی نہیں تھے۔ لغت کے اعتبار سے ان کو بھی رسول کہہ دیا جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر ادھر قانون کی طرف سے عہدہ ابھی قائم نہیں ہوا تھا وہاں نبی کی لفظ تھی اور اب

ہمارے ہاں تاریخ کے اعتبار سے صاحب شریعت رسول وہ ہوتا ہے جو صاحب شریعت ہو۔ تو اس وقت نوع انسانی محدود تھی۔ اور شروع میں تو بس اولاد جناب آدم جو براہِ راست تھی یا ایک پشت اور گذری ہو بس وہی۔ نوع بشر کا رقبہ۔ تو اس لئے ان کے ضروریات بھی مختصر تھے کچھ ابتدائی تعلیمات۔ تہذیب کو آگے بڑھانے کیلئے جو نقش بنیاد بن سکتے ہیں۔ وہ کچھ دے دیئے گئے تھے۔ تو اس لئے ان تعلیمات کو شریعت نہیں کہتے تھے یقیناً کچھ اصول زندگی تو لے کر آئے تھے۔ لیکن وہ اتنے مختصر و محدود تھے کہ اسے کوئی شریعت کا نام نہیں ملا ہے۔ شریعت جو لے کر آئے ہیں وہ حضرت نوحؑ لے کر آئے ہیں۔ اس لئے جس طرح وہ پہلے نبی اس طرح حضرت نوحؑ پہلے رسول۔ اب رسالت چلتی رہی۔ مگر چلنے کے یہ معنی نہیں کہ ایسے افراد ہوا کریں جو اس منصب کے حامل ہوں۔ یعنی اب ابتدا رسالت کی ہو گئی اس کے بعد جو لوگ آئے ہیں ہو سکتا ہے فقط نبی ہوں کیونکہ دو عہدے ہو گئے ہیں ایک نبی ایک رسول۔ اب جب تک شریعت نہیں بدلے گی اس وقت تک رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اس وقت تک انبیاء ہی ہوتے رہیں گے۔ تو بہرحال اب یہ عہدے چلے۔ گویا ایک نبوت ایک رسالت۔ اب حضرت نوحؑ کے بعد جو ایک قد آور شخصیت آئی وہ حضرت ابراہیمؑ کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ دو عہدوں کے مالک ہیں۔ نبی بھی ہیں اور رسول بھی ہیں۔ نبوت اور رسالت دونوں عہدوں کے یہ مالک ہیں مگر نبوت ملی تھی تو کوئی امتحان نہیں لیا گیا تھا۔ رسالت ملی تھی تو کوئی امتحان نہیں ہوا تھا بس اللہ نے اپنے علم کی بنیاد پر نامزد کر دیا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ مگر اب یہ نبی ہیں اور رسول ہیں اور فقط رسول تھوڑی ہیں اب وہ عہدہ نہیں ہے اب وہ اعزاز ہے کہ خلیل بھی تو ہیں خلیل اللہ ہیں۔ اللہ کے دوست ہیں اتنا بڑا اعزاز ہے ان کا عہدے تو وہی دو ہیں نبی اور رسول۔ مگر اب یہ نبی ہوتے ہوئے رسول ہوتے ہوئے

اب بلائے جاتے ہیں امتحان میں۔ امتحان میں بلائے جاتے ہیں جیسے بچوں کا امتحان ہوتا ہے ویسے ہی سرکاری عہدوں میں بھی تو امتحان ہوتا ہے۔ تو اس امتحان کا جو نام آپ رکھتے ہوں وہ نام آپ انگریزی میں رکھ لیں۔ تو اس امتحان کے لئے جو صلاحیت کام کے لئے درکار ہوتی ہے۔ کسی عہدہ پر مقرر کرنے کے لئے جو امتحان ہوتا ہے۔ اب اس امتحان میں بلائے گئے۔ اللہ کے لئے لکھ کر پرچہ امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ زبانی ہو کچھ ہو القا کے ساتھ ہو۔ ملک کی زبانی ہو۔ اب تفصیلات تو قرآن میں نہیں ہیں کہاں سے بیان کروں۔ بہر حال امتحان کسی طرح اب لیا جا رہا ہے۔ اب آپ کے ہاں امتحان جو ہوتا ہے اس میں کامیابی کے نمبر کہیں تینتیس فیصدی کہیں پچاس فیصدی ہوتے ہیں۔ تو وہ ادنیٰ درجہ کی کامیابی تو اسی میں ہو جائے گی۔ تو اس کے بعد جناب فیصدی پچاس ہوتے۔ غرض ایسا تو بہت کم ہوتا ہے کہ ایک عدد بھی ممتحن کم نہ کرے بس معلوم ہوا کہ وہ ریاضی وغیرہ میں کبھی کبھی سو میں سے سو آجاتے ہیں کیونکہ اس میں اگر بالکل صحیح لکھا ہے تو نمبروں میں کمی نہیں ہوتی اور اگر غلط لکھا ہے تو کچھ بھی حق نہیں ہے۔ یہاں فرض کیجئے دو سوال غلط ہیں۔ تو اس کے لحاظ سے نمبر کم کر دے ورنہ اگر لڑکا صحیح لکھے تو اس میں گنجائش ہی نہیں ہے نمبر کم کرنے کی۔ چاہے ممتحن کا دل بھی چاہتا ہو۔ کیونکہ ممتحن کو شوق ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کم کر دوں۔ تو جناب کچھ تو کم ہو ہی جاتا ہے۔ مگر یہ کہ یہاں خالق اعلان کر رہا ہے۔ جس کے ہاں مبالغہ کا سوال نہیں وہ کہہ رہا ہے فَاَتَمَّھُنَّ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب در بند۔ سو میں سے سو کامیابی۔ یعنی ایک بھی نمبر کی کمی نہیں تو میں کہتا ہوں یہ نبی ہیں رسول ہیں تو آخر اس امتحان کی ضرورت کیا ہے۔ یہ صرف اس عہدہ کی بلندی دکھلانے کو۔ کہ دیکھو ہر نبی اس کا مستحق نہیں ہے۔ رسول بھی اس کا مستحق نہیں ہے۔ رسولوں میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ کون مستحق ہے۔ صلوٰۃ۔

اور پھر ماشاء اللہ بفیض مجالس عوام بھی ہمارے بہت سی دینی حقیقتوں سے تو باخبر ہیں ہی۔ ہم بحمد اللہ تمام انبیاء کو معصوم مانتے ہیں بلا استثناء۔ تو ہمارے لئے عجیب مصیبت ہو گئی ہے۔ کہ جناب۔ حدیث میں تفسیر میں کہیں بھی دنیا کوئی حرف آدم پر لا رہی ہو۔ تو ہم وکالت کریں۔ حضرت نوح پر کوئی الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو تو ہم بیچ میں آئیں۔ ہم تمام انبیاء کی وکالت کے ذمہ دار ہیں صلوٰۃ۔

تو بہر حال ہمارا متفق علیہ فیصلہ ہے کہ انبیا سے گناہ نہیں ہوتے مگر پھر بھی جن جن چیزوں سے دنیا گناہ کرتی ہے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے لائی جاتی ہیں۔ اور جیسے دنیا کو گناہ گار ثابت کرنے سے دلچسپی ہے۔ تو وہ تو ملتے نہیں کہنے کو۔ ہم ہی سے کہا جاتا ہے دیکھئے انہوں نے یہ کہا۔ انہوں نے یہ کہا۔ ان سب کی طرف سے جواب ہمارے ذمہ ہے کہ ہم دیں۔ تو اب جہاں اکثر باتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ وہ گناہ نہیں تھا ترک اولیٰ تھا۔ یہ آپ نے برابر سنا ہو گا کہ ترک اولیٰ تھا۔ تو ترک اولیٰ کے معنی دیکھئے۔ ترک اولیٰ کے معنی تو یہ ہیں کہ یقیناً کچھ کمی تو ہوئی۔ ورنہ وہ ترک اولیٰ ہی کیوں ہوتا۔ یعنی وہ جو منزل اولیٰ تھی اس سے کچھ کمی رہ گئی۔ یہی معنی ترک اولیٰ کے ہیں۔ وہ کمی ایسی نہیں ہے جو گناہ کی فہرست میں داخل ہو۔ مگر کچھ تو کمی ہے۔ تو جناب ہر نبی کے ہاں ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔ مگر اب حضرت ابراہیم کو خالق سند دے رہا ہے کہ اَتَمَّهُنَّ خالق جس کا نام ہی حق ہے۔ اس کی زبان پر حق کے سوا کسی اور چیز کا بیان کہاں آسکتا ہے وہ کہہ رہا ہے۔ فَاَتَمَّهُنَّ تمام و کمال۔ تو ذرا بھی کمی ہو تو وہ کیونکر کہے تمام و کمال۔ یعنی وہ تو انبیاء کے لئے۔ ذرا سی کمی ہو تو۔ سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو گنہگاروں کے لئے استعمال ہوتے ہیں وہ ترک اولیٰ پر الفاظ فرماد کرتا ہے جس میں ہم پر پھر مصیبت پڑتی ہے کہ ہم ثابت کرتے ہیں کہ وہ گنا

نہیں تھا۔ پھر ان کی بلندی کے لحاظ سے خالق نے یہ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں کہ تم اتنے بلند مرتبہ ہو کر تم نے یہ کیوں کیا۔ کوئی دوسرا کرتا تو یہ کیا جاتا۔ اس وقت وہ موضوع نہیں ہے جن جن چیزوں کو دنیا خلاف عصمت پیش کرتی ہے میں اس کو دلیل عصمت میں لاتا ہوں کہ اگر معصوم نہ ہوتے تو اس بات پر روکا نہ جاتا۔ اس بات پر تنبیہ نہ کی جاتی۔ یہ تنبیہیں دلیل ہیں ان سب کے معصوم ہونے کی۔ مگر بہر حال تنبیہیں ہوتی ہیں۔ تو کچھ نہ کچھ تو ہے ہی جیسے واجب ترک نہیں ہوا مگر مستحب ترک ہو گیا۔ حرام کا عمل نہیں ہوا مگر مکروہ کا عمل ہوا۔ تو کمی ہوئی اس قدر کہ ترک اولیٰ کا عنوان قائم ہوا۔ مگر جہاں قرآن کہے فَاَتَمَّھُنَّ پورا پورا پرچہ اس نے حل کر دیا۔ جو بات صحیح صحیح ہونا چاہیے تھی وہ ہو گئی۔ تو آپ بتائیے کہ کس کمی کی گنجائش رہ گئی۔ جب کمی کی گنجائش نہ رہی۔ تو اس سے اولیٰ کیا ہو گا جو ترک اولیٰ ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت تک ترک اولیٰ ہو گا رسالت تک ترک اولیٰ ہو گا مگر جہاں امامت آ جائے گی صلوٰۃ۔

غرض اتنا شاندار نتیجہ امتحان اور جب اس میں کامیابی ہو گئی تو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اچھا اب تم کامیاب ہو گئے اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ میں تم کو تمام انسانوں کے لیے۔ ناس۔ اسم جمع ہے اور اس پر الف لام استغراق ہے۔ میں تم کو تمام انسانوں کے لیے امام بناتا ہوں۔ نبوت اور رسالت میں ہمیں معلوم ہے کہ۔ وہ محدود ہوتی رہی ہیں۔ ارے ایسے نبی تھے جو ایک قریے کے نبی ہیں۔ انہی کے دور میں جناب لوطؑ تھے وہ بس ایک بستی تھی وہاں کے نبی تھے۔ اور ایسے ہی بہت سے انبیاء۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسےؑ کے لیے تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت عام نہیں تھی۔ صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ قرآن مجید میں بھی ہے رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ بنی اسرائیل کیلئے

رسول بنا کر بھیجا۔ بائبل میں بھی ہے کہ اسرائیل کی بھیڑوں کو چرانے کے لئے آیا ہوں۔ تو یہ ہدایت خلق کے لئے تعبیر مجازی ہے۔ بائبل کی زبان میں بھیڑوں کا چرانا۔ یعنی خلقِ خدا کا صحیح راستے پر لے چلنا۔ تو اسرائیل کے لئے۔ دعویٰ تھا ان کا یہی بائبل میں ہے اور قرآن بھی یہی کہہ رہا ہے اور اس کے بعد شواہد اس کے بہت ہیں جو اس وقت پیش نہیں کرنے۔ تو بہر حال تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ باوجودیکہ رسول ہیں۔ فقط نبی نہیں ہیں۔ جناب موسیٰ بھی رسول ہیں اور اولی العزم رسول ہیں۔ اور جناب عیسیٰ بھی رسول ہیں اور اولی العزم رسول ہیں مگر رقبہ رسالت محدود ہے۔ بنی اسرائیل کے اندر۔ اوروں کے لئے نہیں ہے۔ اور شریعت انکی انہی کے لئے تھی دوسروں کے لئے نہیں تھی۔ لیکن اب دیکھئے کہ امامت جہاں سے شروع ہوئی ہے وہیں سے للناس بلامحدود۔ تمام نوع انسانی کے لئے۔ بلا تفریق ملک بلا تفریق صوبہ۔ بلا تفریق زبان۔ بلا تفریق رنگ۔ بلا تفریق نسل۔ تمام انسانوں کے لئے۔ اِنِّی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ تمام لوگوں کے لئے امام بناتا ہوں۔ اعلان ہوا نبوت ملی لے لی کوئی سوال نہیں کیا۔ رسالت عطا ہوئی۔ لے لی۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ خلت کا اعزاز ملا قبول کر لیا۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر جب امامت ملی تو فوراً ربط لگا دیا۔ وہ کہہ رہا ہے میں تمہیں انسانوں کا امام بناتا ہوں وہ کہتے ہیں وَمِنْ ذُرِّيَّتِي۔ اور میری نسل میں سے بھی تو۔ اور میری اولاد میں سے بھی تو۔ یہ کیا بات۔ جناب آپ کو منصب ملا ہے۔ آپ یہ ربط کیوں لگا رہے ہیں۔ اور میری اولاد میں سے بھی تو۔ پہلے ایک سطحی پہلو عرض کروں گا۔ حضور نبوت ملی تھی بلا امتحان۔ رسالت ملی تھی بلا امتحان۔ بلند ظرف لوگ۔ ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ کوئی کچھ عطا کرے تو مزید یہ مانگنے لگیں، لیکن جناب امامت یونہی نہیں ملی ہے۔ امتحان لے کر نتیجہ امتحان کے

ساتھ ساتھ عہدہ دیا گیا ہے تو میں کہتا ہوں طالب علم کا دل بڑھا ہوا ہے تو ادھر اعلان ہوتا ہے کہ تم کو ہم نے امام بنایا۔ تو جناب یہ تو ہوا نتیجہ امتحان۔ اب انعام کامیابی بھی تو۔ اب آپ تو ماشاء اللہ اس پہلو پر بہت لطف اندوز ہوگئے۔ اب دوسرا پہلو عرض کرتا ہوں کہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے جانتے تھے کہ نبوت ختم ہونے والی ہے رسالت ختم ہونے والی ہے اسے مانگ کر کیا کروں۔ لیکن امامت کے لئے جانتے تھے کہ تا قیامت رہے گی صلوٰۃ۔

تو جناب والا اب سوال کر لیا۔ میری اولاد میں سے بھی۔ اب خالق نے کیا جواب دیا۔ نہ بظاہر ہاں نہ بظاہر نہیں۔ جیسے ایک پورا جملہ الگ انہوں نے کہا وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ اور میری اولاد میں سے بھی۔ اب کچھ نہیں کہا جاتا کہ ہاں۔ ہم تمہاری اولاد میں عطا کرتے ہیں یہ منصب۔ یا نہیں عطا کرتے۔ نہیں ظاہر میں کچھ نہیں کہا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ۔ میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہ کلیہ۔ اور اب یہیں بتا دوں ظالم ہم سمجھتے ہیں جو تھپڑ مار دے کسی کے بلاوجہ وہ ظالم ہے۔ جو قتل کرے وہ ظالم مگر قرآنی اصطلاح دیکھئے کہ من یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون۔ جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے قدم بڑھائیں وہ ظالم ہیں صلوٰۃ۔

یہ ہے اس کا معیار۔ اس کی زبان پر جب لفظ ظالم ہو۔ تو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ لا ینال عھدی الظالمین۔ میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ تو جناب اب مفسرین حیران ہیں کہ یہ اقرار ہے کہ انکار ہے۔ یہ دعا کی قبولیت ہے کہ دعا کو رد کرنا ہے۔ تو بہت سے لوگوں کے مطلب کی بات تو یہی تھی کہ اسے رد شدہ مانیں۔ یعنی یہ کہ نہیں میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ اب وہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہے نہیں مطلب کا ہے یہ بھی ہمارے ہی مطلب کا۔ جہاں ظالموں کو بھی مستحق

منصب مان لیا جائے تو ان کے مطلب کا پھر بھی نہیں ہے مگر خیر یہ تصور نہیں، یہ انکار نہیں ہے اقرار ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابراہیم نے کب کہا تھا کہ میری کل اولاد کو۔ ارے ان کی لفظوں میں بھی ترک اولیٰ نہیں ہو سکتا تھا ورنہ خالق۔ امتحنھن کیوں کہتا۔ انہوں نے کل اولاد کے لیے مطالبہ کیا ہی کب تھا۔ انہوں نے پہلے ہی محتاط الفاظ کہے تھے۔ ومن ذریتی۔ میری اولاد میں سے بھی۔ یہ وراثت کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں استحقاق پیش نظر ہے اہلیت پیش نظر ہے۔ سب اولاد نہیں۔ میری کچھ اولاد میں سے بھی۔ یعنی جو تیری نظر میں اس کے مستحق ہوں، اہل ہوں۔ تو پہلے ہی انہوں نے من کہہ دیا تھا۔ تو اب یہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا تو انہوں نے ظالموں کے لیے مانگا کب تھا۔ وہ تو پہلے ہی کہہ رہے ہیں ان میں سے ان کے لیے جو تیری نظر میں اہل ہوں۔ تو میں ہرگز اس کو انکار نہیں مان سکتا۔ جب انکار نہیں ہے تو اقرار ہے اور جب اقرار ہے تو اس کا مطلب۔ میں اپنے لہجے میں کہتا ہوں کہ انہوں نے جو کہا۔ اور میری اولاد میں سے بھی تو جیسے خالق کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ہاں ہاں ضرور اور کیا یہ عہدہ ظالموں تک پہنچ جائے گا۔ یعنی وہی جو میری نظر میں ہیں تمہاری ذریت ہی سے تو ہیں۔ ان کو اگر چھوڑ دوں تو کیا ظالموں کو دے دوں۔ صلوٰۃ۔

اب ماشاءاللہ ارباب نظر ہیں اور نکتہ رس حضرات ہیں۔ جناب ایک پوری مجلس جتنے وقت میں ہوتی ہے۔ عام طور پر۔ اتنے میں تو میں نے صرف آیت کے اجزا کی تشریح کی ہے۔ الفاظ آیت کو ذرا تبصرہ کے ساتھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ تو اب ظاہر ہے کہ آیت کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ کہنا۔ اس مختصر وقت میں کیسے ہو سکتا ہے۔ تو اب جو عرض کرنا ہے وہ دیکھیے جہاں سے میں نے بات شروع کی۔ کہ آدم سے چلی نبوت۔ نوح تک نبوت ہی نبوت۔

نوح سے چلی رسالت تو اس کے بعد جو تیسرا عہدہ امتحان لے کر ملا ۔ وہ ہے امامت ۔ تو اب ابراہیم جو ہیں وہ نبی بھی ہیں رسول بھی ہیں امام بھی ہیں ۔ اب ان میں تینوں عہدے اکٹھے ہو گئے ۔ تو اب جو ان سے افضل ہستی آئے وہ کیا صرف نبی ہو گی پھر وہ افضل کہاں ہوئی ۔ تو کیا فقط رسول ہو گی یعنی نبی اور رسول ۔ پھر وہ افضل کیونکر ہو گی ۔ تو پھر ماننا پڑے گا قرآن اور عقل دونوں کی مدد سے کہ اب جو ہستی آئے گی وہ تین منصبوں کی حامل ہو گی ۔ بغیر اس کے وہ حضرت ابراہیم سے افضل نہیں ہو سکتی ۔ وہ ہستی اگر فقط نبی و رسول ہو تو حضرت ابراہیم سے کم ہو گئی ۔ لازماً اُسے بھی امام ہونا ہے ۔ اب کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو ۔ تمام فرزندانِ اسلام مانتے ہیں کہ محمدؐ افضل المرسلین ہیں تو کسی مسلمان سے گر پوچھئے کسی فرقہ کا بھی ہو ۔ تو کہے گا کہ ہاں ۔ افضل المرسلین ۔ تو جب افضل المرسلین ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہ نبی بھی ہیں رسول بھی ہیں اور امام بھی ہیں ۔ یہ تینوں عہدے ان میں جمع ہیں ۔ اب درمیان میں جو میں نے منزلیں طے کر کے گفتگو کی ۔ تو میں یہاں تک پہنچا ۔ تو اس میں جہاں بھی کہیں جھول ہو کمزوری ہو وہ بعد میں مجھے بتا دے ۔ میں اس پر غور کروں گا ۔ تو یہ نبی بھی رسول بھی اور امام بھی ۔ اور اب جناب بعض سوال ایسے ہیں جو ذہن میں کبھی نہیں آتے ۔ کسی کے توجہ دلانے پر خیال آجاتا ہے اور پھر جواب کے لئے سوچنا بھی پڑتا ہے ۔ تو حیدر آباد دکن میں ۔ جو ہندوستان کے حضرات ہیں وہ جانتے ہی ہیں کہ آخری نظام جو تھے جن کے بعد ریاست چلی گئی یعنی آصف جاہ کے تابع عثمان علی خاں ۔ وہ بڑے ذوق علم رکھنے والے آدمی تھے اور جو علماً وہاں جاتے تھے ۔ وہ ان سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ بلکہ ان سے کچھ علمی سوال کرتے تھے اپنے اطمینان کے لئے ۔ اور اس کے ساتھ اب وہ عنداللہ کیا ہوں مگر بہر حال تھے وہ اہل سنت کے سلسلے کے ۔ اور

اہلِ سنت نے انہیں ہمیشہ اپنے میں سے کہا۔ وہ اپنے کو تفضیلی کہتے تھے کہ میں تفضیلی ہوں یعنی حضرت علی کو افضل مانتا ہوں تمام دوسرے حضرات سے تو وہ تفضیلی کی حد تک تو اعلان کرتے تھے اور اس کے آگے جب پوچھا گیا تو کہا کہ میں اپنے آبائی مذہب پر ہوں اور بس۔ والدہ کو اپنی کہتے تھے کہ وہ بحمداللہ شیعہ اثنا عشری تھیں۔ بحمداللہ کے ساتھ کہتے تھے۔ ان کے نام پر انہوں نے وہاں عزا خانہ زہرا قائم کیا ہے۔ ان مرحومہ کا نام زہرا بیگم تھا۔ تو مجھ سے پہلی ملاقات میں انہوں نے یہ کہا کہ میری والدہ شیعہ تھیں۔ انہوں نے کہا آپ کو معلوم ہے میں نے کہا کہ ہاں معلوم ہے۔ اور اس پر میں نے جملہ کہا۔ سُننے کے بعد۔ کہ آپ کا تو مادری مذہب شیعہ ہے۔ تو ان کے ہاں دوسرے دن میرا بیان ہونے والا تھا انہوں نے ایک ملاقات کا پیغام بھیج دیا۔ تو وہ سوچ کر میں نے رکھا ہے۔ اور واقعی وہ سوال مجھ سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ پیش نظر رکھئے گا کہ وہ تفضیلی ہیں۔ یعنی حضرت علی ابن ابی طالب کی فضیلت میں وہ کمی کسی صورت میں گوارہ نہیں کر سکتے۔ ان کے سلام کا مصرعہ ہے۔ علی کی معنوی پیغمبری سمجھا تو میں سمجھا۔ وہ سمجھے ہیں میں تھوڑی سمجھا ہوں۔ اب جو شخص یہ کہتا ہو ظاہر ہے کہ اس کے سوال کے جواب میں ایسی بات تو نہیں کہی جا سکتی جو اس کے تصور کو جھٹکا لگائے۔ اب دیکھئے کہ کتنا مشکل سوال انہوں نے کر لیا۔ انہوں نے کہا یہ بتائیے کہ یہ پیغمبر پر رسالت کیوں ختم ہو گئی۔ کوئی آدمی اس منصب کا اہل نہ ہو تو ختم ہو جائے لیکن جب ایک ذات اس منصب کی اہل موجود ہے تو یہ رسالت آخر ختم کیوں ہو گئی۔ اب یہ دونوں باتیں ہیں کہ ختم رسالت مسلّم ہے۔ ان کے نزدیک۔ یہ نہیں ہے کہ اس کے منکر ہیں مگر حضرت علی کی اہلیت ان کے نزدیک بہ اعتبار فضائل مسلّم۔ تو اب یہ گویا ان کے لئے معمّہ ہے۔ ان کے ذہن پر یہ خیال اتنا غالب تھا کہ بار بار اس کو وہ

دہرلتے ہیں۔ اپنے سوال کو۔ خیر جب تک وہ اپنے خیال سے محظوظ ہوتے رہے میں خاموش رہا۔ جب ان کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے کہا کہ عہدہ اس لئے نہیں ختم کیا جاتا کہ کوئی آدمی اس کے لائق نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اور سبب ہو سکتا ہے کہ وہ ضرورت ختم ہو جائے۔ میں نے کہا کہ جنگ کی ضرورت سے بہت سے عہدے بہت سے دفتر کھولے جاتے ہیں۔ بہت سے آدمی اس پر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو وہ دفتر توڑ دیا جاتا ہے عہدہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ تو کیا اس لئے کہ کوئی آدمی اس عہدے کے قابل نہیں رہا۔ ممکن ہے وہی آدمی ہو جو تھا مگر پھر بھی عہدہ ختم۔ کیوں۔ وہ کام ضرورتاً تھا۔ ضرورت ختم ہو گئی کام ختم ہو گیا۔ تو آدمی لائق موجود بھی ہے تو کوئی اور کام اس کے سپرد کیا جائے گا۔ تو نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا جب تک ایک بھی خبر باقی ہے جو نہ دی گئی ہو۔ نبی کی ضرورت باقی ہے۔ رسول کے معنی ہیں پیغام پہنچانے والا جب تک ایک بھی پیغام باقی ہے اس وقت تک رسول کی ضرورت باقی ہے۔ اور جب پیغام سب پہنچا دیئے گئے ہوں کوئی پیغام باقی نہ ہو تو پھر اس جگہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چاہے آدمی موجود ہو جو اس عہدے کے لائق ہو۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ بس کل اسی موضوع پر بیان ہو جائے۔ دوسرے دن جو اس بات میں مزید اضافے کئے گئے وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ نبی کے معنی خبر دینے والا۔ رسول کے معنی پیغام پہنچانے والا۔ اور امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا۔ نبی کی ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک ایک بھی خبر ہے جو نہ پہنچائی گئی ہو جب ہر خبر پہنچائی جا چکی ہے تو نبی کی ضرورت ختم۔ نبوت ختم ہو جائے گی۔ رسول کا مطلب ہے پیغام پہنچانے والا۔ جب تک ایک بھی پیغام ہے جو نہ پہنچایا گیا ہو۔ چاہے اس کے لئے غدیر کے اجتماع کا انتظار ہو۔ جب تک ایک بھی پیغام ہو جو نہ پہنچایا گیا ہو اس وقت تک رسول کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد رسالت ختم، لیکن امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا۔ جب راستہ قائم ہے اور رہرو باقی ہیں اس وقت تک امام کی ضرورت ہے۔ صلوٰۃ۔

اور اب قانونی بات یہی ہے جانشین کے معنی کیا ہیں۔ اس کام کو انجام دینے والا۔ تو جو سرکاری طور پر جانشین کسی کام کے لئے ہو۔ اس کا لقب وہی ہوگا جو اس کے پیش رو کا ہے جس کا جانشین ہے۔ جج کی کرسی پر ایک دن کے لئے بھی بطور قائم مقام جو آئے وہ جج ہی کہلائے گا۔ کسی اور نام سے اس دن خطاب کر لیجئے تو توہین کا دعویٰ کر دے گا۔ مثلاً اس کا پرانا عہدہ۔ منصب کا کہہ دیجئے۔ اب آج کے دن جو وہ جج ہے۔ وہ عدالت کی توہین ہے۔ تو جو جس عہدہ کا جانشین ہوگا اُسے وہی نام ملے گا جو اس صاحب عہدہ کا ہے اب رسول کے پاس اللہ کی گویا تین پوسٹیں ہیں۔ ایک نبوت کا کام، ایک رسالت کا کام۔ ایک امامت کا کام۔ اب جو جانشین ہوگا وہ کس عہدہ میں جانشین ہوگا۔ اگر نبوت میں جانشین ہو تو نبی کہنا چاہیئے اگر رسالت میں جانشین ہو تو رسول کہنا چاہیئے۔ اس کے خلاف کوئی لفظ بھی غلط ہوگا۔ مگر یہ دونوں کام تو ختم ہو گئے یہ جگہیں ختم کر دی گئیں وہ پوسٹیں باقی نہیں رہیں۔ تو اب نہ اُس میں کوئی جانشین ہو سکتا ہے نہ اس میں کوئی جانشین ہو سکتا ہے۔ تیسرا کام کیونکہ قیامت تک برقرار ہے اسی میں جانشینی ہوگی۔ لہٰذا اب جو اس جگہ پر آئے گا امام ہوگا۔ مجھے منفی پہلوؤں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے مثبت پہلو ہی پیش کرتا ہوں۔ اصل میں بنیادی فرق وہیں سے شروع ہوا جہاں سے رسول کو دنیا کا ایک بادشاہ بھی تصور کر لیا۔ مگر مجھے کہیں ان کا عہدہ بادشاہ نظر نہیں آتا۔ متفق علیہ تاریخی بات ہے کہ فتح مکہ پر رسول نے ارشاد فرمایا کہ۔ ابوسفیان جب مسلمانوں میں شامل ہو گیا۔ ابھی تک پہلے کا ذکر تھا تو میں نے ہو گیا کہا اب جو بات ہوگی تو میں انہوں نے کہا کہوں گا۔ اب ذرا احترام ہو جائے گا۔ آگیا تو رسول نے

فرمایا عباس سے کہ اسے پہاڑی پر لے جا کر فوج اسلام کا تزک و احتشام دکھلا دو۔ وہاں اس دن اہتمام کے ساتھ دستے آئے تھے (مسلمانوں کے)۔ ہر ایک تاریخ میں مکمل طور پر اس کا ذکر ہے۔ اب اس وقت نہیں کہ جو دستہ آتا ہے تو وہ اس سے اتنا متاثر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو دیکھ کر فوراً کہہ اٹھتے ہیں یہ رسول اللہ کا دستہ ہے؟ ارے نہیں ابھی کہاں یہ تو فلاں انصار میں سے ایک ہیں۔ بہت سے گروہوں کے گزر جانے کے بعد حضرت خاص بنی ہاشم کے حلقے میں تشریف لائے۔ تو انہوں نے جناب عباس سے یہ کہا کہ۔ لقد اصبح ملک ابن اخیک عظیما۔ تمہارے بھتیجے کی سلطنت تو بہت عظیم ہو گئی۔ حالانکہ۔ یاد رکھئے۔ کہ جناب عباس اپنی تمام تر دینی بلندیوں کے باوجود تاریخی اعتبار سے اسلام میں نو وارد ہیں مگر یہ بات اس وقت تک ہے مسلمان کے ذہن نشین ہے یہ نہ جانے کس دور میں مسلمان بھولے ہیں اس کو۔ جونہی انہوں نے یہ کہا۔ ارے تمہارے بھتیجے کی سلطنت بہت عظیم ہو گئی تو جناب عباس نے ابوسفیان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ یہ سلطنت نہیں ہے نبوت ہے۔ صلوٰۃ۔

غرض یہ کہ اب یہ سلسلہ جو ہو گا تو ان میں سے ہر فرد امام ہو گا۔ تو اب نبوت میں جو اس سے کمتر درجہ کی چیز تھی اس میں عمر کی قید نہ ہو گی۔ گہوارے کا بچہ کہتا ہے اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ بنائے گا نہیں۔ اس نے مجھے نبی بنایا ہے تو اس سے بالاتر جو درجہ امامت کا ہے اس میں عمر کی کیا قید۔ اس دن کہہ چکا کہ پیغمبر نے اپنے دونوں نواسوں کے لئے فرمایا ابنای ھذان امامان قاما او قعدا۔ یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں چاہے کھڑے ہوں چاہے بیٹھے ہوں۔ اور اب چونکہ یہ اس سلسلے کے افراد تھے جنہیں خالق نے صاحب منصب کیا تھا اور اب رسول اس دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں تو انکا فریضہ آگئی

ہے کہاں ہستیوں کا تعارف کرا کے جائیں جواب اس سلسلے کے حامل افراد ہوں گے۔
اب جن جن حدیثوں کو دنیا محبت پر ڈھالتی ہے اور رشتے ڈھونڈتی ہے۔
حدیثیں سب تسلیم۔ فضیلتوں کے ہم منکر تھوڑی ہیں۔ مگر بہت چاہتے تھے محبت
محبت کرتے تھے یعنی دونوں سچے جز ملا کر ذہن کو غلط راستے پر لے جایا جا رہا ہے
ظاہر ہے جب فضیلت مان رہے ہیں تو یہ بھی سچی بات اور یہ کہ۔ بڑی محبت تھی
یہ بھی سچی بات۔ یہ کوئی دین رہبانیت تھوڑی ہے کہ بیٹی سے محبت کرنا کوئی بُری
بات ہو۔ بچوں کو چاہنا کوئی بُری بات ہو۔
اسی دین کے پیغمبر ہیں تو بیٹی سے محبت ضرور ہوتی چاہیئے اپنے نواسوں سے
محبت ہونا چاہیئے مگر فضیلت کی حدیثوں کو ڈھالنا اس محبت پر یعنی ربط قائم کرنا
ان میں اور اس قرابت میں۔ یہ دونوں جزوں کا غلط استعمال ہے۔ میں کہتا ہوں
حدیثوں کی نوعیت تو دیکھئے۔ بیٹی کو کہہ رہے ہیں کہ میرا پارہ جگر ہے لخت دل ہے
یہ سب باتیں محبت کی بنا پر ٹھیک تھیں لیکن مسلم صحاح ستہ کی حدیث صحیحین
کی حدیث اور صحیح بخاری کی حدیث کہ۔ سیدۃ نساء اہل الجنۃ۔ یہ اہل جنت کی عورتوں
کی سردار ہیں۔ تو جنت کیا اپنے خاندان کی کوئی چیز ہے۔ جنت وہ ہے جسے اللہ
نے ایمان اور حسن عمل کی جزا کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو صرف اپنی بیٹی ہونے کی وجہ
سے یہ کہنے کا کیا حق ہے۔ عقلی طور پر۔ اصولی طور پر۔ کہ یہ اہل جنت کی عورتوں
کی سردار ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ مکتب خیال تو یہ اب مجھے یاد آتا رہتا ہے کہ محمدؐ
رسالت اور بشریت میں تقسیم ہیں۔ اور ان کی کچھ باتیں بحیثیتِ رسول ہیں اور کچھ
باتیں بحیثیت بشر ہیں۔ لیکن اس نقطۂ نظر کے بڑے سے بڑے آدمی سے میں
یہ پوچھنے کے لئے تیار ہوں کہ جنت کے بارے میں جو بات ہوگی وہ بحیثیت
بشر ہوگی یا بحیثیت رسول ہوگی۔ صلوٰۃ۔

یہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں مطلب کیا۔ مطلب یہ کہ جنت میں جانے کا جو معیار ہے وہ میری بیٹی میں اتنے کمال کے نقطہ پر ہے کہ قیامت تک کوئی مسلمان خاتون اگر جنت میں جانا چاہے تو اس کے پیچھے ہی چل کر جاسکتی ہے۔ اس سے آگے چل کر نہیں۔ کون ہمارے ہاں کی خاتون ہے جو کنیز سیدہ کہنے کو اپنا حق نہ سمجھتی ہو۔ تو اگر کنیز سیدہ ہے تو سیدہ کے شعار کو وہ ذلت سمجھ سکتی ہے؟ سیدہ کے راستے سے ہٹنے کو وہ عزت سمجھ سکتی ہے؟ دیکھئے سیدہ عالم کا معیار حجاب کیا ہے۔ پردہ داری کا معیار کیا ہے۔ اپنے باپ کے خطبے میں کبھی برقع و چادر میں نہاں ہو کر بھی باپ کے خطبہ میں تشریف نہیں لائیں۔ حالانکہ جو حضرات ماشاءُ اللہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خانہ سیدہ عالم اور مسجدِ نبوی کے درمیان نہ کوئی کوچہ ہے اور نہ کوئی بازار ہے۔ وہ تو آج تک بھی مسجد سے باہر لے کر نہیں جاسکا۔ یہ اور بات ہے۔ جب تک میں نے دیکھا ہے کہ خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا ہے کوئی زیارت کے لئے اندر نہیں جاسکتا۔ یہ سب کچھ ہے مگر یہ کہ۔ اس کو باہر کر دیا گیا ہے یہ میرے دَور تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ تو جناب مسجدِ نبوی کے اندر ہے۔ بلکہ ایک عجیب چیز میں نے محسوس کی کہ۔ بہت سے دروازے ہیں اس کے۔ ان کے بہت سے نام ہیں۔ ایک دروازہ جس میں سے بڑھ کر۔ خانہ فاطمہ زہرا سامنے نظر آتا ہے۔ اس دروازہ کا نام ہے بابِ جبرئیل۔ جنت البقیع سے آگے بڑھئے اور پھر حرم میں داخل ہوئیے تو پھر وہ بابِ جبرئیل ہوگا۔ اس میں داخل ہوئیے گا تو خانہ فاطمہ زہرا ملے گا۔ اس کے بعد آگے بڑھئے تو روضۂ رسول ملے گا۔ میرے ذہن نے جغرافیائی ترتیب سامنے رکھ کر ایک رائے قائم کی کہ۔ آخر اس کا نام بابِ جبرئیل کیوں ہے۔ تو سوائے اس کے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اور لوگ اور دروازوں سے آتے ہوں گے لیکن جبرئیل

جب آتے تھے تو پہلے سیدہ عالم کے گھر پر سلام کرتے تھے۔ پھر رسول کی خدمت میں آتے تھے ورنہ دروازے کا نام آخر یہ کیوں ہوا۔ تو اب نہ کوئی کوچہ اور نہ کوئی بازار لیکن اس کے باوجود بھی باپ کے خطبے میں کبھی نہیں آئیں۔ یہ نہیں ہے کہ دل نہ چاہتا ہو دل تو ایسا چاہتا تھا کہ جب بڑا بیٹا جاتا تھا حسن مجتبےٰ۔ تو اکثر پوچھ لیتی تھیں کہ تمہارے جد بزرگوار نے آج کیا بیان کیا اور حسن مجتبےٰ اپنے جدامجد کے خطبے کا پورا مضمون ماں کو سنا دیا کرتے تھے۔ آپ کا سنا ہوا ہے وہ واقعہ۔ اس وقت واقعہ پورا پیش نہیں کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس طرح سے ایک سوال کا جواب بھی۔ قیامت تک کے لئے اپنی کنیزوں کو دے دیا۔ لوگ جو کہتے ہیں پردہ مانع تعلیم ہے تو انہوں نے بتایا کہ نہیں مانع تعلیم نہیں ہے اگر چاہیں تو اپنے محرم افراد کے ذریعہ سے وہ بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ وہ ہوا چلتی ہے جس میں محرومیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو یہ باپ کے خطبہ میں نہیں جاتیں۔ اور بے شک حکمِ الٰہی سے مباہلے میں گئیں۔ اس دن عرض کر چکا ہوں۔ مباہلے کے میدان میں بڑے اہتمام پردہ داری سے گئیں۔ آگے آگے رسول۔ پیچھے پیچھے علی ابن ابی طالب اور بیچ میں برقع و چادر میں نہاں ہو کر۔ مگر پھر بھی فاطمہ زہرا سے ناانصافی ہے اگر یہ اقرار نہ کیا جائے کہ جو ان کا معیارِ حجاب تھا اس کے لحاظ سے آج انہوں نے حکمِ الٰہی کی تکمیل میں ایک قربانی دی اور میں کہتا ہوں کہ اس طرح زینب کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ بیٹی یہ وقت کی بات ہے کہ میرے لئے اتنی ہی ضرورت تھی لیکن کبھی دینِ خدا کو ضرورت ہو تو کسی حال میں کہیں جانے میں عذر نہ کرنا اور وہ منزل زینب کے لئے آگئی۔ مگر کب عصر کے بعد۔ جب تک حسین زندہ رہے۔ تب تک بخدا کربلا میں پردہ کا جتنا وقار ثابت ہوا ہے اتنا تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ہوا۔ دیکھئے کربلا کی کیا صورتِ واقعہ ہے کہ ہر غیر اہم اہم پہ

قربان ہو رہا ہے۔ اصحاب بنی ہاشم پہ قربان ہو گئے۔ بنی ہاشم جتنے تھے حسین پہ قربان ہو گئے اور اگر کوئی چیز ایسی ہو جسے بچانے کے لئے حسین اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیں تو یہ اس کی اہمیت کے لئے کچھ کم بات نہیں۔ وقت یہ ہے کہ راکب دوش رسول ہے اور زمین پر ہے اور غشی کا عالم ہے اور یہ عالم ہے کہ ان ظالموں میں آپس میں اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ روح نے جسم سے مفارقت کی کوئی کہتا ہے نہیں ابھی زندہ ہیں تو شمر نے تدبیر انکشاف کی یہ بتائی کہ گھوڑوں کا رُخ خیموں کی طرف کر دیا جائے اگر زندہ ہیں تو آنکھ کھول دیں گے۔ بس اربابِ عزا گھوڑوں کا رُخ ہو گیا خیموں کی طرف۔ دیکھئے خطرہ حسین سے دُور ہو رہا ہے مگر زینب کا پردہ کیا چیز ہے کہ مولا کہنیوں پر زور دے کر اس ناتوانی میں اُونچے ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں ارے ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم کو۔

مجلس یازدہم

اُولوالامر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۔

اس آیت کو ،جو عنوان کلام ہے۔ میرا موضوع کلام قرار دیا گیا ہے۔ارشاد ہو رہا ہے کہ اے صاحبانِ ایمان اللہ کی اطاعت کرو اور ان حقداران حکمرانی کی جو تمہی میں سے ہیں۔ تمام اہلِ ایمان سے خطاب ہے تین اطاعتوں کا مگر قابلِ غور یہ بات ہے کہ اطاعت کے حکم تین ہیں اور لفظ اطیعوا بس دو دفعہ ہے۔ یعنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ۔ یا یہ ہوتا کہ ایک اطیعوا ہوتا اور اس کے تحت وہ تمام ہستیاں جن کی اطاعت فرض ہے درج ہو جاتیں۔ کیونکہ حرف عطف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک حکم میں کسی کو شریک کر دے۔ آپ کسی سے کہیں کہ کل فلاں وقت آپ اور وہ اور وہ میرے ہاں آئیں۔ تو اب بس۔ میرے ہاں آئیں ایک دفعہ کہنا کافی ہے۔ اور جو جو آئیں ان کا نام ایک ساتھ حرف عطف کے ساتھ۔ کہ آپ اور وہ اور وہ یہاں آئیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے۔ ایک طریقہ بات پر زور دینے کا وہ ہے کہ جن جن کا نام لینا ہے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حکم بھی دہرا دیا جائے۔ تو اب غور کیجئے کہ جن کی اطاعت کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ وہ ہیں تین۔ اللہ رسول اور اولی الامر۔ اور اطیعوا تین لفظوں کے ساتھ نہیں آتا۔ ورنہ ہوتا۔ اطیعوا اللہ

واطیعوا الرسول واطیعوا اولی الامر منکم۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔ یا ہر ایک کے ساتھ اطیعوا ہوتا ایک۔ یعنی تینوں کے ساتھ تین اطیعوا ہوتے۔ مگر قرآن مجید اس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے اس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے۔ نہ یہ کرتا ہے کہ ایک اطیعوا کہے۔ کہ اطاعت کرو۔ اور سب کا نام لے دے۔ اور نہ یہ کرتا ہے کہ تینوں کے ساتھ اطیعوا کہے۔ بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے کہ اللہ کے ساتھ تو ایک اطیعوا الگ اور رسول اور اولی الامر کے ساتھ ایک اطیعوا الگ۔ اس میں کوئی حکمتِ کلام ہونا چاہیئے۔ بلاغت کلام الٰہی ایک ایسا اسلوب اختیار کرے جو نہ اُس پر منطبق ہو نہ اس پر منطبق ہو۔ نہ تکرار فعل با اعتبار معمول ہو نہ ایک فعل میں تمام افراد شریک ہوں۔ بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے کہ ہستیاں تین اور اطاعتیں دو۔ تو اس کا کوئی سبب ہونا چاہیئے۔ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تو اصل حاکم کے اعتبار سے ہے اور اس کی حکمرانی ذاتاً ایک اور اکیلی ہے۔ اس حکمرانی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ذاتی حیثیت سے مرکز حکم صرف اس کی ذات ہے۔ لہٰذا پہلا اطیعوا جو آیا اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کا نام نہیں لیا گیا۔ اب اس کے بعد جو اطاعت ہوگی وہ نائبِ حاکم کے اعتبار سے ہوگی۔ اب جب نائب حاکم کی حیثیت سے اطاعت کرائی گئی تو اگر رسول اور اولی الامر کی اطاعت میں کوئی فرق ہوتا تو جیسے اللہ کے لئے اطیعوا الگ آیا ویسے ہی رسول کے لئے اطیعوا الگ آتا اور اولی الامر کے لئے اطیعوا الگ ہوتا۔ مگر نہیں۔ ایک اطیعوا میں رسول اور اولی الامر دونوں۔ اور اب۔ یہ ذرا علمی مسئلہ ہے۔ کہ حضور۔ اگر لفظیں تین ہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک لفظ سے کچھ معنی مراد ہوں دوسری لفظ سے دوسرے معنی مراد ہوں تیسری لفظ سے کوئی

تیسرے معنی مراد ہوں۔ متکلم نے تین مرتبہ لفظ صرف کی اور ہر لفظ میں اس نے ایک معنی مراد لے لئے جو قرینہ کلام سے سمجھ میں آگئے لیکن جب لفظ ایک ہو تو اس میں دو معنی نہیں ہو سکتے۔ تو ایک لفظ اطیعوا ہے جو رسول اور اولی الامر سے متعلق ہے۔ اب جس معنی میں رسول کی اطاعت ہو گی اسی معنی میں اولی الامر کی اطاعت ہو گی۔ جن قیدوں کے ساتھ رسول کی اطاعت ہو گی انہی قیدوں کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت ہو گی نہ مفہوم میں فرق ہو سکتا ہے نہ حدود و قیود میں فرق ہو سکتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں اللہ اور رسول کے بیچ میں اطیعوا آیا مگر رسول اور اولی الامر کے بیچ میں اللہ کو لفظ بھی گوارہ نہیں تھا۔ صلوٰۃ۔

تو اصل اطاعت اللہ کی ہے اور رسول کی اطاعت اس اعتبار سے کہ اس کے احکام ان کی زبان سے معلوم ہوتے ہیں اسی لئے قرآن مجید میں ایک آیت ملتی ہے کہ ارشاد ہوا۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ کیا مطلب۔ مطلب یہ کہ۔ تمہیں دو کام نہیں کرنے ہیں ایک کام ہے جس کے دو نام ہیں۔ وہی ایک نظام ہے اس کی پابندی اطاعت خدا بھی ہے اور اطاعت رسول بھی ہے۔ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔ اگر بس یہی کہنا ہے کہ۔ یہ دو الگ کام نہیں ہیں ایک ہی کام کے دو نام ہیں۔ تو یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ من یطع اللہ فقد اطاع الرسول جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے رسول کی اطاعت کی۔ یہ ادھر سے کیوں کہا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یہ نہیں کہا اس نے۔ کیوں نہیں کہا۔ یاد رکھئے بڑا فرق ہو جاتا نتیجے میں۔ اگر یہ کہا جاتا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے رسول کی اطاعت کی۔ تو اللہ کی اطاعت کو انسان اپنے نقطہ نگاہ سے متعین کرتا۔ کہ کس طرح ہم اللہ کی اطاعت کریں۔ اُسے

دیکھ لیجئے سے جس میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ یا اپنے اجتہاد سے یا اپنے ذہن سے یہ طے کر تا کہ اس راستے پر اللہ راضی ہوتا ہے جب سمجھ لیتا کہ اللہ کی اطاعت ہوئی تو پھر قرآن کی آیت کو ملاتا کہ بس رسول کی بھی اطاعت ہوگئی مگر قرآن نے یہ کہا ہی نہیں کہ جو خدا کی اطاعت کرے اس نے رسول کی اطاعت کی! اس نے تو یہ کہا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے تمہیں ان کے احکام دیکھنے ہیں۔ پہلے تمہیں ان کے فرمانوں پر نظر کرنا ہے۔ جب ان کی اطاعت ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی اطاعت ہوگئی۔ یعنی مرضیِ الٰہی میں تمہاری نگاہ سند نہیں ہے رسول کے اقوال سند ہیں۔ صلوٰۃ۔

اب یہ دو اطاعتیں ہیں الفاظ قرآنی کے لحاظ سے۔ ایک اطاعتِ خدا۔ ایک اطاعتِ رسول و اولی الامر۔ تو اب مسلمانوں سے میں پوچھتا ہوں کہ اللہ کی اطاعت میں کوئی قید کوئی شرط کچھ ہے کہ اللہ کی اطاعت کن باتوں میں ضروری ہے۔ کن باتوں میں اللہ کی اطاعت ضروری نہیں ہے تو یقیناً مسلمان کیسا ہر اللہ کا بندہ یہ کہے گا کہ۔ نہیں اللہ کی اطاعت میں کوئی شرط کوئی قید نہیں ہے۔ یعنی جو اس کا حکم ہو کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق۔ اس کی اطاعت ضروری ہے۔ اب میں کہتا ہوں دوسری شخصیت رسول کی ہے۔ تو اب ماشاءاللہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے۔ میں فرزندانِ اسلام سے پوچھتا ہوں کہ رسول کی اطاعت میں کوئی قید ہے؟ قرآن کے الفاظ میں تو جیسے اطیعوا اللہ مطلق ہے ویسے ہی اطیعوا الرسول مطلق ہے۔ الفاظ میں کوئی قید نہیں ہے۔ رسول کی اطاعت میں کوئی قید ہے؟ کہ کچھ احکام کی اطاعت ضروری ہو اور کچھ احکام کی ضروری نہ ہو۔ کیونکہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے اس لئے ہر طرف سے آواز آئے گی۔ بے شک بے شک رسول کی اطاعت مطلق طور پر فرض ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں فرض ہے۔ اب سب طرف سے آوازیں

آگئیں۔ ایک گوشے سے آواز آئی۔ مگر۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رسول کے بارے میں یہ مگر کہاں سے آ گیا۔ اور وہ بھی مسلمانوں کے مجمع میں سے۔ تو اب میں نے ذرا غور سے سنا کہ یہ مگر کیا ہے۔ تو سنائی یہ دیا کہ۔ بے شک رسول کے احکام پر بھی مطلق عمل واجب ہے مگر رسول کے وہ احکام جو بحیثیتِ رسول ہوں۔ مگر جو احکام رسول کے بحیثیت بشر ہوں ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ میں سیاست کی دنیا کا آدمی تو نہیں ہوں، لیکن ایک سُنی سنائی بات یاد رہ گئی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ملک کے بٹوارے کا اتنا شوق ہے کہ اب رسول کی زندگی کا بٹوارہ بھی ہونے لگا۔ یاد رکھئے! کسی چیز کی رد کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ معنی سمجھ میں آئیں۔ یہ بات کہ بحیثیتِ رسول جو احکام ہوں ان کی اطاعت فرض ہے اور بحیثیتِ بشر جو احکام ہوں ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ رسول کی زندگی منقسم ہے کہیں تک آپ فقط بشر ہیں اور کہیں سے آپ رسول بھی ہیں۔ تو میں اس کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی رد کا کیا سوال ہے۔ میں کہتا ہوں رسالت سے بہت کم جو درجے ہوں میں اس میں اس کا تصور نہیں کرتا۔ ارے صاحب سب سے کم تر درجہ مسلم کا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ تو اگر کوئی مسلمان ہے۔ تو اس کے ہاں میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کہیں تک وہ فقط آدمی ہو اور کہیں سے مسلمان ہو میں کہتا ہوں مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر شعبہ حیات میں مسلمان ہے۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں ہے جس میں مسلمان نہ ہو۔ یہ دوسرے مذاہب میں ہو سکتا ہے جہاں کچھ وظائف سے مذہب کا تعلق ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ہو سکتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن گرجا چلے گئے تو بس معلوم ہوا کہ عیسائی ہیں اور اس کے بعد چھ دن ڈاکٹر ہیں وکیل ہیں۔ جو کچھ اور ہیں وہ ہیں۔ اس میں عیسائیت کا دخل نہیں ہے۔ لیکن اسلام ایسا نہیں ہے۔ یعنی میں مختصر جملہ اس کے لئے یہ کہوں گا کہ

اسلام میں دین جزوِ حیات نہیں ہے کُلِ حیات ہے۔ جو کوئی مسلمان ہے وہ منزلی زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ محلّے کی زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ باہر کی زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ ہر معیار سے مسلمان ہے۔ ڈاکٹر ہو وکیل ہو تاجر ہو کچھ بھی ہو جو بھی ہو اسمیں سوال یہ ہے کہ مسلمان ڈاکٹر ہے یا نہیں۔ مسلمان وکیل ہے یا نہیں۔ کوئی کہے کہ صاحب ابھی تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ڈاکٹر ہونے میں مسلمان ہونے کا کیا دخل ہے۔ تو عرض کرتا ہوں کہ۔ ایک مریض ایسا آیا کہ جس کی شکایت معمولی ہے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جائے تو نسخہ لکھ دے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ غیر اہم بیماری ہے۔ تو اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت کوئی غیر معمولی فیس مانگنے کا موقع نہیں۔ بس جتنی رسمی فیس ہے وہ مِل جائے تو مِل جائے لیکن اگر کوئی پیچیدہ مرض آ گیا جس کے متعلق اپنی مہارتِ فن سے سمجھ لیا کہ سوا میرے کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مہارت فن کی پوری قیمت وصول کرنے کا موقع ہے۔ سمجھتے ہیں کہ یہی تو شکار مِلا ہے۔ یہ تو پیشے کا تقاضا ہے۔ مگر اسلام کا تقاضا کیا ہے کہ۔ اگر سمجھتے کہ کوئی اور بھی علاج کر سکتا ہے تو علاج کرنا تم پر واجب نہیں تھا، لیکن جب تم نے خود سمجھ لیا کہ اس کی زندگی تمہارے علاج پر موقوف ہے تو اب اس کا علاج تم پر واجب عینی ہے۔ اگر تم مول تول میں لگے رہے اور وہ مر گیا تو تم قاتل نفس قرار پاؤ گے تو اب دیکھا آپ نے کتنا مشکل ہے مسلمان ڈاکٹر ہونا۔ اور مسلمان وکیل۔ جناب اگر مقدمہ ایسا ہے صاف صاف۔ دستاویز کے لحاظ سے حقیقت ثابت ہے تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہر ایک وکیل کرے گا لہٰذا بس جو رسمی فیس ہے وہ لے لو۔ لیکن اب وکیلوں کی زبان میں کہوں گا کہ۔ اگر ایسا مقدمہ آیا جو بالکل بے جان ہے۔ بے جان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل غلط ہے۔ تو اب وکالت کے پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ۔ یہی تو مقدمہ ایسا ہے کہ جس میں

زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے لیکن مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ جب سمجھ لیا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اسی وقت چھوڑ دے کہ ہم کسی جھوٹے مقدمے کی پیروی نہیں کرتے۔ دیکھا آپ نے کہ کون وکیل ہے اور کون مسلمان وکیل ہے۔ اور جناب تاجر۔ اگر آپ فاضلاتِ حیات کے تاجر ہیں یعنی جو چیزیں نظام زندگی کا جز نہیں ہیں۔ فرنیچر بیچتے ہیں۔ سامانِ آرائش بیچتے ہیں۔ یہ چیزیں آج کی تہذیب کے کتنے لوازم میں سے ہوں مگر ضروریاتِ حیات میں سے نہیں ہیں تو اس میں آپ جتنی چاہے نفع اندوزی کر لیجئے۔ کوئی حکومت جتنا چاہے کنٹرول کرے مگر ہمارے نزدیک حکومت کا کنٹرول کوئی شدید پابندی نہ ہوگی اس کی۔ اس لئے مالک کو اختیار ہے اپنی چیز جتنے میں چاہے بیچے ہاں جھوٹ نہ بولے یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدی تھی۔ نہیں یہ کہے کہ میری چیز ہے میں اتنے میں بیچوں گا۔ جتنی زیادہ سے زیادہ چاہے قیمت مقرر کر دے۔ تب تو حق ہے۔ لیکن اگر ضروریاتِ زندگی کا تاجر ہے۔ غلہ کا تاجر ہے۔ غلے سے بقائے حیات ہے۔ اگر غلہ بازار میں فراواں ہے کثرت سے ہے تو پیشہ کہتا ہے کہ یہاں زیادہ نفع اندوزی کی گنجائش نہیں ہے۔ ارے ہم زیادہ مانگیں گے وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ مگر کمی ہے بازار میں۔ قحط کا زمانہ ہے۔ اس نے اپنی ترکیبوں سے سٹاک کافی رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے لوگوں کے پاس وہ نہیں ہے۔ ضروریات کے طلبگاروں کو اس کے پاس آنا لازمی ہے۔ اب یہاں اسلام کہہ رہا ہے المحتکر ملعون۔ جو تین دن تک اضافہ قیمت کی اُمید میں غلہ روکے وہ محلِ لعنت ہے اور اب یہاں ایک پہلو سیرت معصومین کا میرے سامنے آگیا ہے۔ یاد رکھئے احتکار کا مسئلہ تجارت میں ہے وہاں یہ ہے کہ نفع اندوزی کی خاطر اُسے روکو نہیں، لیکن کوئی انسان اپنی ذاتی ضروریات کے لئے آسانی کے لئے زیادہ غلہ رکھے اپنے اہل وعیال

کی سہولت کے لئے تو یہ قانون شریعت سے ممنوع نہیں ہے مگر یاد رکھئے کہ آلِ رسول وہ تھے جو اپنا معیار شریعت کی پابندیوں سے اور بالاتر رکھتے تھے۔ آگے رکھتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادق کے زمانے میں قحط ایسا پڑا۔ قحط کے ایسے آثار نمودار ہوئے کہ لوگ اب نان شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے اور بہت مشکل سے اناج ملے گا۔ حضرت نے اپنے توشہ خانے کے منتظم کو بلا کر دریافت فرمایا کہ ہمارے توشہ خانے میں مہمانوں کے لئے کتنا غلّہ موجود ہے۔ وہ سمجھا کہ حضرت کچھ پریشان ہیں تو اس نے بڑے اطمینان کا سانس لے کر کہا حضور ہمارے پاس تو اتنا ہے کہ یہ فصل ہم آسانی سے کاٹ لے جائیں گے۔ یہ حضرت کے گویا اطمینان دلانے کے لئے کہا۔ آپ نے کہا بس اچھا ہے معلوم ہو گیا۔ کل یہ غلّہ بازار میں لے جانا اور یہ سب فروخت کر دینا۔ اس کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ بالکل گویا اصول معاشیات کے خلاف ہدایات۔ اس نے کہا مولا پھر ہم بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ زحمت میں ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا یہی تو میں چاہتا ہوں کہ اس سب کو فروخت کر دو۔ جس حال میں سب مسلمان ہیں اس حال میں ہم بھی ہو جائیں گے۔ دیکھا آپ نے قرآن اور اس کے ساتھ لفظی تعلیمات کہاں تک پہنچتے ہیں اور قرآن ناطق کا کردار کتنی بلندی پر جاتا ہے۔ صلوٰۃ۔

میں تاجروں کو چھوڑتا نہیں اس کا تصور کر کے کہ بانیانِ مجلس ماشاءاللہ تجار ہیں مگر ایک صاحب نے تحریک بھی کر دی۔ وہ بلا تحریک بھی ہوتا مگر جب ان تک پہنچا ہوں تو اپنے کو کیوں چھوڑ دوں۔ جبکہ بہرحال اس دور میں مولویت بھی ایک پیشہ ہو گیا ہے۔ میں کہتا ہوں مولوی میں بھی یہ سوال ہے کہ کون مولوی ہے اور کون مسلمان مولوی ہے۔ اگر ہمارے سامنے مسئلہ پیش کر دیا۔ دیکھ کر فوراً ہمارا ذہن گیا کہ کون کون بڑے آدمی اس سے خفا ہو جائیں گے۔

کن لوگوں کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ کن لوگوں کے مفادات کو اس سے نقصان پہنچے گا یا وہ محسوس کریں گے نقصان۔ اگر یہ سب تصور میں آگئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مولوی ہیں مگر مسلم مولوی نہیں ہیں۔ اور اگر استغنیٰ ہو اور ہم یہ پیشِ نظر رکھیں کہ رضائے حق کاہے میں ہے اور یہ پیش نظر رکھیں کہ اصل حکم الٰہی کیا ہے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب مسلم ہوں گے۔ اور اب یہ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مسلمان میں یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ کس حد تک وہ فقط آدمی ہے اور کس حد تک وہ مسلمان ہے۔ اب مسلمان کے آگے درجہ ہے ہمارے نزدیک عدالت کا جس کے پیچھے نماز پڑھنے کی شرط ہے۔ ہر مسلمان کے پیچھے ہمارے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ عادل کے پیچھے نماز پڑھنی ہوتی ہے تو عادل کے لئے میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کہیں تک وہ آدمی ہو اور کہیں سے وہ عادل ہو۔ اگر عادل ہے تو گھر میں بھی عادل ہے محلے میں بھی عادل ہے ملک میں بھی عادل ہے اسمیں یہ تفریق نہیں ہو سکتی۔ جب ان چیزوں میں میں یہ تصور نہیں کر سکتا جو کمتر درجہ کی ہیں تو رسالت میں کیونکر تصور کروں کہ کہیں تک یہ فقط بشر ہیں اور کہیں سے رسول ہیں۔ اب ایک اور پہلو کی طرف عقلی حیثیت سے میں توجہ دلاؤں کہ اگر یہ دین وہ ہوتا کہ جو دین دنیا کے شعبوں سے الگ ہو تو اس کے پیغمبر میں بھی یہ تفریق ہو سکتی لیکن جب یہ دین وہ ہے جس سے کوئی شعبۂ حیات باہر نہیں تو پیغمبر خدا میں یہ تفریق کیونکر ہو سکتی ہے کہ آپ کہیں پر بشر ہوں اور کہیں پر سے رسول ہوں۔ اب ایک پوری سیرت کی کتاب میں سمیٹ کر چند لفظوں میں بیان کروں۔ خالق نے اس سب کو سمیٹ کر ایک سند دی۔ انک لعلیٰ خلق عظیم۔ اے پیغمبر آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں یہ خدائے اکبر و خدائے اعظم دنیا کے سیرت میں ان کے کردار کو عظیم کہہ رہا ہے۔ تو آپ خلق عظیم کے درجہ پر فائز ہیں کسی شعبۂ

حیات میں ان کی سیرت کو اس نے مستثنےٰ نہیں کیا۔ تو اب اس کو میں پھیلاکر چند لفظوں میں بیان کروں۔ پھیلاؤں گا ایسا کہ ساری زندگی پر حاوی۔ مگر اختصار ایسا ہوگا کہ چند لفظوں میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جو خالق نے کہا کہ آپ یقیناً خلق عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اولاد کے لئے آپ سے بہتر باپ بھی کوئی نہیں ہے۔ اپنی شریکِ حیات کے لئے آپ سے بہتر شوہر بھی کوئی نہیں ہے۔ اپنے پڑوسیوں کے لئے آپ سے بہتر پڑوسی بھی کوئی نہیں ہے۔ اپنے محکوموں کے لئے آپ سے بہتر حاکم بھی کوئی نہیں ہے اور اپنے خدا کا آپ سے بہتر بندہ بھی کوئی نہیں ہے۔ اب اور ایک اس دعوے کے کھوکھلے پن کو بہت سادہ لفظوں میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ کہ احکام تو ہم آپ کی زبان سے سب سنتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ کچھ احکام بحیثیت بشر ہوتے ہیں کچھ احکام بحیثیت رسول۔ تو ان کے ساتھ ساتھ کوئی رسول ہونا چاہیئے جو بتاتا رہے کہ کون حکم بطور بشریت اور کون حکم بطور رسالت ہے۔ تو پھر آپ کی زندگی رہنما ہی نہیں ہوگی۔ پھر حکم کو ٹالا جاسکے گا یہ کہہ کر کہ یہ بشریت کا تقاضا تھا دیکھئے مخالفتوں کو نبھانے کے لئے کتنے چور دروازے اختیار کئے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ وہ مگر جو تھا وہ مردہ مگر تھا کوئی۔ اس مگر میں کوئی زندگی نہیں تھی۔ تو جس طرح اللہ کی اطاعت غیر مشروط اسی طرح رسول کی اطاعت غیر مشروط۔ اب بغیر دوسرا اطیعوا لائے ہوئے اسی پہلے اطیعوا کے تحت بلافصل رسول کے ساتھ اولی الامر ہے۔ اب یہاں اولی الامر میں۔ بس ایک لفظ میں لوگ اُلجھتے ہیں اولی الامر۔ یہ اولی جمع ہے ذی کی۔ ذی کے معنی صاحب کے ہوتے ہیں ذی علم یعنی صاحبِ علم تو اولی الامر یعنی صاحبان امر۔ یہ معنی ہوئے اولی الامر کے۔ تو اب کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ کون لوگ برسرِ امر ہیں۔ اور امر نافذ کر رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ صاحب خانہ۔ صاحبِ خانہ وہی صاحب کی لفظ ہے۔

صاحبِ خانہ وہ ہوتا ہے جو مالکِ خانہ ہو یا وہ ہوتا ہے جو غاصبِ خانہ ہو۔ انگریزوں کے زمانے میں ہمارے ملک میں قانون تھا اور غالباً اب بھی ہے کہ بارہ برس کے قبضے میں ڈگری مِل جاتی تھی وہ مالک مان لیا جاتا تھا مگر جو نظامِ الٰہی ہے وہ ہی نظامِ مصطفےٰ ہے۔ تو اس نظامِ الٰہی میں بارہ برس کیا چودہ سو برس گزر جائیں ناجائز قبضے کو تو حقِ ملکیت نہیں ملتا۔ اسی لئے اولی الامر کے معنی ہیں حقدارانِ امر۔ یہ نہ دیکھئے کہ کون حکم چلا رہا ہے یہ دیکھئے کہ حکم چلانا کس کا حق ہے۔ جس کا حق ہو وہ ہے اولی الامر' دوسری لفظ جس سے لوگ الجھتے ہیں۔ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ لفظ منکم کی ہے۔ کہ اولی الامر جو تمہی میں سے ہیں۔ تو خیال کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہیں تو ہمارے بھائی بند ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ منکم تو یہاں سے مخصوص نہیں ہے رسول کو بھی کہا گیا ہے بعث فیھم رسولاً منھم۔ اس نے اُمیین میں رسول بھیجا انہی میں سے۔ تو رسول کو بھی کہا گیا منھم۔ اولی الامر کو بھی کہا گیا منکم۔ تمہی میں سے۔ تو رسول بھی انہی میں سے تھا۔ مگر ان کا مقرر کیا ہوا نہ تھا۔ ویسے ہی بالکل۔ اولی الامر بھی تم ہی میں سے ہیں۔ مگر تمہارے مقرر کئے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ہم نے اولی الامر کے جو معنی ہیں اسی کے مطابق اپنا محاورہ قرار دیا ہے۔ اولی الامر کے معنی میں نے کیا کہے تھے۔ صاحبانِ امر۔ ہم ہر دَور کے اس فرد کو صاحب الامر کہتے ہیں صلوٰۃ۔

اب جناب والا میں نے یہ سوال شروع میں اٹھایا تھا کہ یا ایک اطیعوا ہوتا اور تینوں کی اطاعت کا حکم ہو جاتا ایک لفظ سے۔ اور یا تین کی اطاعت کرانا تھی تو تین لفظیں ہوتیں۔ مگر قرآن مجید نے نہ وہ طریقہ اختیار کیا نہ یہ طریقہ اختیار کیا۔ اللہ کو تو اکیلے کہا اطیعوا کے ساتھ۔ یعنی اس معنی میں جو اللہ کی اطاعت ہے کوئی شریک نہیں ہے اور اس کے بعد اب ایک اطیعوا میں رسول اور اولی الامر۔ جس طرح رسول کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام۔ اسی طرح

اولی الامر کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام۔ اس لئے دنیا کو بڑی دشواری پیش آئی۔ اس عہدہ کا نام رکھنے میں۔ وہ دشواری تاریخ میں درج ہے کہ وہاں امامت کا تصور نہیں کیا گیا اس کے بعد نظام خلافت چلا۔ تو اب خلیفہ کے معنی جانشین۔ تو اب کس کا جانشین۔ رسول کا۔ تو حضور وہ پہلی دفعہ تو بات نبھ گئی۔ اب ایک اضافت دے دی کہ خلیفہ رسول اللہ۔ رسول خدا کا جانشین۔ اب ایک کڑی جب تک رہی تب تک تو آسان رہا۔ اب دوسری کڑی بیچ میں آئی اس کے بعد وہ یقیناً دوررس آدمی تھے۔ ان کے ذہن میں بھی دشواری آئی۔ پہلے دن ہی سوچ لیا ہوتا۔ مگر جب اپنی نوبت آئی تو دشواری پیدا ہوئی۔ کہ وہ تو رسول اللہ کے جانشین۔ اب دوسرا کیا ہوگا۔ رسول اللہ کے جانشین کا جانشین۔ ایک کا کے بعد ایک اور کا۔ اب خیر دوسری منزل میں نبھا لیا جاتا۔ مگر وہ سلسلہ بھی تو رہیگا۔ لہٰذا اب اس کے بعد کیا ہوگا۔ اب جتنے آدمی ہوں لسنے کا۔ دن بھر کا۔ کا۔ کہیئے اور آخر میں جانشین کہہ دیجیئے۔ تو یہ دشواری محسوس ہوئی۔ اب مجلس شوریٰ مرتب ہوئی۔ ایسی ہی مشکلات میں مجلس شوریٰ مرتب ہوتی ہے۔ مگر اب یہ معاملہ ایسا تھا کہ اُس شخص کو اِس محفل میں نہیں بلایا گیا۔ جس سے سمجھتے تھے کہ بنیادی اختلاف ہے ورنہ ہر مجلس شوریٰ میں اہم معاملات میں اُس سے رائے لی جاتی تھی۔ اس میں بھی بلاتے۔ مگر یہاں کوئی زحمت نہیں بتلاتی کہ بلایا۔ اور بھائی بند جو تھے جو اس نظام کو مان رہے تھے ان کو بلایا اور کہا کہ بھئی یہ مشکل ہوئی کہ وہ تو رسول اللہ کے خلیفہ۔ اب میں آیا۔ تو میں کیا کہا جاؤں رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب اس کے بعد جو آئے۔ اسے کیا کہا جائے۔ تین دفعہ کا آئے تب جاکر اس کا نام لیا جائے۔ تو کسی آدمی نے رائے دی کہ صاحب اس جھگڑے ہی میں نہ پڑیئے۔ بلکہ ہم مومنین ہیں آپ ہمارے امیر ہیں۔ اتنی مصیبت کے بعد بھی لقب آیا بھی تو غیر کا جو مل چکا تھا بارگاہِ رسالت سے کسی کو۔

بہرحال اس مشکل سے نجات مل گئی۔ لیکن ہماری نظر میں کوئی مشکل نہیں۔ ارے ہمارے ہاں اتنے درجوں نہ سہی۔ بارہ تو ہیں ہی۔ الحمدللہ اب ان بارہ میں ہمیں کوئی دشواری نہیں کر بارہ دفعہ کا۔ کا۔ کہیں۔ تب جاکر عہدہ کا پتہ چلے۔ ہمیں یہ دشواری نہیں کیونکہ یہ تو شخصیت کی طرف نسبت رکھی۔ رسول کی طرف۔ اس لئے یہ دشواری پیش آئی۔ اور ہمارے اصول کے ماتحت علی بھی خلیفۃ اللہ۔ حسن بھی خلیفۃ اللہ حسین بھی خلیفۃ اللہ۔ جتنے ہیں سب خلیفۃ اللہ۔ صلوٰۃ۔

اب وہ بات اس کے ساتھ آگئی کہ اللہ کے نام کے ساتھ تو اکیلی ایک لفظ اطیعوا کی آئی اس لئے کہ ذاتاً حق حکومت اسی کا۔ اس کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں ہے اور اب اس کے بعد رسول اور اولی الامر۔ سب کی نوعیت ایک۔ یعنی وہ بھی نائب حاکم یہ بھی اپنے دور میں نائب حاکم۔ نائب خدا ہونے کی حیثیت ان سب میں مشترک ہے اور یاد رکھتے یہی فرق ہے ہمارے آئمہ نائب خدا ہیں اور علماء نائب امام کہلاتے ہیں نائب خدا نہیں کہلاتے۔ تو اب حدود میں کوئی فرق ہو سکتا ہے؟ جس دائرے میں خدا کی اطاعت اسی دائرے میں رسول کی اطاعت۔ اسی دائرے میں اولی الامر میں سے ہر فرد کی اپنے اپنے دور میں اطاعت۔ اور وہ یکے بعد دیگرے اطاعتیں ہوں گی جتنے ورق الٹتے جائیں گے اتنی ہستیاں سامنے آتی جائیں گی اور ہر امام اپنے دور کا صاحب الامر۔ رسول سب سے پہلے اپنے دور میں صاحب الامر تھے ان کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب صاحب الامر تھے اور اسی طرح وہ پورا سلسلہ اولی الامر کا ہے جو سب پر حاوی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سب کی اطاعتیں رسول کی اطاعت سے جدا نہیں ہیں۔ اب اللہ کے ساتھ رسول کی اطاعت اور وہ بھی غیر مشروط۔ اور یہ بھی غیر مشروط۔ میں نے کہا عقلی طور سے یہ نہیں ہو

سکتا جب تک یہ نہ مانا جائے کہ ان کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا ورنہ اگر
احکام میں ٹکراؤ ہو جائے تو اس موقع پر آدمی یا اُس کی اطاعت کرے یا ان کی
اطاعت کرے اور وہ مطلق کہہ رہا ہے کہ میری اطاعت کرو وہ مطلق کہہ رہا
ہے کہ ان کی اطاعت کرو تو اس کا مطلب یہ کہ جو میرا حکم وہی ان کا حکم۔ ان
کا حکم کبھی میرے حکم سے الگ نہیں ہوگا اور اب اگر ایک ذات تک بات رہتی
تو اس کے لئے یہ بات ہوتی اور اگر اس کے ساتھ ایک سلسلہ ہے جو اولی الامر کا ہے
تو ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔ یاد رکھئے
اسی کو ہماری زبان میں معصوم کہتے ہیں۔ کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا
اس کے معنی یہ ہیں کہ زبانیں چودہ کی ہیں، لیکن بات ایک ہے۔ جو ان کی زبان
سے بات سُنی گئی وہ ایسی ہے جیسے اللہ کی زبان سے بات سنی جائے چودہ کی
زبانیں ہیں مگر حاکم ایک ہے اور قرآن مجید میں رسول کے اتباع کا بھی حکم ہے
کہ ان کی پیروی کرو اور اتباع کے معنی نقش قدم پر چلنا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ
جب مطلق طور پر اطاعت کا حکم دیا تو رسول کے اقوال کی صحت کی ضمانت
اور جب اتباع کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اعمال کی صحت کی ضمانت ہوئی
چونکہ ہماری اُردو زبان ذرا کوتاہ ہے تو ہم اطاعت کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی
اور اتباع کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی مگر عربی زبان کے لحاظ سے اتباع
اور اطاعت کے معنی میں فرق ہے اطاعت ہوتی ہے احکام کی اور اتباع
ہوتا ہے اعمال کا۔ تو جب خالق نے کہا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔ اللہ کی اطاعت
کرو اور رسول کی اطاعت کرو تو اس کے معنی ہیں رسول کے احکام کی صحت کی
ضمانت ہوئی اور جب کہا قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ
کہیئے کہ اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ تو اس کے معنی ہیں کہ

ان کے افعال کی صحت کی ضمانت دی۔ اور اسی لئے ان کے قول کو اپنا قول قرار دیا۔ وما ینطق عن الھوا ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ ہمارا رسول خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا یہ تو وہی کہتا ہے جو اس پر وحی ہوتی ہے۔ ان کے کام کو بھی اپنا کام قرار دیا ارشاد ہوا وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ وہ سنگریزے آپ نے نہیں پھینکے اللہ نے پھینکے۔ اور ہاتھ جو کام کا ذریعہ ہوتا ہے اُسے بھی اپنا ہاتھ قرار دیا ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔ یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں۔ یہ آپ سے بیعت نہیں کر رہے یہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اُوپر ہے۔ اب میں ہر نقطۂ نگاہ کے مسلمان کو دعوت فکر و تظر دیتا ہوں۔ ذرا غور کیجیے۔ سب قرآن کی آیتیں میں نے پڑھی ہیں۔ کہ جس کا قول اللہ کا قول جس کا عمل اللہ کا عمل ہو جس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو اگر معاذ اللہ اس سے غلطی ہو تو کس کی غلطی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے رسول کے معصوم ہونے کا سوال نہیں بلکہ بندوں کے سامنے اللہ کے بے خطا ہونے کا سوال ہے۔ اور اگر خالق نے ان کے نام کے ساتھ ایک اور افراد کا سلسلہ بیان کیا۔ اولی الامر منکم، تو پھر ماننا پڑے گا کہ کچھ ہستیاں اور ایسی ہیں کہ جن کے احکام کبھی احکام الٰہی سے نہیں ٹکراتے۔ جب ہی تو مطلق طور پر ان کی اطاعت کا حکم دیا۔ اب اللہ کے احکام معلوم ہونے کا ذریعہ کتاب الٰہی۔ اور رسول کے احکام اور اولی الامر کے احکام، اگر یہ سب کتاب الٰہی میں درج ہوتے تو اللہ الگ سے ان کا نام ہی کیوں لیتا۔ میں کہتا ہوں کہ جس وقت خالق نے حکم دیا۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی۔ تو جسے بعد میں نعرہ لگانا تھا وہ اسی وقت کہہ دیتا۔ تیرا حکم کافی ہے۔

معلوم ہوا کہ احکام الٰہی کچھ خود اس کے کلام میں ہیں۔ اس کے لئے اطیعوا اللّٰہ کافی تھا۔ لیکن اس کے احکامات کچھ رسول کے ارشادات میں ہیں۔ اسی کے احکام کچھ ہر دور کے اولی الامر کے ارشادات میں ہیں۔ لہٰذا ان سب کو جب تک نہ مانئے اس وقت تک دین کامل نہیں ہو سکتا۔ اور اب ایک آیت آپکو یاد دلاؤں جس کے معنی سمجھنے میں دنیا کو اختلاف ہوتا ہے۔ شک ہوتا ہے بہت اُلجھتی ہے کہ رسول نے عمر بھر تبلیغ فرمائی اور کیسی زحمتیں اُٹھائیں۔ ما اوذی نبی کما اوذیت۔ کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں پہنچیں جتنی مجھ کو پہنچائی گئیں۔ عمر بھر تبلیغ فرمائی۔ اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب آخر میں کوئی ایک بات آتی ہے۔ کیا ہے وہ بات۔ اس سے بحث نہیں۔ کچھ تو ہے کہ کہا گیا۔ اس کو پہنچا دیجئے نہیں تو۔ اگر یہ نہیں پہنچایا گیا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ میں کہتا ہوں جس نے اتنی زحمتیں اٹھائیں ہوں تبلیغ رسالت میں اور اب اس کے آخری حصّہ عمر میں۔ جب تین مہینے کے بعد وہ اس دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ اب ایک امر پر انحصار قرار دیا جائے کہ یہ بات پہنچا دیجئے۔ ورنہ کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ تو اسی سے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں بضرورت تفسیر قرآن ہی ڈھونڈنا چاہیئے کہ وہ کون بات ہے۔ مگر یہ قرآن کی کوئی خدمت نہیں ہے کہ کترا جائیے۔ آخر کون بات ہے کہ جس کی وجہ سے کہا گیا کہ اگر یہ آپ نے نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا اب میں عقلی طور سے اس کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کہ یاد رکھیے ان کی عمر بحیثیتِ بشر۔ اب یہاں بشر میں خود سے کہتا ہوں۔ یقیناً رسول کے ساتھ بشر بھی تھے۔ اس کا انکار انکارِ قرآن۔ تو بحیثیت بشر رسول کی عمر کل جمع تریسٹھ برس جس میں چالیس برس قبل بعثت اور کل جمع تیئس برس بعد بعثت۔ اور آپ کی رسالت۔ رسالت کی عمر کیا ہے۔ تا قیامت۔ میں کہتا ہوں تا قیامت

کہنا ہی ہمارے حدودِ تعبیر کی کوتاہی ہے اگر قیامت تک ہی رسالت ہے تو شفاعت کس اعتبار سے۔ صلوٰۃ۔

تو لا محدود رسالت یعنی جب تک خدا کی خدائی تب تک ان کی رسالت۔ مگر ہمیں اطاعت کرنی ہے قیامت تک۔ کیونکہ اس کے بعد دارِ تکلیف نہیں ہے۔ اس کے بعد جزا و سزا کی منزل ہے۔ تو ہمیں اطاعت کی پابندی قیامت تک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی طرف سے یہ قیامت تک کی عملی رہبری کی ذمہ داری لے کر آئے ہیں۔ تو اب ایک عام بات ہے کہ کسی کے ذمہ دس برس کا کام ہو اور پانچ برس کرے تو کچھ تو کیا۔ کسی کے ذمہ دس برس کا کام ہو وہ ایک سال کرے تو کچھ تو کیا۔ دسواں حصہ کیا۔ اور اگر دس برس کا کام کسی کے ذمہ ہے اور وہ ایک منٹ کرے تو کیا کیا۔ یعنی مقامِ قلت میں درجہ نسبت کا ایسا آتا ہے جو حکمِ عدم میں ہے تو اب میں کہتا ہوں کہ رسول کی رسالت وقتِ وفات تک۔ آپ کی کارگزاری تیئس برس اور عمرِ رسالت تا قیامت۔ کوئی حساب داں مجھے بتائے کہ تیئس برس کی نسبت عمرِ دنیا سے جو قیامت تک ہے کتنی ہے جو تہائی ہے دسواں حصہ ہے کوئی ہے نسبت۔ کوئی بھی تو نسبت نہیں ہے۔ تو یہی خالق نے کہا ہے کہ اے رسول آپ نے زندگی بھر تو زحمت اُٹھائی اور تبلیغ رسالت فرمائی لیکن اب اپنے بعد کا انتظام کر جائیے اور اگر یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ کم سے کم اس وقت پہلی کڑی جو ہے اس کا اعلان عام آپ کر دیجئے۔ ہر دنیا سے جانے والا اپنے بعد آنے والے کا تعارف کراتا رہے گا۔ اور یوں اور حدیثوں میں تو حضرت نے نام بنام بتا دیا قیامت تک کے لئے۔ لیکن اس وقت پہلی کڑی کا تعارف ہو جائے تو کام قیامت تک چلتا رہے گا بس یہ نہ کیا تو کچھ بھی نہ کیا۔ اب ہر نقطۂ نظر کا مسلمان میرے ایک جملے پر غور کرے

کہ جس چیز کی تبلیغ کے بغیر خالق کہے کہ آپ کی رسالت کچھ نہیں اس کو ماننے بغیر ہمارا ایمان کیا رہے گا۔ اور پھر رسول نے متفق علیہ حدیث میں پورے سلسلے کا ایک مجمل تعارف بھی کرایا۔ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ماان تمسکتم بھالن تضلوا بعدی۔

میں تم میں یہ دو گراں قدر چیزیں چھوڑتا ہوں ایک اللہ کی کتاب دوسرے میرے اہلبیت۔ جب تک ان سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ دونوں کون۔ قرآن اور اہلبیت۔ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ روز قیامت حوض کوثر پر پہنچیں۔ بس اب میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ رسول نے فرمایا۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے۔ اب کسی بھی نقطۂ نظر کا مسلمان ہو وہ بتائے کہ آج قرآن ہے تو کون ہے جو کہے نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں وہ جسے رسول نے کہا تھا۔ کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ ان میں کی کوئی فرد ہے۔ اگر کہہ دیا کہ نہیں ہے تو جدا ہو گئے۔ تو ہمارے آپ کے رسول نے کہا تھا کہ جدا نہیں ہوں گے اور اب ایک جملہ کہوں کہ یہ وہ رسول ہے جسے مشرک بھی صادق کہتے تھے اب مسلمان ہو کر آپ کو اختیار ہے صلوٰۃ۔

اور اگر کہے کہ ہے۔ اور رسول کی سچائی کی بنا پر کہنا پڑے گا کہ ہے تو مجھے آنکھوں سے دکھا دیجئے کہ کہاں ہے اور اگر آنکھوں سے نہ دکھا سکئے تو غائب مانیے کیونکہ غائب وہ نہیں ہے جو ہو ہی نہیں۔ غائب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ غیب کی حقیقت ایک ثبوت اور ایک نفی سے مرکب ہے۔ ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ تو ہونا نص رسول صادق سے ثابت۔ سامنے نہ ہونا آنکھوں سے ثابت۔ اب غیب کا کونسا جز محتاج ثبوت رہا۔ دنیا کہتی ہے کہ آخر غائب ہوئے ہی کیوں۔ میں کہتا ہوں اسے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ گیارہ

کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا جواب پوچھ رہے ہیں کہ بارھویں کو غائب کیوں کیا۔ گیارہ آپ کے سامنے رہے لیکن کوئی بھی تو اپنی موت دنیا سے نہ گیا۔ آپ نے کوشش کی کردہ سلسلہ رہے ہی نہیں اور بس۔ کیا کربلا میں کوئی کمی رہ گئی تھی اس سلسلے کو قطع کرنے کی۔ اس سلسلے کو قطع کرنے کی کوئی کسر دنیا نے اٹھا رکھی ؟ وہ تو سید سجاد پر خالق نے غشی کو طاری کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ غشی نہیں تھی ایک پردہ غیب تھا جو انکی حفاظت کے لیئے ان پر ڈالا گیا ورنہ یہ غش میں نہ ہوں اور پھر حسین کی مدد نہ کریں۔ تو ان کا کردار علی اکبر کے کردار سے پیچھے رہ جائے گا۔ لہٰذا خالق نے غش کو ان پر طاری کیا اپنی حکمت بلند کی بناء پر ورنہ میرا ایمان ہے کہ مرض ان کو کبھی بے ہوش نہیں کر سکتا۔ نہ مرض ہوش و حواس سلب کر سکتا ہے نہ مرض بے ہوش کر سکتا ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی تھی بقائے امامت کے لیئے۔ بس ارباب عزا بس۔ چند موقعے ایسے ہیں جہاں غش سے افاقہ ہوا۔ پہلا موقع وہ ہے جب ان کا غلام، غلام ترکی مولا کے پاس آیا کہ اب مجھے اجازت دیجیئے۔ یہ غلام آپ نے سید سجاد کی طرف منسوب کر دیا تھا اس لیئے فرمایا تم مجھ سے کیوں اجازت مانگتے ہو اپنے آقا سے اجازت مانگو۔ وہ دروازہ پر آتا ہے بی بیاں جانتی ہیں کہ سید سجاد غش میں ہیں۔ کوئی اہم بات ہے جو آیا ہے۔ موقع دیتی ہیں غلام آتا ہے ہوش میں لاتا ہے کہتا ہے مولا اجازت دیجیئے کہ جا کر آپ کے باپ کی نصرت میں کروں۔ بس دیکھئے عجیب کلمۂ حسرت۔ کہ اچھا بابا پر یہ وقت پڑ گیا کہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اور اب ایک اور کلمۂ حسرت فرماتے ہیں۔ کہ ہم اگر اس لائق ہوتے تو باپ کی مدد کرتے مگر ہم تو اس عالم میں ہیں۔ تم جاؤ میری طرف سے میرے بابا کی مدد کرو۔ جو کہہ رہا ہوں اس پر غور کیجیئے۔ امام حسین نے اس کو خیمے میں بھیج کر کتنی بلندی عطا کر دی جب خیمے میں داخل ہوا ہے تو غلام تھا اب جو جا رہا ہے تو حقیقی

منزل میں نائب امام ہو کر جا رہا ہے۔ اتنی عزت افزائی ہیبت تھی۔ کہا میرے سامنے سے خیمے کا گوشہ ہٹا دیا جائے کہ میں اپنے غلام کی جنگ دیکھوں بس ادھر غلام گھوڑے سے گرا ادھر یہ غش میں گر گئے۔ اب وقت سخت سے سخت ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری منزل عرض کروں کہ جب مولا نے صدا بلند کی ھل من ناصر ینصرنا۔ کوئی ہے جو میری مدد کرے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا نے کئی دفعہ استغاثہ کیا ہے۔ اور ہر استغاثے کا ایک خاص اثر ہوا ہے۔ یہ استغاثہ جو کیا ہے تو خود مولا سمجھتے تھے کہ اس کا اثر کیا ہوگا اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ استغاثہ میدان میں تھا اور نگاہ در خیمہ پر تھی۔ اس استغاثے کی خاصیت یہ تھی کہ آواز سید سجاد کے کان میں گئی آنکھ کھولی کہا پھوپھی بابا فریاد کر رہے ہیں ظاہر ہے جناب زینبؑ بولنے لگیں کہ ہاں آواز تو انہی کی ہے۔ کہا تو پھوپھی میری تلوار لا دیجئے یہ حکم امام ہے اگرچہ پھوپھی ہیں لا کر دے دیتی ہیں تلوار۔ اب مولا وہاں سے دیکھتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں زینب سید سجاد کو آنے نہ دینا میں کہتا ہوں کہ اب امام وقت کے حکم نے ان کے ہاتھوں میں طاقت پیدا کی کہ لے جا کر پھر بستر پر ڈال دیا پھر غش آ گیا۔ اب تیسرا وقت کونسا ہے۔ جب مولا رخصت آخر کے لئے آئے ہیں۔ سب سے رخصت ہوتے فرماتے ہیں کہ زین العابدین کا کیا حال ہے فرماتی ہیں کیا پوچھتے ہیں دن بھر غش میں رہے ہیں۔ تشریف لائے بیٹے نے آنکھ کھولی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا چاہا مولا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا نہیں نہیں۔ اس وقت اٹھو نہیں بس جو میں کہتا ہوں وہ سن لو۔ پورے قافلے کی ذمہ داری تم پر ہے اب میں جا رہا ہوں اس کے بعد یہ الفاظ روایتوں میں آئے ہیں۔ اس کی حقیقت ہم کہاں سمجھ سکتے ہیں کہ اسرار امامت تعلیم فرمائے اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔ بس ارباب عزا۔ مجلس ختم۔ اب کب ہوش آیا آندھیاں سیاہ چل چکیں۔

ہوش نہیں آیا۔ مناوی نے ندا کی ہوش نہیں آیا۔ خیموں میں آگ لگی ہوش نہیں آیا۔ اب کب ہوش آیا جب پھوپھی سرہانے کھڑی ہیں کہا اے بیٹا خیموں میں آگ لگی ہے اب تم امام وقت ہو بتاؤ جل کر مر جائیں یا خیموں سے باہر نکلیں۔ اب سید سجاد فرماتے ہیں۔ بس اب حکم خدا یہی ہے کہ خیموں سے باہر نکلئے۔ ارباب عزا۔ اب وہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اٹھا تھا وہ روز روشن میں شہر بہ شہر۔

مجلس دوازدہم

اسلامی معاشرت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ

ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ نے خرید لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو۔ اس کے عوض میں ان کے لئے جنت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں۔ اور یہ اللہ پر لازمی طور پر وعدہ ہے۔ توریت، انجیل اور قرآن سب کتابوں میں اور اللہ سے زیادہ وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے۔ صلوٰۃ۔

اعلان ہوا ہے خریداری کا۔ کاہے کی خریداری۔ نفوس اور اموال کی خریداری۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال کو بھی ذلیل نگاہ سے نہیں دیکھنے کے۔ جس طرح جان کا خریدار وہ ہے۔ اسی طرح مال کا خریدار بھی وہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ جان بھی اس قابل ہو کہ وہ خریداری کر سکے۔ صلوٰۃ۔

کوئی ظاہردار اس دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے جو کہے کہ ارے مجھے تو مال کی ضرورت نہیں پیسے کی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کہنا کہ صدقِ دل سے بھی ہو۔ یعنی ملتا ہو اور پھر کہے کہ ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر ایک بات ہے۔ اور جب نہیں ہے

اور کہہ دیا کہ ضرورت نہیں ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بیکن بہرحال اگر سچائی کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ مال کی ضرورت نہیں ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے کہ مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خالق کی زندگی میں مثالی زندگی انسان کی یہ ہوتی کہ مال اس کے پاس ہو ہی نہیں تو ہر جگہ قرآن مجید میں یقیمون الصلوٰۃ کے ساتھ یؤتون الزکوٰۃ نہ ہوتا حالانکہ ہم قرآن مجید میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں جہاں جس جس انداز میں صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ زیادہ تر اسی انداز میں زکوٰۃ۔ اگر مدح کے طور پر ہے کہ اقاموا الصلوٰۃ تو اسی کے ساتھ ہے اٰتوا الزکوٰۃ۔ اگر المقیمون الصلوٰۃ ہے اس کے ساتھ ہے موتون الزکوٰۃ ہے۔

تو جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اب خیر ماشاءاللہ۔ یہاں کے بارے میں تو خیر معلوم نہیں مگر ہندوستان میں تو بالکل اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ نماز تو ہر آدمی پر واجب ہے لیکن زکوٰۃ جن پر واجب ہے ان کو میں پوری مردم شماری کے لحاظ سے تناسب قائم کروں تو ممکن ہے فی صدی میں کوئی نہ نکال سکوں۔ فی ہزار نکالوں۔ تو اگر معاشرہ ایسا ہوا کہ فی ہزار میں ایک پر۔ اس کے پاس اتنا ہوا کہ اس کے لئے شرائط عائد ہوں تو بلاغت قرآن کے خلاف ہے کہ ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا نام لے۔ اگر سو جگہ فرض کیجئے صلوٰۃ کا ذکر ہوتا تو دو ایک جگہ زکوٰۃ کا ذکر ہو جاتا کیونکہ یہ ہر ایک کی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ شاذونادر کوئی ہو کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ تو ان کے لئے دو ایک جگہ حکم آجاتا۔ لیکن یہ کہ ہر جگہ جہاں صلوٰۃ کا ذکر وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی نظر میں یعنی اسلام جس معاشرہ کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا وہ کوئی قلاش معاشرہ نہیں تھا وہ کوئی مفلوک الحال معاشرہ نہیں تھا۔ وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں ہر شخص پر جسطرح صلوٰۃ واجب ہے اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے۔ یہاں تک کہ جن کی ہستی ہمارے یہاں بہت

بڑی مثال ہے۔ ترک دنیا کی یعنی حضرت امیر المومنینؑ۔ ان کے بارے میں وسائل الشیعہ ایک معتبر حدیث کی کتاب ہے ہماری کتابوں میں۔ اجانسے جو علما کے ہوتے ہیں ان میں۔ جن کتب احادیث کا نام لیا جاتا ہے کہ جن احادیث کی ہم نے روایت کی جسطرح متقدمین کی کتابیں ہیں۔ کافی تہذیب من لا یحضرہ الفقیہ استبصار۔ اسی طرح بعد کے علما کی جو کتابیں ہیں ان میں وسائل الشیعہ بھی ہے۔ تو اس میں یہ حدیث ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے اپنی قوت بازو کی کمائی سے چار سو غلام راہ خدا میں آزاد کئے۔ غلام اور کنیز کی قیمت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی چار سو غلاموں کے لئے زر کثیر کی ضرورت ہے۔ مگر مال یہ کہہ دیا گیا کہ وہ جتنے بھی غلام خرید کئے گئے وہ اپنی ذاتی محنت کے پیسے سے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ مال پیش خدا کتنی قیمت رکھتا ہے۔ اس آیت میں برابر سے دونوں چیزوں کو کہا گیا کہ جان کا بھی وہ خریدار اور مال کا بھی خریدار لیکن اب ایک خاص چیز سوچنے اور سمجھنے کی جو اس آیت میں مجھے محسوس ہوتی ہے کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ خریداری کا درجہ فروخت کے بعد ہے۔ اور فروخت کرنا بندوں کا کام ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہونا چاہیئے تھا کہ تم فروخت کرو۔ جب ہم فروخت کرتے تو وہ ارشاد فرماتا کہ ہم نے خریدا۔ اور اگر پھر وہ حکم دیتا کہ فروخت کرو تو فروخت کرنا نہ کرنا ہمارے اختیار سے وابستہ ہوتا۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ نماز پڑھو۔ کیا سب نماز پڑھتے ہیں۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ روزہ رکھو۔ کیا روزہ سب رکھتے ہیں۔ اس کی طرف کا حکم سب کے لئے ہے کہ ایمان لاؤ کیا سب نے ایمان اختیار کیا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ کیا سب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے احکام اسکی طرف سے ہیں وہ تمام احکام ایسے ہیں کہ کچھ اس کی تعمیل کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے۔ بلکہ تعمیل کرنے والے کم ہوتے ہیں اور تعمیل نہ کرنے والے زیادہ ہوتے

ہیں۔ اور ایسا کیوں ہوا۔ اس لئے کہ اس نے اطاعت جبری نہیں چاہی تھی اگر جبری اطاعت کرانا ہوتی۔ قرآن مجید میں جو کہہ دیا ہے لَوْ شَاءَ اگر وہ چاہتا تو لَاٰمَنَ من فی الارض کلھم جمیعًا۔ جتنے بھی روئے زمین پر ہیں سب ہی ایمان لے آتے۔ تو اگر وہ چاہتا۔ تو کیا وہ چاہتا نہیں ہے۔ چاہتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ ارادۃً ایمان لائیں۔ یہ نہیں چاہتا کہ وہ جبر سے ایمان لائیں۔ ایمان کے راستہ کا دکھانا اس کا کام ہے اور جبری طور سے ایمان کو دل میں ڈال دینا یہ اس کا کام نہیں ہے اور یہ تو بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ علم کلام کا ہے۔ جبر و اختیار پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس وقت تو میں ایک جملہ کہتا ہوں کہ کافر و نافرمان کا وجود خود دلیل اختیار ہے تو اگر وہ جیسے نماز کا حکم دیا روزہ کا حکم دیا اگر اسی طرح یہ حکم دیتا کہ تم فروخت کرو اپنے جان اور مال کو تو پھر قیمت کا اعلان کرتا کہ تم نے اپنے جان و مال فروخت کئے اب میں بتلاتا ہوں کہ اس کی قیمت جنت ہے۔ تب ہمارے جان و مال اس کے قبضہ میں جاتے اور اس کی قیمت وقت آنے پر ہمارے قبضہ میں آتی اور اگر ہم فروخت نہ کرتے تو ہماری جان ہمارے پاس اس کی جنت اس کے پاس۔ ہم جاکر دعویٰ نہ کرتے پھر جنت کا کیونکہ ہم نے وہ معاملہ ہی نہیں کیا جس کی قیمت میں جنت ملتی مگر یہ تو مجھے عجیب بات معلوم ہورہی ہے کہ صاحب ہم سے نہیں کہتا کہ فروخت کرو اور خریداری کا اعلان کئے دیتا ہے کہ جو بعد کی منزل ہے۔ اس کا اعلان کئے دیتا ہے اور جو قبل کی منزل ہے اس کا ذکر ہی نہیں۔ تو اب یہ انوکھی بات ہوگئی کہ اللہ نے خرید لیا۔ مگر اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں۔ تو مسئلہ حل ہوجائے کہ کن سے خریدا۔ یہ تو نہیں کہا کہ لوگوں سے خریدا۔ ناس کی لفظ یہاں نہیں ہے کہ ان اللہ اشتری من الناس۔ کہ اللہ نے خرید لیا آدمیوں سے۔ یہ نہیں کہا ہے۔ کہا یہ ہے ان اللہ اشتری من المومنین۔ اللہ نے خرید لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو

اس بنا پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے اسی وقت ہم نے اپنے جان و مال کو فروخت کر دیا۔ بس ادھر ہم نے اقرار ایمان کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اقرار کر لیا کہ اب ہمارا مال ہمارا نہیں ہے ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ یہ جان بھی اس کی ہے اور یہ مال بھی اس کا ہے اور حقیقت میں جتنی پابندیاں ہیں احکام شریعت کی وہ تمام پابندیاں اب اس بیع کے تقاضے پر ہیں۔ ہم نے اپنی جان کو فروخت کر دیا۔ اب وہ ہم سے مطالبہ رکھتا ہے کہ دن میں اتنے وقت تم میرے اس کام میں صرف کرو جس کا نام نماز ہے۔ اب ہم اس پر عمل نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی جان اور اپنے اوقاتِ حیات پر تصرف غاصبانہ رکھتے ہیں۔ گیارہ مہینے شوق سے کھاؤ اور پیو۔ جو جو کھانے پینے کی چیزیں ہیں لیکن دیکھو ایک مہینے میں اور وہ بھی رات کو نہیں دن کو۔ ہماری طرف سے یہ پابندی ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کرو۔ اب یہاں ظاہر ہے جو چیز کھائی ہم نے وہ مال سے خریدی تو وہ مال بھی ملکِ غیر تھا۔ اب وہ تصرف اس لئے بھی ناجائز ہوا۔ اور پھر اپنی زندگی کے اس وقت میں۔ دن بھر میں۔ ہم نے جو جو کام روزے کے تقاضے کے خلاف کئے اور روزہ نہیں رکھا تو وہی بات ہوئی کہ اس دن میں تصرف غاصبانہ اپنے نفس کے اوپر کیا۔ اور بس اب جتنی بھی چیزیں ہیں حج ہے اور جتنے بھی احکام شرع کے ہیں وہ سب اسی کے تحت میں داخل ہیں۔ اور اسی طرح جو محرمات ہیں۔ جو ناجائز چیزیں ہیں۔ ہمارا اچھے کپڑے پہننا خالق کو ناپسند نہیں ہے۔ وہ کوئی اور دین ہو گا جس میں لُٹا پٹا رہنا یہ تقربِ الٰہی کا معیار ہے۔ یہاں ایک مقدار میں تو لباس جزوِ صحت نماز بن گیا۔ اب نہ جانے مسلمانوں میں بھی کن چور دروازوں سے یہ تصورات داخل ہو گئے کہ برہنہ رہنا دلیل ولایت خدا ہو گا۔ یہاں تو نماز

صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ اتنا لباس نہ ہو کہ جس کے بعد آدمی برہنہ نہ کہلائے یہ تو مرد کے لئے لباس ہے۔ عورت کے لئے لباس وہ تو سوا چہرے اور دونوں ہاتھوں کے تمام جسم جب تک چھپا نہ ہو اس وقت تک اس کی نماز نہیں ہو سکتی۔ تو معلوم ہوا کہ ہمارا لباس پہننا اس کو ناپسند نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہ لباس پہنو تو بہت ہی خراب بوسیدہ ہی پہنو۔ یہ نہیں کہا گیا خذوا زینتکم عند کل مسجد جب نماز کے لئے آؤ تو جو بہتر سے بہتر لباس تمہارے پاس ہو اُسے پہن کر آؤ۔ اسے اگر ہماری پریشاں حالی منظور ہوتی تو عطر لگا کر نماز پڑھنے کا ثواب نہ ہوتا۔ فیشن میں معقولیت کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہوا جو چلتی ہے وہ فیشن بن جاتا ہے۔ تو آجکل بال پریشاں ہونا۔ اور جیسے ہر وقت مصیبت زدہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا یہ گویا ترقی پسندی کی علامت بن گیا اور وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کی جانمازوں میں موجود ہوتا ہے کنگھا۔ تو یہ کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محاسن میں شانہ کرنا۔ بشرطیکہ محاسن کا وجود ہو۔ خیر جتنا بھی جو بھی قابل شانہ ہو۔ کسی بلند مقصد کی خاطر انسان پیوند دار لباس پہنے تو صحیح۔ حضرت امیر المومنینؑ آپ بے شک پیوند دار لباس پہنتے تھے۔ اس کا فلسفہ خود بتایا ہے آپ نے۔ نہج البلاغہ میں یہ ہے کہ آپ کے اصحاب میں عاصم ابن زیاد حارثی۔ انہوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے بھائی نے گھر کے کپڑے جو وہ پہنتا تھا وہ چھوڑ دیئے ہیں۔ گھر میں کھانا جو پکتا ہے وہ نہیں کھاتا اور اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے ہیں اور بالوں کے کپڑے بنوا لئے ہیں وہ پہنتا ہے اور بس رُوکھا سُوکھا کھانا کھا لیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں آؤں گا۔ اُسے سمجھاؤں گا۔ نصیحت کروں گا خوش نہیں ہوئے کہ بڑا اچھا کیا۔ میں آؤں گا اُسے سمجھاؤں گا۔ حضرت تشریف لائے اور بڑے سخت انداز میں فرمایا۔ یہ کیا زندگی اختیار کی ہے۔ کیا تمہارے گھر میں جو غذا پکتی ہے وہ مالِ حرام سے ہوتی ہے۔ کیا تمہارا لباس

مال ناجائز سے ہے پھر یہ کیا کہ یہ سب چھوڑ دیا اور یہ کپڑے پہن رہے ہو اور یہ کھانا کھا رہے ہو۔ یہ کیا زندگی تم نے اختیار کی ہے اور عجیب جملہ ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اللہ نے لذائذ و طیبات کو حلال قرار دیا ہے اور پھر خود ہی ان پر سزا بھی دے گا۔ یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہتے سخت الفاظ میں تھا کہ اس کو تاب مقاومت ہی نہ تھی۔ فوراً کہا سمعاً و طاعاً۔ اب جو آپ ارشاد فرما رہے ہیں اس پر عمل کروں گا جو کھانا کھاتا تھا وہی کھاؤں گا۔ جو کپڑے پہنتا تھا وہی پہنوں گا۔ دیکھئے مقتضائے اطاعت یہی ہے کہ حکم کی تعمیل کیجئے اور اگر پھر سمجھنا بھی ہے اس کی مصلحت تو اس کو سمجھتے رہیئے مگر اطاعت کو سمجھنے پر موقوف نہ رکھئے۔ فوراً اس نے اقرار اطاعت کر لیا اور حضرت رضامند ہو گئے انداز بدل لیا یہ لوگ تھے جنہیں اصحاب آئمہ یا اصحاب رسولؐ کہتے ہیں یہ آخر ان درسگاہوں کے طالب علم بھی تو تھے ملائکہ کی منزل میں بھی طالب علم کو حق ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اُسے پوچھ لے۔ تو اب جب اقرار کر لیا کہ بے شک وہی کپڑے پہنوں گا جو پہلے پہنتا تھا تو اب دبی دبی زبان سے پوچھا کہ حضور میں نے تو خیر اقرار کر لیا مگر یہ حضرت کا لباس تو یہ ہے۔ دیکھئے کتنی بڑی خلش آپ کے ذہن کی بھی اس نے سوال کر کے دُور کر دی۔ یہ جو آپ اپنی روکھی سوکھی غذا اور اس موٹے جھوٹے لباس میں نظر آتے ہیں تو یہ کیا ہے۔ تو پھر حضرت کی تیوریوں پر بل آ گئے اب جو جملہ ارشاد فرماتے ہیں اس کی ابتدا یہ ہے۔ اے شخص میری اور تیری برابری نہیں ہے۔ اب سمجھوں گا بعد کہ حضرت نے کیا معیار فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی جملہ کہ

ہماری تمہاری برابری نہیں ہے۔ یہ عموماً دُنیا کے کسی بھی ملک میں جایئے اور وہاں بڑے بڑے عہدہ داروں سے۔ بڑے بڑے مسند اقتدار پر بیٹھنے والوں سے پوچھئے۔ سرکار والا یہ اتنی کوٹھیاں اور ہمارے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے۔

وہ یہاں کہیں گے کہ تمہاری ہماری برابری نہیں ہے۔ کسی سے کہیئے کہ تمہارے پاس اتنی موٹریں ہیں ہمارے پاس چلنے کے لئے کوئی سواری نہیں ہے وہ کہیں گے ہماری تمہاری کوئی برابری ہے۔ محل استعمال دنیا میں اس جملہ کا یہ ہے۔ مگر امیر المومنینؑ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ ارے جنہیں اقتدار حاصل ہو جائے ان سے اللہ کا عہد و پیمان یہ ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی اپنی رعایا میں سے کمزور ترین سے بھی کم رکھیں۔ اور اب اس سے جو آپ نے اسوقت فلسفہ اپنے انفرادی عمل کا بتایا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ اولاد معصومین اس پر کیوں عمل نہیں کر رہے ہیں حالانکہ وہ سب نورِ واحد سے تھے۔ ایک سلسلے کی کڑی تھے۔ لیکن ہر شخص اس عمل پر امیر المومنینؑ کا کردار کیوں پیش ہوتا ہے۔ اب اسی ارشاد کی روشنی میں میرا دھیان گیا۔ اپنے محدود مطالعہ کی طرف کہ یہ سادگی اور اسطرح کی زندگی کے جتنے واقعات ہیں سب کوفے کے ہیں یعنی اس دور کے نہیں ہیں جب گوشہ نشین تھے۔ یہ زندگی آپکی جو جزو تاریخ بنی ہے یہ اس دور کی ہے جب آپ کرسی اقتدار پر تھے۔ آپکے سامنے روز نمونہ روز مرہ کے۔ آپکی سُنی ہوئی روایتیں جو ہر درجہ کے طالب علم سے۔ آپ نے سُنی ہو نگی کہ وہ ایک سائل آیا مسجد میں اور اس نے سوال کیا اور حضرت نے جو بھوسی بھرا ہوا آٹا جو کا نوش فرما رہے تھے وہی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کہا کہ اے بندۂ خدا۔ یہ تو میرے حلق سے نہیں اترے گا آپنے کہا تو مجھے دیدے۔ میں ہی اسے کھاؤں گا۔ میرے پاس تو یہی ہے اور اگر ابھی غذا کی تلاش ہے تو حسن مجتبےؑ کے دروازہ پر جا۔ وہاں مہمانوں کے لئے غذائے لذیذ موجود ہے۔ تو آپ سنا کرتے ہیں لیکن چونکہ ذکر علی ابن ابی طالب میرے لئے اور آپکے لئے بھی باعثِ ثواب ہے۔ لہٰذا بیان کرتا ہوں کہ وہ گیا اور اس کے لئے کھانا آیا اور ظاہر ہے کہ اس وقت کا جو معیار تھا وہ آپ کے ہاں کی دعوت کا تھوڑی تھا۔ بہر حال حسنؑ کے معیار زندگی کے لحاظ سے وہ پر تکلف کھانا تھا۔ اسکے سامنے دسترخوان بچھا دیا گیا۔ تو پھر اس نے کھایا اس طرح کہ ایک نوالہ کھاتا ہے اور ایک نوالہ بچاتا جاتا ہے

حضرتؑ کی توجہ ہوئی کہا بھائی یہ کیا کر رہے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ اہل و عیال ہیں تو یہاں کوئی ممانعت نہیں ہے لیتے جاؤ ان کیلئے بھی جتنی ضرورت ہو۔ اس نے کہا کہ حضور میں تو کیا آیا ہوں مگر مسجد میں ایک سائل کو دیکھ آیا ہوں۔ ایک محتاج کو دیکھ آیا ہوں کہ میں نے سوال کیا تو سخی تو وہ ایسا کہ جو اس کے پاس تھا اٹھا کر مجھے دے دیا مگر میں نے دیکھا کہ وہ بھوسی بھرا ہوا آٹا ہے جسے میں کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ تو میں یہ اس کیلئے لے جا رہا ہوں۔ اس فقیر کیلئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ فقیر نہیں ہیں وہ تو مالک دین و دنیا ہیں والد بزرگوار علی ابن ابی طالب ہیں۔ صلوٰۃ۔

میں نے عرض کیا کہ ایک ہی وقت میں دونوں نمونے موجود ہیں اور معاذ اللہ اگر یہ ترک اولیٰ بھی ہوتا تو امیر المومنینؑ کے علم و رضا کے ساتھ۔ امام حسنؑ کے ہاں وہ غذائیں کیوں تیار ہوئیں۔ اور آپ سائل کو کیوں بھیجتے۔ دلیل اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ حکم شرعی بحیثیت استحباب کے نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا انفرادی عمل تھا۔ آپکے مؤقف کے لحاظ سے اور اسی لئے یاد رکھئے کہ یہ بھی بڑا نازک مسئلہ ہے کہ کیا کسکا اتباع کرنا چاہیئے۔ کسی ایک معصوم کا نام لے لیا۔ ان کا اتباع کرنا چاہیئے مثلاً کوئی ہنگامہ ہوا کہا کہ امام حسنؑ کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ مگر یاد رکھئے کہ آنکھیں بند کر کے اتباع کرنا بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ چودہ سیرتیں۔ وہ سب محمد تھے۔ اس لئے جس محل پر جس معصوم کی سیرت کا اتباع ضروری ہے۔ اس کیلئے بھی وہ نظر حقیقت شناس ہونی چاہیئے جسکا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ کہ کس محل پر کس کی سیرت پر عمل ضروری ہے کیونکہ سیرتیں سب صحیح ہیں مگر ہر ایک کے محل کے لحاظ سے ہر ایک کے مؤقف کے لحاظ سے کسی ایک کو لے لینا اور ہر جگہ اسی کا حوالہ دے دینا یہ کل کو جزو میں محدود کر دینا ہے۔ غرض یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا اچھا پہننا خدا کو ناپسند نہیں مگر پھر بھی کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ خالص ریشم نہ ہو آرائش کر دو مگر سونا نہ پہنو۔ یعنی مردوں کے لئے۔ عورتوں کیلئے تو حکم نہیں۔ اسی طرح ہمارا اچھا کھانا اسے ناپسند نہیں۔ ہمارے لئے طیبات سب حلال ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو حرام ہی میسر آئے۔

جو حلال غذائیں ہیں اس میں لذیذ سے لذیذ تر غذائیں آپ کو کھانے کا حق ہے اور کوئی الزام
نہیں مکروہ تک نہ ہوگا۔ سوا ان چیزوں کے جن کو کہہ دیا ہے کہ وہ مکروہ ہیں۔ یہ نہیں کہ لذیذ غذا
کھانا مکروہ ہے۔ یہ کسی عالم نے آپ سے نہیں کہا ہوگا۔ تو ہمارا اچھا کھانا اسکو نا پسند نہیں ہے۔
پھر بھی کچھ پابندیاں ہیں اس میں بھی۔ مثلاً گوشت حلال ہے مگر وہ ذبیحہ کا ہو۔ تب تمہارے
لئے جائز ہوگا۔ بغیر اس کے جائز نہیں ہوگا۔ تو یہ سب کیا ہے۔ یہ سب چیزیں اسکی پسندیدہ
ہیں۔ اسکو ناگوار نہیں ہیں یہ سب کیا ہیں۔ صرف اس لئے کہ تمہیں مطلق العنان ہونے کا احساس
نہ ہو جان ہماری ہے مال ہمارا ہے جو چاہیں کھائیں جو چاہیں پیئیں۔ پس ہر وقت بالا دست
اقتدار کا تصور رہے۔ اس طرح اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے وہ مشکل
کام انجام دیا کہ دنیا میں جو ہمیشہ متضاد چیزیں سمجھی گئیں انہیں اکٹھا کر دیا یعنی ہمیشہ جسم و روح دو
مختلف چیزیں سمجھی گئیں۔ ہمیشہ جسمانی ترقی کو سمجھا گیا کہ روحانی ترقی کے خلاف اور روحانی ترقی ہے
تو پھر جسم کے تقاضے محدود نہیں رہیں گے۔ اسی کا ایک رخ ہو گیا کہ دنیا اور دین ایک ساتھ جمع نہیں
ہو سکتے۔ یا دنیا کو لو یا آخرت کو۔ دنیا کو لو یا دین کو لو۔ یہی عام تصور تھا لیکن اسلام نے اپنے حکیمانہ
نظام شریعت کے لحاظ سے اس کو بدلا۔ اس کا تقاضا کیا تھا کہ جب دو چیزیں الگ الگ ہو
گئیں تو کچھ کے ماہر اور ہوتے اور کچھ کے ماہر اور ہوتے اس کے معنی ہوتے کہ علوم دنیا کے
ماہر بالکل الگ ہوں گے اور علوم دین کے ماہر بالکل الگ ہونگے۔ پھر حکومتیں بھی الگ الگ
ہو گئیں۔ دنیاوی حکومت کے سربراہ اور ہوں گے۔ دینی حکومت کے سربراہ اور ہونگے عیسائیت
میں رہبانیت تھی لہٰذا وہاں کا وہ مقولہ بالکل صحیح کہ جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دیتے ہیں
جو پوپ کا حق ہے وہ پوپ کو دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں تو ہر ایک
کے تقاضے الگ الگ ہوئے۔ اسلام نے دین و دنیا کو بالکل سمو کر ایک ایسا مزاج معتدل
پیدا کیا جس کی وجہ سے معیارِ دین بالکل بدل گیا۔ دنیا میں ہر جگہ پیشہ کوئی اور ہے اور مذہب
کوئی اور یعنی ایک عیسائی چھ دن تک فقط ڈاکٹر ہے ساتویں دن وہ گرجا جائیگا تو معلوم ہوگا

کہ یہ عیسائی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے میں عیسائیت کا کوئی دخل نہیں یا ایک تاجر جب دوکان پر ہے تو وہ۔ اس وقت اس کے مذہب کا کوئی سوال نہیں۔ ہاں جب وہ عبادت کے لیئے جائیگا تو اس وقت مذہب کا سوال ہوگا۔ عبادت ان کی گرجا میں جاکر ہوگی اپنے گھر میں نہیں ہوسکتی۔ اور نہ وہ روز ہو سکتی ہے جب وہ گرجا پہنچیں گے تو عبادت کریں گے۔ وہاں خدا کو یاد کریں گے۔ اسلامی نظام نے یہ کام کیا کہ خدا کو یاد نہیں کیا جاتا بلکہ خدا کو یاد رکھا جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ کیا ہے کہ اگر تم ڈاکٹر ہو تو وہ بھی مسلمان ڈاکٹر ہونا ہے۔ اگر تم تاجر ہو تو تم کو مسلمان تاجر ہونا ہے۔ اگر تم کوئی اور شعبہ رکھتے ہو۔ اختیار کئے ہوئے ہو تو تم کو مسلمان ہونا ہے۔ ہر شعبہ حیات میں یاد الہٰی کارفرما ہوگی۔ اب دیکھئے روزمرہ کی زندگی میں کہ آپ بزاز کی دُکان پر گئے اور اس سے کہا کہ اچھے سے اچھے کپڑے دکھاؤ۔ نئے ڈیزائن دکھاؤ۔ اس نے دکھانے شروع کیئے۔ اب یہ جتنا کام ہو رہا ہے مادی ضرورت کے لیئے یعنی تن آسانی کی خاطر۔ ابھی بظاہر اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ادھر ایک کپڑا آیا۔ اور اگر آپ پابند شرع ہیں اور آپ نے پُوچھا یہ خالص ریشم تو نہیں ہے تو پتہ چل گیا کہ انسان اپنی تن پوشی کی راہ میں خدا کو نہیں بھُولا ہے اور جناب اب اسی طرح سے بازار گئے تو طرح طرح کی لذیذ غذائیں میں تو پتہ چل گیا کہ شکم پری کی خاطر۔ اللہ کو فراموش نہیں کیا۔ اور اب تو یہ روزمرہ کی بات ہے۔ یہ شعبہ ہے میرا۔ تجربہ تو نہیں ہے کہ شکار کا شوق ہوتا ہے۔ شکار ملا اور اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور کتنی تگ و دو۔ اور کتنی دوڑ دھوپ اور کتنی مشکل اور آخر میں وہ زد پر آیا اور اُسے گولی لگائی۔ اس کے بعد وہ گرا اور کہا۔ واہ واہ۔ دیکھو نشانہ پر پڑ گیا اور اب وہ فوراً گئے اور وہاں جاکر دیکھا اور کہا ارے یہ تو مر گیا۔ اب جہاں کہا ارے یہ تو مر گیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ضرورت مادی کی اس تگ و دو کے عالم میں بھی خدا کو نہیں بھُولا۔

اب ایک ناقابل بیان مرحلا اور پھر مقام منبر گر میں کہتا ہوں۔ ایسی نفسانی

خواہش جس کی تکمیل میں انسان اور حیوان کے درمیان بہت کم فرق رہ جاتا ہے لیکن اس کے لئے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے تمام شرائط حاصل۔ تمام موانع ختم۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تراضی طرفین حاصل۔ دونوں بالکل آمادہ لیکن فوراً خیال ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص الفاظ زبان پر جاری نہ کریں۔ اس وقت تک ایک پردہ درمیان میں ہے جو نہیں اٹھ سکتا۔ بس یہ ایجاب وقبول کے صیغے جاری ہوں۔ تو یہ ہمارے لئے حلال ہو۔ پس معلوم ہوا کہ طوفانی خواہشات کے تموج میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔ میں کہتا ہوں کہ ناجائز تعلقات بھی تو کبھی دائمی رہتے ہیں۔ عمر بھر ناجائز تعلقات رہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا۔ تو جو فرق دائمی ناجائز تعلقات اور عقد دائمی میں ہے وہی فرق عارضی ناجائز تعلقات اور عقد عارضی میں ہے۔ وقتی ہونے سے خصوصیت تھوڑی ہوتی ہے۔ فرق ہے باضابطہ اور بے ضابطہ میں۔ تو حضور والا یہ ہے اصل میں کہ اپنے کو مطلق العنان نہ سمجھو۔ یہ سمجھو کہ اصل میں ہماری جان کسی اور کی ہے اصل میں ہمارا مال کسی اور کا ہے اور جس وقت یہ ایمان اختیار کیا اسی وقت اسکا اقرار ہو گیا۔ ہمارا مال ہمارا نہیں ہے۔ اب ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ اسی میں حقیقتاً اسلامی سیاست بھی مضمر ہے۔ جس وقت ایمان لے آئے تو اقرار ہو گیا کہ اس کے مقابلے میں نہ ہماری جان ہماری نہ ہمارا مال ہمارا۔ تو اب اس کے اقتدار کے مقابلے میں نہ شوریٰ کا حق رہا۔ شوریٰ میں چھ سات آدمی فرض کیجئے جمع ہوئے۔ ایمان لاتے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں تو کوئی ان کے شوریٰ کو معتبر نہیں سمجھتا۔ اور اگر ایمان لائے ہوئے ہیں تو خواہ وہ پانچ چھ ہوں۔ اب عدد بھی ہے کیونکہ تاریخ میں یہی سامنے آیا ہے۔ خواہ پانچ چھ ہوں خواہ سو دو سو ہزار دو ہزار دس ہزار جتنی مردم شماری اس وقت کی کوئی سمجھے تو وہ سب ہوں۔ اس کا نام فرض کیجئے کہ اجماع ہو تو سوال یہ ہے کہ وہ بھی سب ہیں ایمان رکھنے والے۔ بحمداللہ باقرار خود سب مومن ہیں ورنہ مسلم بھی نہیں ہیں کیونکہ بغیر اقرار ایمان تو مسلم بھی نہیں ہوتا۔ تو جب

حقیقی ایمان ہے یعنی جماعت ہے مومنین کی۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ جب ایمان لائے تھے اسی وقت اللہ کے مقابلے میں بے اختیار ہو گئے تھے تو اب بے اختیار کیا ہے ثبوت اختیار۔ بے اختیار کیا ہے نفی اختیار۔ تو اب وہ دس ہزار ہوں یا دس لاکھ ہوں دس کروڑ ہوں دس ارب ہوں جتنے ہوں وہ سب بے اختیار۔ بے اختیار۔ بے اختیار تو بے اختیاروں کے مجموعہ سے اختیار کیونکر نکلے گا۔ یہ تو معمولی ریاضی کے طالب علم حساب پڑھنے والے بچے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تختہ کاغذ کا ہو اس پر جتنے بن سکتے ہیں زیرو بنا دیجیے جب ان کی تکمیل ہو گی تو جو عدد بنے گا۔ وہ صفر ہی ہو گا۔

تو اپنی جان اپنی نہیں اسکی ہے۔ اپنا مال اپنا نہیں اسکا ہے۔ بس یہی فلسفہ قربانی ہے۔ اپنا نہیں اسکا ہے تو اس کی راہ میں صرف ہونا چاہیئے۔ جب تک اس دنیا کی زندگی میں رہتے ہوئے مال صرف ہو سکتا ہے اس وقت تک اس کی راہ میں برابر صرف ہونا چاہیئے۔ اس لئے حقیقت میں جتنے احکام شریعہ ہیں تو ایک حد تک قربانی ہی کا مطالبہ ہیں۔ وہ نماز جو ہم پڑھتے ہیں اس میں بھی کچھ اپنے اوقات کچھ اپنی مصروفیت اپنے مشاغل کی قربانی ہے۔ وہ جو روزے رکھتے ہیں۔ اسمیں کتنی خواہشوں کی قربانی ہے اور اسی طرح زکوٰۃ میں مالی قربانی ہے اور حج میں تو کئی قسم کی مالی قربانی الگ اور جناب اپنے رکھ رکھاؤ اور وقار کی قربانی الگ۔ وضع قطع اور انداز لباس کی قربانی الگ۔ معاف کریں آج کل کے نوجوان۔ بالوں پر کچھ لوگ بڑے ریاضی کرتے ہیں بڑی محنت کرتے ہیں طرح طرح سے بناتے ہیں بالوں کو۔ تو جناب وہ کتنے ہی ہیں لیکن اگر حج کیا تو منیٰ میں جا کر فارغ البال ہونا پڑتا ہے۔ تو طرح طرح کی قربانیاں ہیں اور اگر انسان اسے پورا کر رہا ہے تو حقیقت میں وہ برابر قربانیاں پیش کر رہا ہے۔ اور اگر محل شہادت نہیں آیا تو یہی قربانیاں اس کو پیش خدا بلند سے بلند مرتبے حاصل کرانے کے لئے کافی ہیں۔ چونکہ شہادت تو وابستہ ہے ایسے کچھ حالات سے کہ جو سینکڑوں برس میں پیدا

ہوتے ہیں۔ اگر انسان نے شوق شہادت میں اپنی طرف سے کچھ ایسا کر دیا کہ جو اس کے تقاضائے شہادت کو پورا نہ کرے تو یاد رکھئے کہ وہ پھر ہلاکت ہوگی شہادت نہیں ہوگی۔ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ شوق شہادت میں اگر کوئی غلط قدم اٹھ گیا تو شہادت کی منزل دور ہوگئی ہلاکت ابدی رہ گئی تو حقیقت میں جب جان اسکی دی ہوئی ہے تو جتنی قربانی جس وقت وہ چاہ رہا ہے۔ بس اتنی ہی کرو اس سے زیادہ اگر قربانی کروگے تو وہ اپنے جی کی خاطر ہوگی۔ یعنی شوقِ شہادت میں قربانی پیش کر رہے ہیں تو وہ تو آپ کے شوق کی راہ میں قربانی ہوگی۔ وہ اللہ کی خاطر تو نہیں ہوگی۔ تو شوق شہادت کوئی غلط قدم نہ اٹھوائے۔ ورنہ بہت دُور ہو جائیگی منزل شہادت کی۔ اور یہ مجھے اس لئے کہنے کی ضرورت ہوئی کہ جب کوئی ہوا چلتی ہے تو پھر لوگ بہت آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اب وہ ایک لفظ چلی شوق شہادت کی۔ تو اب اگر ہر جگہ یہ ہوا چلنے لگے تو نہ جانے کتنے قدم غلط اٹھ جائیں گے۔ تو یہ بڑا خطرناک ہوگا۔ اس کی وجہ سے ہلاکت ابدی ہو سکتی ہے لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے شہادت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں ہے اور یاد رکھئے کہ ہماری قوم کے بہت سے افراد ہیں جنہیں خون ریزی سے نفرت ہو گئی ہے اور دہراتے ہیں خونریزی ارے خونریزی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر معرکہ جہاد میں آنا ہے تو ہر آدمی کو قاتل ہونے کے لئے آنا چاہیئے۔ اگر شوق شہادت میں کوئی کمی رہ گئی قاتل ہونے کی کوشش میں تو پھر وہ ہلاکت ہوگی شہادت نہیں ہوگی۔ ارادہ ہمارا ایسا ہونا چاہیئے کہ ہمارا وار کارگر ہوگا۔ ہم زیادہ سے زیادہ افراد کو تہہ تیغ کریں گے اور اگر ہم نے کوئی کمی کر دی کہ بہت اچھا ہے کہ شہید ہو جائیں۔ اگر شہید نہیں ہوں گے تو بہت برا ہوگا۔ یہ بڑی سخت منزل ہے۔ اسی لئے ہر منزل پر زندہ رہنما کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ روز عاشور۔ کیا مسلم ابن عوسجہ کو برادرانِ حسینؑ سے زیادہ شوق شہادت تھا۔ کیا حبیب ابن مظاہر کو شوق شہادت حضرت ابوالفضل العباس سے

زیادہ تھا۔ پھر کیا ہے کہ وہ اتنے جلدی شہید ہوئے۔ اور یہ اتنی دیر میں۔ تو کیا جس وقت وہ شہید ہوئے ان کا درجہ اونچا ہو گیا اُن سے کہ جو ابھی شہید نہیں ہوئے۔ میں تو کہتا کہ ان کا بڑھ جانا وہ ان کا جہاد تھا اور ان کا رکا رہنا یہ ان کا جہاد تھا۔ اگر جوش میں اگر یہ آگے بڑھ جاتے تو یہ تقاضائے شہادت کے خلاف ہوتا۔ سب سے بڑا امتحان ابوالفضل العباسؑ کا تھا۔ جو دوسری محرم سے بے چین۔ جس وقت نہر سے خیمے اٹھائے گئے۔ تو ہمارے مرثیہ نگاروں نے تو نظم کر دیا ہے کہ حضرت ابوالفضل العباسؑ اس وقت بے تاب تھے اور انہوں نے عرض کیا۔ مگر نہیں۔ تاریخ کی روشنی میں یہاں حضرت ابوالفضل العباس کا نام اس منزل میں نہیں ہے۔ جناب زہیر ابن قین نووارد تھے اس جماعت میں۔ یہ ابھی پورے طور پر نظام کار امام کو نہیں سمجھے ہوئے تھے۔ اس لئے جب خیمے ہٹائے جانے لگے تو جناب زہیر ابن قین نے عرض کیا کہ مولا یہ ابھی ایک ہزار ہیں ان سے ہمیں نمٹ لینے دیجئے ورنہ پھر اتنے آجائیں گے کہ ہمیں تاب مقاومت نہیں ہوگی۔ یہ نووارد ہیں اس لئے ان کی نظر اسباب پر ہے۔ اور وہ ہستیاں جو ہیں ان کو اس سے مطلب ہی نہیں کہ دس ہزار آجائیں گے یا دس لاکھ آجائیں گے۔ انہیں تو فرض کو پورا کرنا ہے۔ انہوں نے یہ کہا۔ جناب زہیر ابن قین نے تو میں اس کو جناب حبیب ابن مظاہر کی شان کے لائق نہیں سمجھتا۔ تو جناب عباسؑ کی شان کے لائق کہاں سمجھوں گا۔ بس زہیر ابن قین نے یہ کہا۔ تو عباس کی نظر تو حسینؑ کے لبوں پر جم گئی کہ یہ کیا جواب دیتے ہیں تو امام نے یہ جواب دیا۔ مختصر۔ میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جنگ میں ابتدا کروں۔ بس اب انہوں نے امام کے اس جواب کو یوں کہوں کہ گرہ میں باندھ لیا۔ ورنہ آپ ذرا عباس کے دل میں دل ڈال کر دیکھئے کہ پانی بند ہو جائے اور عباس خاموش رہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مولا اجازت دیجئے کہ ہم جا کر دریا چھین لیں۔ جو تن تنہا جا کر چھین لے وہ اس وقت جب تمام اصحاب

موجود ہیں اس کے لئے کیا دشوار تھا۔ مگر وہ امام کا جملہ۔ اس کے تحت میں یہ فلسفہ مضمر ہے کہ اگر پانی ہی پر جنگ کرنی ہوتی تو خیمے ہی کیوں ہٹائے جاتے۔ یاد رکھئے کہ اگر اس وقت جہاد ہو جاتا تو واقعہ کربلا کی تاریخ بدل جاتی۔ کہ پانی پر جھگڑا ہوا تھا حسینؑ تو یہ چاہتے تھے کہ جو میری جنگ ہو وہ اصول پر ہو جب بپا شدہ خیمے ہٹا لئے اور پانی بند ہو گیا تو عمل کیا ہے کہ ہم کہیں مولا سے کہ ہمیں اجازت جہاد دیجئے۔ یہ وہ ہے جو فلسفہ اقدام حسینی کو نہ سمجھتا ہو۔ اب آپ ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ کیجئے کہ سکینہ العطش کہہ رہی ہو اور یہ خاموش رہیں اور بچے خالی کوزے لئے ہوئے پھر رہے ہوں اور یہ خاموش رہیں اور محمد باقرؑ کا کملایا ہوا چہرہ دیکھیں اور یہ خاموش رہیں۔ مگر ہاں بالکل خاموش تھوڑی ہیں کنویں کھود رہے ہیں یعنی وہ قوت جو تلوار پر صرف ہوتی وہ بیلچے پر صرف ہو رہی ہے۔ اب کہیں پانی نہیں نکلتا۔ پھر بھی جنگ کرنا نہیں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ وہ جنگ وفائے عباس نہیں ہے۔ یہ خاموشی وفائے عباس ہے۔ چنانچہ تین دن گزر گئے۔ پیاس طوفانی ہوتی رہی۔ بڑھتی گئی اور عباس خاموش یہاں تک کہ اب عصر عاشور حملہ ہو گیا۔ اصحاب سب خیموں کے باہر ہیں عزیز سب خیموں سے باہر ہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا سب سے پہلے زینب کے کانوں میں جاتی ہے فرماتی ہیں فضہ سے کہ جاؤ دیکھو بھائی کیا کر رہے ہیں۔ فضہ نے جا کر دیکھا اور کہا کہ پاس کوئی نہیں ہے مگر نماز ظہر کے بعد عمود خیمہ سے تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں نیند آگئی ہے۔ اب زینب آئیں قریب اور کہا بھائی بھائی آنکھ کھولئے۔ حملہ ہو گیا ہے۔ اب بھائی بہن میں کافی گفتگو ہوئی تو عباس آئے اور کہا مولا حملہ ہو گیا۔ کیا یہ بتلانے آئے ہیں کہ حملہ ہو گیا۔ اگر بتلانے آئے ہیں تو اتنی دیر میں آئے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بتلا نہیں رہے ہیں۔ اس دن کی بات کا حوالہ دیکر تقاضا کرنے آئے ہیں کہ مولا حملہ ہو گیا۔ اب تو آپ کے اصول کو صدمہ نہیں پہنچتا۔ اس دن انداز اور تھا جا کما نہ تھا میری

شان نہیں ہے کہ میں جنگ میں ابتدا کروں۔ اب عباس نے جو یہ کہا ہے تو اب مولا کا انداز حاکمانہ نہیں ہے کیونکہ اصول کوئی سدِ راہ نہیں ہے۔ حسین اس کے متقاضی نہیں تھے کہ اب رات کو جنگ ہو جائے لہٰذا جو جنگ کے لئے بے چین ہے اس کو التوائے جنگ کی درخواست دیکر بھیجا۔ خدا کی قسم یہ ہے عباس کی وفا میں کہتا ہوں کہ اس کام کے لئے حبیب ابن مظاہر کو بھیج دیجئے۔ اصحاب میں سے کسی سن رسیدہ فرد کو بھیج دیجئے۔ یہ عباس ایسے شیر کو اور اس مقصد کے لئے۔ دنیا صبرِ عباس کو نہیں دیکھتی جلال عباس کو دیکھتی ہے۔ امام بھی جانتے ہیں کہ بڑا مشکل کام لے رہا ہوں۔ اس لئے اندازِ گفتگو کیا ہے۔ خدا کی قسم مجھے تو علی اکبرؑ سے گفتگو میں بھی یہ لفظیں نہیں ملیں۔ ارے خود عباس سے گفتگو میں یہ لفظیں نہیں ملیں۔ طبری کے صفحات پر ہے حسینؑ فرماتے ہیں۔
بنفسی انت یا اخی۔ ارے میری جان قربان تم پر اے میرے بھائی۔ میں کہتا ہوں بس مولا جو چاہے کام لے لیجئے۔ دیکھئے اس وقت مرحلہ کتنا مشکل ہے۔ جو جنگ کے لئے تقاضے کو آیا ہے اس کا اندازِ طبیعت کیا ہوگا۔ جو درخواست صلح لیکر جائے اسکا انداز کیا ہونا چاہیئے۔ مگر الفاظ حسینؑ کے بعد عباس کو ایک دم اپنے کو بدلنا ہے اور بس اب چلے جا رہے ہیں۔ دبی زبان سے بھی تو نہیں کہتے کہ اس کام کے لئے تو کسی اور کو بھیج دیجئے لیکن یہ تو حکم امام کی اطاعت کو واجب جانتے ہیں۔ لہٰذا بس مڑ گئے میدانِ جنگ کی طرف اور اب وہاں جاکر کیا کیا سنا۔ ایسی باتیں جو ہمارے خون کو کھولا دیں۔ کوئی کہتا ہے مہلت دی جائے۔ کوئی کہتا ہے کہ مہلت نہ دی جائے کوئی کہتا ہے کہ اگر کفار ترک و دیلم ہوتے اور وہ مہلت مانگتے تو دینا چاہیئے تھی۔
یہ تو بہرحال مسلمان ہیں۔ عباس خاموش ہیں۔ کوئی ایسا اقدام نہ ہو جو مصلحت امام کو نقصان پہنچائے۔ بہرحال کامیاب ہوئے۔ اچھا مہلت ہے ایک رات کی ایک معاہدہ ہوا ہے۔ ایک طے شدہ۔ دو جماعتوں میں۔ تو اپنے دو نمائندے میرے

ساتھ کرو۔ کہ وہ جا کر توثیق کریں اس التوائے جنگ کی۔ تب وہ معتبر ہوگا۔ تو دو آدمی ادھر سے اپنے ساتھ لے کر حسینؑ کے پاس آئے۔ میں تو یہ الفاظ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے خوش آئے جیسے فرات فتح کر کے آئے ہوں۔ رات کی مہلت مل گئی۔ دل بے چین تھا مگر اطمینان ہے۔ ارے میں نے ہی تو مہلت لی ہے۔ ایک رات ہی کی تو مہلت ہے۔ اب صبح ہو تو دیکھا جائے گا۔ اب وہ صبح ہوئی۔ ترتیب لشکر ہوئی۔ اور سب وہ مراحل درمیان کے گزرے۔ ایک دفعہ مولا کہتے ہیں کہ لو یہ علم تم لو۔ اب علم کا لینا نہ تھا۔ سمجھتے تھے میرے پیروں میں زنجیریں پہنا دی ہیں۔ اب عباس کے دل میں جھانک کر دیکھیے کہ قاسم کا لاشہ آجائے، عون و محمد کے لاشے آجائیں اور عزیزوں کے لاشے آجائیں اور عباس خاموش کھڑے رہیں۔ خدا کی قسم یہ سب قربانیاں ہیں جو علم کے احترام میں ہو رہی ہیں۔ یہ نفسیاتی قربانیاں ہیں جو علم کے احترام پر ہو رہی ہیں اور پھر جب علم لیکر گئے۔ تو کس طرح حفاظت کی آپ کو معلوم ہے کہ ہاتھ بھی نہیں رہے تب بھی علم زمین پر نہیں گرنے دیا۔ ارے میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس وقت پکار لیا ہوتا مولا کو تو سکینہ کی مشک پہنچ جاتی لیکن نہیں ابھی ہمت عباس تو پست نہیں ہوئی۔ ایک ہاتھ نہیں رہ علم بھی مشک بھی پھر بھی شمشیر زنی۔ پھر بھی رُخ خیموں کی طرف۔ آپ کو توجہ دلاؤں۔ کیا جب سے عباس آئے ہیں بچے خیمے کے اندر بیٹھے ہیں۔ یقیناً در خیمہ پر ہیں اور نگاہیں علم پر ہیں اور علم آرہا ہے اور بچوں کا دل بڑھ رہا ہے ارباب عزا اک دفعہ علم گرا۔

تائیدِ جبریلؑ

شاعرِ اہلبیت جناب اخترؔ تراہی کا تازہ مجموعہ کلام جس میں رُباعیات سلام اور مرثیے درج ہیں۔ محافلِ ذکر اور مجالسِ عزا کی زینت "تائیدِ جبریلؑ" سوزخوانی کے لئے نادر روزگار بیاض اسمیں رُباعیوں اور نظموں کے علاوہ بارہ ۱۲ سلام اور مکمل دس ۱۰ مرثیے درج ہیں۔ جنکی تفصیل حسب ذیل ہے (۱) مناقب سید لولاک سرکار محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲) علالت جناب رسولِ خدا اور بیقراری جناب فاطمۃ الزہراؑ (۳) ذکر اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا (۴) واقعہ خم غدیر (۵) شہادت حضرت امیرالمومنینؑ (۶) فضائل وشہادت امام حسن علیہ السلام (۷) مناقب حسینؑ۔ صدائے استغاثہ اور حال علی اصغرؑ (۸) ذکر جناب بلالؓ بعد رسولِ مقبولؐ مدینے میں دوبارہ مراجعت۔ اذان کہنا اور جناب فاطمہؑ کا غش کر جانا۔ (۹) ذکر فاتح فرات حضرت عباسؑ علمدار (۱۰) منظر روانگی علی اکبرؑ از خیمہ گاہ (۱۱) ذکر اُم المصائب حضرت زینب سلام اللہ علیہا۔ بعد شہادتِ حسینؑ سیدانیوں کے سروں سے چادروں کا چھننا (۱۲) ذکر اصحابِ حسینؑ واقعات شبِ عاشور (۱۳) غارتگری خیام اہلبیتؑ اظہار۔ (۱۴) ذکر امام زین العابدین علیہ السلام (۱۵) ذکر حضرت ابوذر غفاریؓ صحابی رسول مقبولؐ بیکسی میں انتقام اور بچی کا اضطراب حضرت مالک اشترؒ کے قافلے کا آنا تجہیز وتکفین۔ مکمل حالات۔ (۱۶) ذکر حضرت صاحب العصر والزمان عج۔ ساقی نامہ۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے بارے میں رئیس المقررین خطیب آلِ محمد مولانا السید اظہر حسن صاحب قبلہ زیدی! اور صدر العلماء والمجتہدین علامہ نصیر الاجتہادی صاحب قبلہ اور شاعر حسینیت جناب سید وحید الحسن صاحب ہاشمی ایم اے۔ بی۔ ٹی کی مکمل تحریری آرا شامل ہیں۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ طباعت آفسٹ عمدہ۔ کتابت کاغذ بہترین۔ سرورق رنگین۔ ہدیہ قسم دوم اخباری کاغذ ۹/ قسم اوّل سفید کاغذ مجلد۔ ۱۲/ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ امامیہ کتب خانہ مُغل حویلی۔ اندرون موچی دروازہ لاہور ۸

روح القرآن

مصنف:- حجۃ الاسلام الحاج مولانا السید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی مرحوم و مغفور

یہ وہ کتاب لاجواب ہے جس کی مثال پاکستان میں نہیں ہے۔ اس موضوع پر شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق آج تک یہاں نہیں لکھی گئی کتاب "روح القرآن" بھی اپنے وجود و ظہور میں منفرد ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید سے متعلق ہر قسم کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اسمیں قرآن مجید کے معنی بتائے گئے ہیں۔ اس کے نزول سے بحث کی گئی ہے اسکے معجزہ ہونیکا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تحریف قرآن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے متعلق شیعہ نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔ اسکے کثیر موضوعات میں دو امور پر بحث نے اسے لاجواب بنا دیا ہے (۱) یہ کہ ۳۱۴ آیاتِ قرآنی کی نشاندہی اس مقصد سے متعلق کی ہے کہ یہ آیات آلِ محمدؐ کی مدح میں نازل ہوئی ہیں۔ اور اسکا ثبوت کتبِ اہلسنت سے پیش کیا ہے۔ اس سے بے شبہ ذاکرین و واعظین کو بڑی سہولت مل جاتی ہے۔ پاکستان کے بڑے بڑے واعظ اور ذاکر اس کتاب کو اپنے پاس رکھتے ہیں (۲) اس کے آخری باب میں تقریباً تین سو اُن شیعہ علماء کے اسماء لکھے ہیں۔ جنہوں نے قرآنی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ کتاب پہلے ایک مقدمہ کی شکل میں تھی۔ اب اسے مصنف نے مکمل کتاب بنا دیا ہے۔

آفسٹ طباعت حجم ۴۰۰ صفحات رنگین کور۔ سائز $\frac{23 \times 36}{16}$ ہدیہ مناسب۔

ملنے کا پتہ

امامیہ کتب خانہ مغل حویلی۔ اندرون موچی دروازہ لاہور ۸

مفاتیح الجنان اردو

مترجمہ

جناب شیخ الجامعہ
مولانا اختر عباس صاحب قبلہ

اس میں سال بھر کے اعمال۔ بارہ اماموں، چہاردہ معصومینؑ اور ان کی اولاد و اصحابؓ خاص کی زیارتیں، تمام مساجد کے اعمال و آداب، ہر بلا و درد کے لئے تعویذات۔ یہ کتاب لاکھوں کی تعداد میں ایران میں طبع ہو چکی ہے اور لاکھوں زائرین اس سے زیارات بجا لا چکے ہیں۔ ایران کے ہر شیعہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کی اتنی بڑی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا موصوف نے اسے اردو میں ترجمہ کر کے مذہب شیعہ کی ایک بہت بڑی خدمت کی ہے۔ آفسٹ چھپائی۔

عمدہ کاغذ سائز ۲۰×۳۰ - حجم ۷۴۴ صفحات

مجلد پائیدار - ہدیہ مناسب

ملنے کا پتہ:۔ امامیہ کتب خانہ مغل حویلی اندرون موچی دروازہ حلقہ ۶۲ لاہور